ماہنامہ حکایت لاہور

اکتوبر 2015ء

ملا عمر کی موت کے بعد!

(خصوصی فیچر)

اشک ندامت!

طوائف اور توبہ!

امرتسر کا گیٹ کیپر

زخم خوردہ

اکتوبر 2015ء

حکایت

قیمت -/110 روپے

نورِ مُبین

مومن تو وہ ہیں جو خدا پر اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور جب کبھی ایسے کام کے لئے جو جمع ہو کر کرنے کا ہو پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں تو اُن سے اجازت لئے بغیر چلے نہیں جاتے اے پیغمبر جو لوگ تم سے اجازت حاصل کرتے ہیں وہی خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں بموجب یہ لوگ تم سے کسی کام کے لیئے اجازت مانگا کریں تو اُن میں سے جسے چاہا کرو اجازت دے دیا کرو اور اُن کے لئے خدا سے بخشش مانگا کرو کچھ شک نہیں کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے (۶۲)

سورة النور

ماہنامہ
حکایت
لاہور

جلد: 45 | اکتوبر 2015ء | شمارہ: 02

بانی
عنایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
اعزازی مدیر: دستگیر شہزاد
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت
ابدال بیلا — عظمت فاروق
میم الف — ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر فخر علی — ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

سرکولیشن منیجر
فضل رزاق
محمد نثار رانجھا

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
محمد شبیر
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
[illegible]: وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564

ہیڈ آفس: 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com
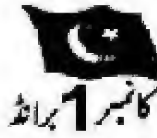
قیمت -/90 روپے

ماہنامہ حکایت لاہور

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ ائرمیل

پاکستان 800 روپے

1 — 7000 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 — 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے ”وقاص شاہد“ کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط وکتابت اور بدلِ اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلیٔ پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور- فون: 042-37356541

اس شمارے میں

اس شمارے میں

کہنے کی بات

ڈسپلن کی موت

انسان بھی عجیب شے ہے کہ گدھا مارے تو دولتی اور خود یہی حرکت کرے تو اسے فلائنگ کک کہہ کر باعزت بنالیتا ہے اور اپنی سفاکی، بے باکی، بے رحمی و خون آشامی کو درندگی کہہ کر معصوم جانوروں کے کھاتے میں ڈال کر خود کتنی چالاکی سے بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن اپنی تمام تر جان کاریوں کے باوجود انسان جیسا گیا گزرا بھی کوئی نہیں۔ مثلاً ڈاکٹرز، انجینئرز اور سائنس دان کسی بھی معاشرہ کی کریم سمجھے جاتے ہیں لیکن کوئی انسان کتنا ہی اعلیٰ ہے، اس کی تربیت اور پھر اس کے نتیجہ میں اس کی طبیعت کیسی ہے؟ سوچنے کا انداز کیسا ہے، میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یونیورسٹیاں اچھے ڈاکٹرز اور انجینئرز تو اگل سکتی ہیں لیکن عمدہ انسان پروڈیوس کرنے کا کام پورے معاشرہ کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

صرف تعلیمی ادارہ اور والدین یا یہ دونوں مل کر بھی اعلیٰ انسان پیدا نہیں کر سکتے۔ خواہ جتنے مرضی دعوے کرتے رہیں۔ مجھے یہ سب باتیں اپنے ڈاکٹرز کی ہڑتال کے سبب یاد آ رہی ہیں۔ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور سال ہے 2015ء جبکہ انگلستان کے ڈاکٹرز نے عشروں پہلے ہڑتال کا فیصلہ کیا اور ان کے بھی کچھ مطالبات تھے لیکن پھر ان ڈاکٹرز کی لیڈرشپ سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ ہڑتال بھی ضروری ہے لیکن مریضوں کی مسیحائی ہمارے مطالبات سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر ہماری کمیونٹی مریضوں کو لاوارث چھوڑ کر ہڑتال پر چلی گئی تو انسانیت ہمارے منہ پر تھوکے گی اور ہم اپنے مقدس پیشے کے روشن ماتھے کا بدنما داغ کہلائیں گے۔ ہمارے مطالبات تسلیم بھی کر لئے گئے تو ہم اخلاقی و انسانی محاذ پر ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوں گے۔ سو اب کریں تو کیا کریں کہ ہڑتال بھی کرنی ہے اور اپنے مریضوں کو تکلیف بھی نہیں ہونے دینی۔ پھر کیا ہوا؟ گندے "بے راہرو" اور ایمان کی دولت سے محروم کافر رچرڈ، ٹیری، جارج، چارلس، نیلسن اور ڈیوڈ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایک عجیب و غریب، حیرت انگیز فیصلہ پر پہنچے۔ ڈاکٹرز کی اعلیٰ قیادت نے پوسٹل سروس والوں سے رابطہ کر کے اپنا کیس اور مجبوری پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ ہمارے "بی ہاف" پر ہڑتال آپ لوگ کریں جو کہلائے گی

تو ڈاکٹروں کی ہڑتال لیکن ہم اپنے مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ بدستور جاری رکھیں گے۔ درخواست مان لی گئی۔ ڈاکیے ہڑتال پر چلے گئے، ڈاکٹرز مسیحائی میں مگن رہے اور پھر بالآخر ڈاکٹرز کے مطالبات مان لئے گئے۔ نتیجہ یہ کہ دل پاکیزہ ہوں تو قدرت دماغ میں حیرت انگیز آئیڈیاز کا نزول فرماتی ہے۔

کاش! ہمارے ڈاکٹرز میں سے بھی کوئی ڈاکٹر غلام رسول، کوئی ڈاکٹر دین محمد، کوئی ڈاکٹر اللہ دتہ، کوئی ڈاکٹر خدا بخش، کوئی ڈاکٹر نظام دین اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ ہمارے مطالبات کا تعلق اس حکومت سے ہے، ہم مریضوں کو کس جرم کی سزا دیں؟ ہم اپنے پیشے کے تقدس کی زنجیروں سے بندھے ہیں، ہمیں اپنے معصوم، مظلوم مریضوں کی زندگی کی قیمت پر کچھ نہیں چاہئے، بالکل نہیں کیونکہ صدیوں سے کئی صدیوں سے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہم خالی خولی باتوں، کھوکھلے دعوؤں، بے روح نعروں، مکروہ جگالیوں، بے معنی قصوں اور ہوائی کہانیوں کے سہارے کب تک زندہ رہیں گے؟ ہم حقائق کا سامنا کرتے، اپنے گریبانوں میں جھانکنے، نرگسیت کے کوڑھ کی وادی سے نکلنے، اپنے بارے میں سچ بولنے اور سننے کی طرف کب مائل اور آمادہ ہوں گے؟ ہم کب تک خود سے اپنے اصل چہرے چھپاتے اور جھوٹ بولتے رہیں گے؟ جھوٹ، منافقت اور بودی سیلف گلوری ٹیکنس ہمیں برباد سے برباد تر کئے دے رہی ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حسب و نسب پر فخر کی نفی فرمائی ہے۔ کیا ہمارے آج کے اعمال اس قابل ہیں کہ ہم اپنے عالی مقام اسلاف کے حوالے بھی دے سکیں؟ ہم عجیب لوگ ہیں کہ انسانی اور اخلاقی طور پر کرپٹ ہونے کے باوجود کس دھڑلے سے اسلام کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

سازشی تھیوریاں، ڈھونڈتے، سونگھتے اور گھڑتے رہنا ہمارا کلچر اور قومی مشغلہ ہے۔ سو اس ملک کا مسئلہ نمبر ایک ہے۔ ''ڈسپلن کی موت'' جسے آپ حکومتی رٹ کا خاتمہ کہہ لیں۔ لا اینڈ آرڈر کا فقدان کہہ لیں۔ کرپشن کی انتہا کہہ لیں۔ افراتفری، نفسانفسی کا وائرس کہہ لیں۔ مقدس مافیاؤں کی بلیک میلنگ کہہ لیں۔ ڈسپلن کی موت ہی معیشت کی تباہی کا سبب ہے۔ جس کی دم پر پاؤں رکھو وہی سردار ہے، آج ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہر کوئی جگا، بلیک میلر اور کھڑپینچ بنا ہوا ہے اور جو بدبخت چند سو یا ہزار چھو چاٹ اکٹھے کر سکتا ہے اس کا تو لب و لہجہ ہی سنبھالا نہیں جاتا۔ اور تو اور جسے دیکھو حکومت کو یہ دھمکی دے رہا ہے اور دے رہی ہے کہ وہ خودکشی کرلے گا یا کرلے گی۔ اس رویہ نے پورے ملک کو مذاق بنا کے رکھ دیا ہے۔ اصل حالات تو یہ ہیں کہ اعلیٰ ترین افسر ریونیو کسی پٹواری تک کی ٹرانسفر نہیں کرسکتا اور اگر ایسی جرأت کر گزرے تو پٹواری معہ ریکارڈ اس وقت تک

غائب ہو جاتا ہے جب تک مناسب سفارش ڈھونڈ کر یا خرید کر ٹرانسفر کروانے کا بندوبست نہیں کر لیتا۔ ہمارے دین میں مسجد مرکز و محور ہے ڈسپلن کا۔ توازن، ترتیب، پاکیزگی خوبصورتی کا لیکن اللہ کے گھر کی آڑ میں کی گئی لاتعداد تجاوزات کو چیلنج کرنے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔

ڈسپلنڈ قوم چاہیے تو کسی ڈسپلنڈ فورس کی ضرورت ہوگی، سیاستدان کے بس میں کچھ نہیں رہا کہ وہ بلیک میل کرنے اور ہونے کے علاوہ کسی کام کی نہ نیت رکھتے ہیں نہ اہلیت۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے سر بہت ہی چھوٹے اور پگڑیاں بہت ہی بڑی ہیں جنہیں پہننے کی ناکام کوشش میں ہم مسخرے دکھائی دیتے ہیں، ناکام و نامراد مسخرے۔

خدارا! سوچیں کہ ہماری حرکتیں کیا ہیں؟ ہم کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ اور یہ ہمیں زیب دیتی ہیں۔

سانپ کے کاٹنے کا علاج تریاق ہے اور تریاق بھی زہر سے ہی تیار ہوتا ہے۔

دستگیر شہزاد

خصوصی فیچر

بے حس معاشرہ

- دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز۔
- انصاف کی عدم فراہمی۔
- امیر اور غریب کا بے انتہا فرق۔
- سماجی نظام میں زبردست خلا۔
- قانون کے نفاذ کا نہ ہونا۔

افضال مظہر انجم
afzalmazhar@gmail.com

معاشرے میں ہر طرف آپ کو بدنظمی، بے اصولی، بے ہنگم پن دیکھنے کو ملتا ہے۔
اگر سڑک پر ٹریفک چل رہی ہے تو اصول وضوابط کے بغیر اشارہ کسی کا کھلا ہے اور گزر دوسرا رہا ہے۔ کسی جگہ قطار لگانے کا سلسلہ ہو تو قطار توڑنے والے پہلے سے کھڑے رہنے والوں کو پیچھے کی طرف دھکیل کر آگے پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں جب کھانے کا وقت آتا ہے تو لوگ کھانے پر اس طرح سے ٹوٹ پڑتے ہیں کہ گویا اس کے بعد کھانا کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ یہ میں بڑے بڑے امیر گھرانوں کی شادی کی مثال دے رہا ہوں جو سٹار ہوٹلوں میں ہوتی ہے اور جہاں سو فیصد پڑھے لکھے اور بہت ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد موجود ہوتے ہیں۔ کھانا کھانے کی دوڑ میں نہ چھوٹے بڑے کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ اپنی عزت وقار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سڑک کراس کرتے وقت اپاہج، معمر یا بچے کا خیال نہیں رکھا جاتا جبکہ غیر مسلم ممالک میں کسی بھی شخص کا قدم سڑک پر آئے تو تمام ٹریفک یکدم رک جاتی ہے۔ آپ پرندوں کو بھی دیکھیں تو شام کے وقت ڈار قطار در قطار جا رہے ہوتے ہیں۔ سینکڑوں بکریوں کا ریوڑ چرانے والا واپسی کے وقت ساتھ نہ بھی ہو تو اتنا بڑا ریوڑ خود ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔

بسوں میں سفر کریں تو ستر اسی سال کے بوڑھے کھڑے ہو کر سفر کر رہے ہوتے ہیں اور بیس پچیس سال کے نوجوان سیٹوں پر براجمان پائے جاتے ہیں۔ مذہبی لوگ عوام کو فرقہ واریت میں تقسیم کر کے مخالفوں کے گلے کاٹنے کے فعل کو ایسے فروغ دے رہے ہیں گویا یہ خدائی

احکام ہوں اور اس مکروہ فعل کی انجام دہی کے بعد جنت میں فرشتے کھڑے ان کا استقبال کر رہے ہوں گے۔

سیاسی جماعتیں لوٹ مار اور کرپشن میں تو ایک ہوتی ہیں لیکن اقتدار کے لئے آپس میں اس طرح سے لڑتے ہیں گویا دشمن کی فوجیں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں۔

قوم پرست لیڈروں نے ایک ہی ملک کے باسیوں میں نفرت اس حد تک بھر دی ہے کہ کراچی اور بلوچستان کے صوبہ میں جانے والے مسلمان پاکستانیوں کو گولی کے ذریعے وہاں آنے سے منع کیا جاتا رہا ہے۔

معاشرے کی ہر معاملے میں بے حسی صرف ایک ہی واقعے سے ملاحظہ کریں کہ کروڑوں ڈالر کی سمگلنگ میں ملوث ماڈل ایان علی ننگے لباس میں عدالتوں میں پیش ہوتی رہی اور میڈیا اسے ہی اہم خبر بنا کر اچھالتا رہا۔ اس سمگلر ماڈل کو کراچی یونیورسٹی لیکچر دینے کے لئے بھی بلایا گیا اور اس کے بعد نکاح پر نکاح کرنے والی اداکارہ میرا بھی مجرم ہونے کے باوجود نہایت کروفر کے ساتھ عجیب و غریب اور ہیجان خیز لباس پہنے عدالتوں میں پیش ہو رہی ہے اور قوم سے چسکے کی خاطر ان خبروں کو بھی مرچ مصالحہ کے ساتھ میڈیا بار بار اپنے چینلوں پر دکھا رہا ہے۔

انسانیت کی تذلیل کی انتہا ہوگئی

میں اکثر ایک فقرہ کہا کرتا ہوں کہ غیر مسلم ممالک میں جانوروں سے بھی بہتر سلوک کیا جاتا ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انسانوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ پورے ملک میں آپ اس قسم کے واقعات کی خبریں پڑھتے ہوں گے۔ چچا معصوم بچی کو کام کاج نہ کرنے پر تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ گھریلو ملازمہ بچی کا جسم استری سے جلا دیا گیا۔ کھیت میں بکری چرانے پر معصوم بچے کو تشدد سے ہلاک کر دیا گیا۔ قبر میں سے خاتون کی لاش نکال کر سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ سسر نے بہو سے زیادتی کر ڈالی۔ اغوا برائے تاوان میں ملوث ملزمان بہن بھائی گرفتار۔ ملزم اپنی بہن کے ذریعے امیر آسامیوں سے دوستی کراتا اور انہیں اغوا کر کے علاقہ غیر میں لے جاتے۔

یعنی بہن بھائی، باپ بیٹی، کے تقدس کے رشتوں کو تار تار کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ایسے ایسے ہولناک اور شرمناک واقعات رونما ہو رہے ہیں کہ ضبط تحریر میں بھی نہیں لائے جا سکتے۔ جائیداد کی خاطر اپنی جنت ماں کو مارنے کے واقعات تواتر کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ یعنی پاکستانی مسلمان لالچ اور حرص کے چکر میں دنیا کے اعلیٰ ترین مقدس رشتوں کی تذلیل سے بھی باز نہیں آ رہا۔ بلکہ صرف لالچ ہی نہیں حسد، بغض اور عدم برداشت کی فطرت رکھنے کی وجہ سے ایسے واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں۔

اس خبر سے آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ رشتہ داروں کو ملنے کے لئے جانے پر بدبخت بیٹے نے ماں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک فٹ جگہ کے تنازعہ پر دو بھائیوں نے تیسرے کو ہلاک کر دیا۔ ووٹ مخالف کو دینے کی وجہ سے ٹانگیں توڑ دیں۔ نومولود بچے ہسپتالوں سے اغوا کر لئے جاتے ہیں۔ بیوی کو جہیز کم لانے یا کسی دوسری وجہ سے جلانے کے واقعات آپ کے سامنے ہیں۔

میں عنقریب اس خطہ یعنی جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں جن میں ہمارا ملک، بنگلہ دیش، انڈیا، نیپال، سری لنکا وغیرہ شامل ہیں، کی ایک جیسی عادات پر ریسرچ شروع کر رہا ہوں جس کی وجہ سے ان کے معاشرے اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں اور ان کو انصاف کی فراہمی کا عمل نہ صرف جمہوری نظام کے ذریعے نہیں مل سکا بلکہ کسی بھی دوسرے نظام کے ذریعے یہ خرابیاں دور نہ کی جا سکیں۔ صرف اور صرف اس خطہ کے لوگوں کی حسد، بغض، بھیڑ چال فطرت کی وجہ سے۔ دوسرے ممالک تو غیر

اسلامی ہیں ہم تو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہونے کے دعویدار مسلمان ہیں۔ مولویوں کے لاکھوں کی تعداد میں بڑھنے کے باوجود برائیوں کے بڑھنے کی کیا وجوہات ہیں۔ کبھی سوچا ہم نے؟

فرائض کی انجام دہی میں ناکامی

جب معاشرہ ہی بد عادات، خرابیوں، خرافات کا شکار ہو۔ سرتاپا منافقت میں لتھڑا ہوا ہو، برائی اور بھلائی کی تمیز ختم ہو جائے۔ حلال و حرام بھی جائز قرار پائے تو اسی معاشرے سے عالم بھی پیدا ہو گا۔ سیاست دان، جرنیل، تاجر، جج، ڈاکٹر، سرکاری افسر سبھی کا تعلق اسی معاشرے سے ہی ہو گا۔ عرصہ پچاس سال سے معاشرے میں جاری خرافات، برائیوں اور جرائم کو نہ صرف کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر آنے والے سال، ہر حکومت، ہر لیڈر، ہر عالم، ہر جج، ہر جرنیل نے اسے بڑھانے میں حتی الامکان کردار ادا کیا جس کے بعد ہی یہ اس نہج پر پہنچا۔ ہر طبقہ نے اپنے ذمہ عائد فرائض پورا کرنے میں ہر طرح کی کوتاہی برتی۔ سیاست دان اپنے آپ کو لیڈر کے درجہ پر فائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کرپشن اور لوٹ مار کے جو ریکارڈ قائم کئے شاید دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی ہو گی۔ فوجی ڈکٹیٹر جب اقتدار کی مسند پر بیٹھتے رہے تو ہر قسم کی کرپشن کو بڑھا کر رخصت ہوتے رہے۔ اس ملک کے جج حضرات نے آج تک بڑے آدمی کو جرم کی سزا دینے اور غریب کو انصاف فراہم نہ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی ہو۔

قوم کے کپڑے اتارنے والا، اشیاء کی منافع خوری کرنے والا اور اربوں کے وسائل کے باوجود ہمیشہ ہی ٹیکس چوری کرنے والا تاجر اور صنعتکار طبقہ خود تو جائیدادیں اور کارخانے بنانے میں مگن ہے اور ٹیکس کا سارا بوجھ غریب پر ڈالنے کا باعث اور معیشت کی تباہی کا بھی سبب سے ہے۔ استاد ہے تو تعلیم و تدریس کے فریضہ کی بجائے روپیہ پیسہ کمانا اس کا مطمع نظر بن چکا ہے۔ دوسرے مسیحا ڈاکٹر حضرات کا یہ حال ہے کہ انسانی جان بچانے کے لئے جب تک اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی نہیں دی جاتی اس کا ہاتھ اس نیک کام کے لئے نہیں اٹھتا۔ علماء کرام جو کبھی خود بھی اپنے کردار سے لوگوں کو گرویدہ کیا کرتے تھے اب زر اور زن کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ کوئی بھی طبقہ اپنے فرائض نہ تو ایک مسلمان کی حیثیت سے پورے کر رہا ہے اور نہ ہی انسانیت کے درجہ پر فائز ہونے کے لئے اعلیٰ اوصاف سے مزین ہے۔ جس کسی کا جہاں کہیں اور جتنا بھی داؤ لگتا ہے لگانے کی کوشش کرتا ہے۔

دودھ والا دودھ میں پانی یا دوسری مضر صحت اشیاء کی ملاوٹ کر رہا ہے۔ قصائی اور گوشت کی سپلائی کرنے والے گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت کھلا کر بدترین جرم میں ملوث ہو رہے ہیں۔ مختلف اشیاء میں ملاوٹ یا اصلی اشیاء کی دو نمبر یا جعلی اشیاء سے حرام مال کمانے کو جرم نہیں سمجھا جاتا۔ جانوروں کی ہڈیوں سے تیل / گھی تک بنایا جا رہا ہے اور مرچوں میں برادہ ملانے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ کس کس طبقہ کی مثال دی جائے آوے کا آوا بگاڑنے میں سبھی برابر کے مجرم ہیں۔ سبھی برابر کے شریک ہیں۔ کیا کسی ایک آدھ صوبہ میں حرام گوشت / اشیاء، جعلی اور ملاوٹ شدہ اشیاء کی فروخت کے لئے کریک ڈاؤن شروع ہوا ہے؟ اس کا مطلب ہے عرصہ چالیس پینتالیس سال سے یہ مکروہ دھندے جاری تھے اور توجہ دلانے پر بھی تو حکومتوں کے کان پر جوں رینگتی تھی اور نہ ہی متعلقہ محکمے اس کا نوٹس تک لیتے تھے۔ گویا بے حسی اور لاپرواہی کی انتہا کے علاوہ رشوت سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند رکھنا حرام کھانے والے مافیا کا وطیرہ بن چکا ہے۔ ...

اور عدالتیں اپنے اصل فرائض کی بجائے غیر ضروری کاموں میں اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔

جب ملک کے چیف جسٹس (ر) خواجہ اویس جواد یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ سستا اور فوری انصاف نہیں دے سکے، ایسے نظام کو بدل دینا ناگزیر ہو گیا ہے۔ تو باقی کیا رہ گیا ہے لیکن بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بدلے گا کون؟ یہ سب خرافات، برائیاں، جرائم روکے گا کون؟

سخت ترین سزاؤں سے ہی جرائم رکیں گے

جب تک کسی کو کسی برے، غلط، مکروہ کام کرنے سے سختی سے روکا نہ جائے وہ اپنا فعل دہراتا چلا جائے گا۔ یہی کچھ اس ملک میں بھی عرصہ پچاس سال کی طویل مدت سے جاری ہے۔ ہر کوئی ہر برا، عوام کو تکلیف میں مبتلا کرنے والا، مکروہ فعل، قانون کی دھجیاں اڑانے والا کام کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ تبھی معاشرہ آج اس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ جس جگہ سے بھی اینٹ اٹھائی جاتی ہے گند ہی گند نکلتا ہے۔ ہم لوگ ہی سعودی عرب، امریکہ، یورپ میں جاتے ہیں تو ایک انچ اشارہ کاٹنے کی غلطی نہیں کرتے یا ان کے بتائے ہوئے قوانین و ضوابط کے مطابق عمل نہ کریں تو جرمانہ اور جیل ہمارا منتظر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی خوبی ہے کہ کسی بھی قسم کے جرم یا خلاف قانون کام کرنے والے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی ان کی پولیس اور اس کے بعد قانون نہیں چھوڑتا خواہ وہ اس ملک میں وزیر یا گورنر کے عہدے پر فائز ہو یا ارب پتی ہو یا سپر سٹار کا لیبل لگوانے والا ہو۔

سنگاپور میں ہونے والے ایک واقع سے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سنگاپور دنیا کے صاف ستھرے شہروں میں اہمیت کا حامل ہے۔ انڈیا سے آئے ہوئے ایک وکیل نے یہاں بازار میں چلتے ہوئے کاغذ کا ٹکڑا ڈسٹ بن میں پھینکنے کی بجائے سڑک پر پھینک دیا۔ اس وکیل کو کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس جرم پر وکیل کو تین ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی۔ وکیل نے بہت واویلا کیا کہ بھئی میرا تعلق خود ایک معزز پیشے سے ہے اور میں نے تو صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی زمین پر پھینکا ہے کوئی بڑا جرم تو نہیں کیا۔ سنگاپور کے حکام نے ان کو بتایا کہ کاغذ سر عام پھینکنے کے جرم کی سزا یہی ہے جو انہیں ہر حال میں بھگتنی ہوگی۔ اس قسم کے اعلیٰ عہدیداروں کو سزائیں دینے کے واقعات آپ وقتاً فوقتاً پڑھتے رہتے ہوں گے۔

چین جیسے غیر اسلامی ملک میں سینکڑوں لوگوں کو جن میں اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے علاوہ فوجی جرنیل تک شامل ہیں۔ کرپشن کی وجہ سے سزائے موت دی جا چکی ہے۔ تبھی ان ممالک میں کرپشن، لوٹ مار، ملاوٹ اور قانون کی دھجیاں اڑانے کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں۔ قانون پر عمل صرف ڈنڈے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی طریق کار اس پر عملدرآمد کا نہیں ہے۔ آئے روز منشیات فروشوں یا قاتلوں کی گردن اتارنے کے واقعات آپ پڑھتے رہتے ہیں۔

دولت تباہی کا باعث

اس ملک میں ہر خرابی دولت سے سب کچھ خریدنے کی ریت پڑنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انصاف بکتا رہا ہے۔ پولیس بکاؤ مال ہے۔ ووٹ کی بھی قیمت ہے۔ ہر ناجائز کام پر پردہ ڈالنے کے لئے پیسہ ہی طاقتور بنا ہوا ہے۔ الیکشن لڑنے کے لئے بھی دولت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سچے اور غریب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دولت کے بل بوتے پر بدمعاش، غنڈے اور مجرم دندناتے پھر رہے ہیں۔ سیاسی جماعتیں جمہوری اور فوجی حکومتیں تک ان بدمعاشوں اور مجرموں کا سہارا لینے پر مجبور ہوتی رہی ہیں۔ پیسہ ہے تو اچھی تعلیم حاصل کرو ورنہ لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھو، ریڑھی لگاؤ۔ چلیہ کا

وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ فور سٹار ہوٹلوں کی طرز پر قائم ہسپتالوں میں بہترین علاج معالجے کی سہولتیں حاصل کرو۔ پیسہ نہیں تو ہسپتالوں میں علاج کے لئے دھکے کھاؤ، دوائی کے پیسے نہیں تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ۔ انصاف، قانون نافذ کرنے والے ادارے، سرکاری افسر، وزیر، ایم این اے، مذہبی لیڈر، تاجر، ڈاکٹر، استاد سب بکاؤ مال ہیں، سوائے سچے آدمی کے جس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔

قدرت کی لاٹھی چلنے کا وقت آن پہنچا

جب ہر برائی لوٹ مار، کرپشن، زمینوں پر قبضے، معصوم لوگوں کی ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی، مجرموں کے جرائم انتہا کو پہنچ جائیں۔ خود طاقتور ادارے، اور حکومتیں ہی اسے روکنے کی کوشش نہ کر رہے ہوں بلکہ جرائم، برائی اور دہشت گردی، کرپشن کو پھیلانے کا باعث بنے رہیں تو کہیں پر جا کر تو قدرت نے اس کام کو روکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عرصہ پچاس سال سے یہ رسی دراز کئے رکھی تھی۔ اب اس رسی کے کھینچنے کا وقت آگیا ہے، شکنجہ کسنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ یہ کام نام نہاد سیاست دانوں نے کرنے کا تھا لیکن یہ لوگ خود ہی چور اور لٹیرے ثابت ہوئے، مجرموں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اب اگر فوج یا کوئی بھی ادارہ ملک سے دہشت گردی، کرپشن، سمگلنگ، ٹیکس چوری، ٹارگٹ کلنگ کو روکنے کے لئے عملی طور پر ایکشن شروع کر چکا ہے تو اللہ نے کسی نہ کسی سے یہ کام کرنا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ایک بھی سیاست دان صاف شفاف نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس شکنجے سے بچ نہیں سکے گا۔ کرپشن نے جس طرح سے ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اس میں ملوث مجرموں کو اگر وہ سیاست میں ہیں تو بیس سال کے لئے نااہل قرار دیا جانا چاہئے۔ قوم پرستی اور فرقہ پرستی جس نے ایک ہی ملک کے شہریوں کے گلے کاٹنے کے عمل کو فروغ دیا ہمیشہ کے لئے پابندی لگا کر اسے آئینی تحفظ دینا چاہئے۔ یہ اس ملک کے 18 کروڑ عوام کا بھی مطالبہ ہے جو اپنے ہی ملک میں چین اور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کام باہر سے آ کر کسی نے نہیں کرنے۔ جو بھی طاقتور ادارہ یہ کام کر رہا ہے اسی میں ملک کی بہتری اور اٹھارہ کروڑ عوام کی بقاء مضمر ہے۔

نئی نسل قرب و جوار سے متاثر ہوتی ہے

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنے والا بچہ یا جوان جو کچے ذہن کا مالک ہوتا ہے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھے گا اسی کا اثر اس پر بھی پڑے گا۔ جوان ہونے والا اپنے اردگرد کرپشن، لوٹ مار، منافقت، اخلاقی گراوٹ کی انتہا ہی دیکھ رہا ہے تو ظاہر ہے وہ بھی اسی رنگ میں رنگا جائے گا۔ بہت تھوڑی تعداد خاندانی، حول، اپنی فطرت یا اچھی صحبت کی وجہ سے ان برائیوں میں مبتلا ہونے سے بچی رہتی ہے۔

انٹرنیٹ، ویڈیو جرائم میں اضافہ کے سبب

یورپ امریکہ میں انٹرنیٹ، کمپیوٹر وغیرہ کا استعمال تعلیم، معلومات، تحقیق کے لئے ہوتا ہے اور وہ لوگ ان چیزوں کی ایجاد بھی اس لئے کرتے ہیں کہ انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے، عوام کے کاموں خصوصاً طلباء اور ریسرچ کے کاموں میں آسانیاں پیدا ہو سکیں لیکن ہم نے ان ایجادات کا استعمال جنسی تسکین حاصل کرنے، لڑکیاں لڑکے پھانسنے، لوگوں سے فراڈ اور بلیک میل کرنے کے لئے شروع کر دیا ہے۔ پنجاب کے ضلع قصور میں سینکڑوں لڑکے لڑکیوں سے زیادتی کر کے ویڈیو فلم بنانے اور بعد میں بلیک میل کرنے کے واقعات لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ملوث سارے مجرم نوجوان اور بارلیش ہیں۔ گھر گھر نیٹ پر

اخلاق باختہ فلمیں، پروگرام، چھوٹی سے چھوٹی عمر کا بچہ بھی دیکھ رہا ہے کیونکہ بند کمرے میں اسے یہ سہولت میسر ہے۔ اس کی صحت مندانہ سرگرمیاں گیمز، لائبریریاں، سیر و تفریح، مصروفیت بڑھنے حکومتی پالیسیوں، مہنگائی اور مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک خبر آئی کہ ویڈیو دیکھ کر بہنوں کو قتل کر دیا۔ بھارت جیسے آزاد معاشرے کی ریاست بہار کے ضلع گوپال گنج کے ایک گاؤں میں لڑکیوں کے جینز پہننے اور موبائل فونز کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد 46 دیہات میں بھی جذبات ابھارنے سے پیدا ہونے والی خرابیوں سے بچنے کے لئے یہ پابندیاں عائد کی گئیں۔

رائے ونڈ لاہور کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں سکول کے بچوں کا دوسرے ہم جماعتوں کے ساتھ زیادتی کرنے کے گروہ کے انکشاف کا واقعہ سامنے آیا۔ چین جیسے غیر مسلم ملک نے ٹین ایج طلباء و طالبات کے آپس میں فاصلہ رکھنے کی پابندی عائد کر دی جس کی وجہ سے ان کے معاشرہ میں چھوٹی عمر میں ہی بچے اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ تو حکومتی سطح پر کسی قسم کی ریسرچ کے مواقع ہیں اور نہ ہی اس کے تدارک کے اقدامات کہ لاکھوں کی تعداد میں اخلاقی جرائم کیوں سرزد ہو رہے ہیں؟ اور ان کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایک تحقیق کے مطابق انٹرنیٹ کو جنسی لذت کے لئے استعمال کرنے کی سب سے زیادہ تعداد پاکستانیوں اور دیگر مسلم ممالک کی ہے۔

ہر قسم کے جرائم کے اسباب

○ دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز۔
○ انصاف کی عدم فراہمی۔
○ امیر اور غریب کا بے انتہا فرق۔
○ سماجی نظام میں زبردست خلا۔
○ قانون کے نفاذ کا نہ ہونا۔

لگتا ہے معاشرے میں اس زبردست عدم توازن اور انصاف کی عدم فراہمی نے لوگوں کو ذہنی طور پر مفلوج، وحشی اور سفاک بنا کر رکھ دیا ہے اور ان کا کسی زبردست یا طاقتور پر تو بس نہیں چلتا۔ وقتی طور پر طیش میں آنے کی وجہ سے جو بھی ان کے سامنے آیا نشانہ بن گیا۔ کچھ ایسے مزید لرزہ خیز واقعات سے معاشرے کی حقیقی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

ماں، تائی، ماموں، ممانی قتل کر دیئے۔ دو بھائی مجرم تھے۔ مخبری کا شبہ تھا۔ جائیداد کی خاطر بھائی کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ بھاوج کی آنکھیں نکال دیں۔ نوکری کا جھانسہ دے کر لڑکیوں کو چکلہ خانوں کو ٹھیکہ پر دے دینا۔ یونیورسٹی کی طالبہ کا ڈکیت گینگ، امیر گھرانوں کے تعلیم یافتہ نوجوان بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان میں ملوث صرف پنجاب میں ہی ایک سال میں 72 کروڑ 60 لاکھ کی شراب فروخت ہوئی۔ رمضان المبارک میں بھی ماڈلز کی کیٹ واک، موٹر سائیکل نہ لے کر دینے پر ماں اور 5 بہن بھائیوں کو ہلاک کر دیا۔ غیر ملکیوں کو مہنگے داموں گردے فروخت۔ ڈاکٹروں نے غریبوں کے گردے نکالنے شروع کر دیئے۔

اس قسم کے واقعات کی وجہ سے اس قسم کے عذاب ہم پر نازل ہیں جس میں زلزلوں، سیلابوں، حادثات اور دہشت گردی میں ہلاک ہونے والے انسانوں کے علاوہ 10 کروڑ افراد اپنی روٹی پوری نہیں کر پاتے اور کتنی قسم کے عذاب ہم پر نازل ہوں گے۔ حادثات کی صورت میں بھی عذاب اور حکمرانوں، بدمعاشوں، حریص مولویوں، سیاست دانوں، منافع خوروں، انصاف فراہم نہ کر سکنے والوں کی صورت میں بھی ہم پر عذاب ہماری کرتوتوں کی وجہ سے نازل ہے۔

❖❖❖

نے طالبان کے نئے امیر ملا منصور اختر کی امارت پر سوال کھڑا کر دیا اور انہیں امیر تسلیم نہ کیا۔

دوسری جانب طالبان ذرائع اس کے برعکس کہانی سناتے ہیں۔ طالبان ذرائع کے مطابق ملا عمر کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ ان کی علالت کی نوعیت کسی کو سمجھ نہ آ سکی۔ ہوتا یہ تھا کہ ان پر طویل بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی یہ بیماری افغانستان میں ان کے ہمدرد طبیبوں کو بھی سمجھ نہ آ سکی۔ انہیں تجویز دی گئی کہ اب ان کے پاس علاج کے لئے پاکستان جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ملا عمر نے سختی سے اس تجویز کو رد کر دیا۔ طالبان ذرائع کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ "میرا پاکستان کی حدود میں مرنا امریکہ کے خلاف جاری جنگ اور پاکستان دونوں کے لئے تباہ کن ہوگا" لہٰذا وہ جان بچانے پاکستان نہیں آئے اور میدان جنگ میں ہی علالت کے ہاتھوں کوچ کر گئے۔ افغانستان میں طالبان کے مدمقابل اور تیزی سے ابھرتی ہوئی عسکری تنظیم داعش نے بھی اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ملا عمر پاکستان میں فوت نہیں ہوئے۔ البتہ داعش کا کہنا ہے کہ ملا عمر نے کہا تھا "میں امریکہ اتحادی ملک پاکستان میں نہیں مرنا چاہتا اور میدان جنگ میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔"

یاد رہے ملا عمر کے برعکس داعش پاکستانی حکومت کے خلاف ہے اور ممکن ہے کہ ملا عمر کی جانب سے پاکستان کی مخالفت پر مبنی گفتگو اپنی مخالفت کی پالیسی کو مضبوط کرنے کے لئے شامل کی گئی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ملا عمر کی جانب سے کبھی پاکستان کے لئے ایسے الفاظ اور خیالات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ افغان طالبان کی جانب سے ملا عمر کی پُراسرار علالت کی خبر اس حوالے سے دلچسپ ہے کہ کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے سابق امیر حکیم اللہ محسود کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے کہ حکیم اللہ محسود کو

ٹانگوں میں شدید درد اٹھتا تھا۔ انہوں نے اس کا علاج بھی کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ان کے ساتھی الزام لگاتے تھے کہ مخالفین نے ان پر کالا جادو کرایا ہے۔ حکیم اللہ محسود امریکی ڈرون حملے کا شکار ہوئے تھے۔

ملا عمر کی وفات کے حوالے سے طالبان ذرائع نے ان کے مبینہ قتل کو مسترد کیا ہے۔ طالبان ذرائع کے مطابق ملا عمر کچھ عرصہ سے علیل تھے اور اسی لئے مئی میں پہلی بار ان کے متبادل کے بارے میں غور و فکر شروع ہوا۔ پاکستانی حلقوں کی جانب سے اس سلسلے میں ملا برادر کو آگے بڑھایا گیا اور ان کے لئے باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اس سلسلے میں ملا برادر کو فوری طور پر افغانستان بھجوانے کی بھی کوشش کی گئی تاکہ وہ وہاں اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کر سکیں لیکن اس پر طالبان شوریٰ نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور واضح پیغام دیا کہ اگر ان حالات میں ملا بر ادر افغانستان آئے تو انہیں خوش آمدید نہ کہا جائے گا۔ اس سلسلے میں ملا ذاکر خاص طور پر زیادہ طیش میں نظر آئے۔ ان کے بارے میں کہا جانے لگا کہ وہ طالبان امارت پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور ملا عمر کا متبادل بننا چاہتے ہیں۔ ملا عمر کی موت کے باقاعدہ اعلان کے ساتھ ہی ان کے دست راست اور نائب ملا اختر منصور کو طالبان شوریٰ نے امیر منتخب کر لیا۔ ملا اختر منصور طالبان حکومت میں فضائیہ کے وزیر بھی تھے اور انہیں جری کمانڈر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر ان کا شمار اس طالبان قیادت میں کیا جاتا ہے جو اہم معاملات چلا رہی ہے۔ ملا اختر منصور کی عمر 50 سال کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے افغان جہاد کے دوران پشاور کے قریب نوشہرہ میں جلوزئی کے مقام پر ایک مہاجر کیمپ میں دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس طرح ان کا شمار ان طالب راہنماؤں میں ہوتا ہے جو پاکستان کو اپنا استاد گھرانہ قرار دیتے ہیں۔

ملا اختر منصور کی بطور امیر تقرری کے ساتھ ہی ایک نئی کہانی چل پڑی۔ مختلف ذرائع سے خبریں آنے لگیں کہ طالبان میں امیر کے انتخاب پر پھوٹ پڑ چکی ہے۔ طالبان میں ایک دھڑا پیدا ہوگیا جو ملا عمر کے 26 سالہ بیٹے یعقوب کو تحریک طالبان پاکستان کا امیر بنانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں کہا جاتا رہا کہ ملا ذاکر، ملا حسن اور ملا عمر کے جواں سالہ بیٹے ملا یعقوب نئے امیر کے طور پر ملا اختر منصور کو تسلیم نہیں کر رہے۔ طالبان کے نئے امیر ملا منصور ابتدا میں امن مذاکرات کے حامی تھے لیکن ان کی مخالفت کرنے والے ملا ذاکر جنگ جاری رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ جس کے بعد ملا منصور نے امن مذاکرات روک کر جنگ جاری رکھنے کا عندیہ دے دیا۔ ان کے اعلان کے بعد ملا ذاکر نے بھی ان کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ ملا حسن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ پاکستان میں ہیں اور جلد ہی افغانستان پہنچ کر نئے امیر کی بیعت کر لیں گے۔

اگر صورت حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ملا عمر کی جگہ تحریک طالبان افغانستان کے نئے امیر ملا اختر منصور کو طالبان گروہوں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی پوزیشن مضبوط نظر آتی ہے جس کی وجہ سے انہیں جلد امارت سے ہٹانا مشکل ہوگا۔ طالبان ذرائع کی جانب سے اہم مرکزی کمانڈروں کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ تین اہم افراد تادم تحریر بیعت سے باہر ہیں جن میں ملا عبدالرزاق، ملا حسن رحمانی اور ملا محمد رسول شامل ہیں۔ طالبان ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ان افراد سے طالبان قیادت رابطہ کر چکی ہے اور جلد ہی ان کے خدشات دور کر دیئے جائیں گے۔ دوسری جانب ملا اختر منصور اس لئے بھی مضبوط نظر آتے ہیں کہ ان کی بطور امیر مخالفت کرنے والے سابق امیر ملا عمر کے بیٹے ملا یعقوب کو آگے بڑھا رہے ہیں جبکہ ملا عمر کی جانب سے واضح وصیت ہے کہ ان کے خاندان کو امارت سے الگ رکھا جائے۔ اسی طرح ملا عمر اپنی زندگی میں ہی ملا اختر کو اپنا قائم مقام بنا گئے تھے۔ ملا عمر کی موت کے بعد لگ بھگ دو برس تک ملا اختر منصور ہی تحریک طالبان کی قیادت کرتے رہے ہیں۔ ملا منصور اختر کو طالبان کے نئے امیر بنائے جانے کے اعلان کے ساتھ ہی طالبان کے سب سے مضبوط دھڑے حقانی نیٹ ورک کے سراج الدین حقانی اور طالبان کے قاضی القضاء کے عہدے پر فائز ملا ہیبت اللہ اخونزادہ کو نائب امیر کا عہدہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح الحاج مولوی جلال الدین حقانی کی جانب سے جاری کیے جانے والے ایک پیغام میں کہا گیا ہے کہ ملا منصور کا انتخاب بہترین اور شرعی طریقے پر ہوا ہے۔ مولوی جلال الدین حقانی کا یہ پیغام اس وقت جاری کیا گیا جب کہا جا رہا تھا کہ ملا عمر کی طرح جلال الدین حقانی بھی ایک برس قبل وفات پا گئے ہیں۔ بہرحال حقانی نیٹ ورک کے متحرک سربراہ اور جلال الدین حقانی کے جانشین سراج الدین حقانی کو ملا منصور کا نائب بنانے سے حقانی نیٹ ورک ملا منصور کیمپ میں کھڑا ہو چکا ہے۔

ملا عمر کی وفات کی خبر کو پوشیدہ رکھنے پر تنظیم میں قائم ''امارت اسلامیہ'' کے سیاسی دفتر کے سربراہ طیب آغا بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ملا عمر کی موت کو چھپانا تاریخی غلطی ہے۔ دوسری جانب ان کے نائب شیر محمد عباس ستانکزئی اور دیگر ساتھیوں نے نئے امیر کی بیعت کا اعلان کر دیا ہے۔ ملا اختر منصور کے لیے ''ملا عمر'' بننا اتنا آسان نہ ہوگا لیکن اس کے باوجود تا حال وہ دوسروں کی نسبت زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں۔ ملا اختر منصور کے امیر بنتے ہی ان کے مخالفین کی جانب سے طالبان میں اختلافات کی خبروں کو تیزی سے پھیلایا گیا جس کے جواب میں طالبان کی جانب سے افغانستان میں کارروائیوں میں تیزی دکھا کر جواب دیا گیا

ہے۔ صورت حال سے واضح ہوتا ہے کہ ملا منصور کو طالبان دھڑوں کی مخالفت کا سامنا تو ہے لیکن وہ تا حال مضبوط نظر آتے ہیں۔ اب تک ان کے مدمقابل جن افراد کا نام لیا جا رہا ہے وہ الگ دھڑا تو بنا سکتے ہیں لیکن انہیں ملا منصور جیسی حمایت حاصل نہیں البتہ اگر ملا منصور پر ملا عمر کے قتل کا الزام ثابت ہو گیا تو پانسہ پلٹ سکتا ہے۔

داعش کے الزامات

کیا واقعی ملا منصور نے طالبان کا امیر بننے کے لئے ''گیم'' کھیلی؟

داعش افغانستان اور پاکستان میں بھی اپنے قدم جمانا چاہتی ہے۔ پاکستان میں تو فی الوقت داعش کو اتنی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی لیکن افغانستان میں اس نے کسی قدر کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اسی لئے کچھ عرصہ قبل تحریک طالبان افغانستان کی جانب سے داعش کے سربراہ ابوبکر البغدادی کے نام ایک خط بھی بھیجا گیا تھا جس میں انہیں افغانستان کا محاذ طالبان کے لئے چھوڑ دینے کا کہا گیا تھا۔ افغانستان میں داعش اور طالبان کے درمیان جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں اور بعض علاقوں پر داعش قبضہ کی اطلاعات بھی آ چکی ہے۔ ملا عمر کی موت کی خبر کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے داعش بھی اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ داعش کی جانب سے ملا عمر کی جگہ لینے والے نئے امیر ملا اختر منصور کی سخت مخالفت کی جا رہی ہے۔ داعش کی بھی یہ کوشش ہے کہ ملا اختر منصور تحریک طالبان پاکستان کی قیادت نہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں داعش کی جانب سے ملا منصور پر الزامات بھی لگائے جا رہے ہیں داعش کی جانب سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''طالبان شوریٰ کے رکن ملا عبدالمنان نے ملا اختر منصور کے جھوٹوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے بتایا کہ ملا اختر منصور کو ملا عمر کا جانشین اور طالبان کا نیا امیر شوریٰ نے مقرر نہیں کیا اور نہ ہی امیر مقرر کرنے کے حوالے سے شوریٰ کا کوئی اجلاس ہوا۔ داعش کی جانب سے ملا عمر کا ایک مبینہ آڈیو بیان بھی جاری کیا گیا ہے جس میں وہ طالبان کو ملا اختر منصور سے خبردار کرتے ہوئے نصیحت کر رہے ہیں کہ ملا اختر منصور کی کوئی بات نہ مانی جائے۔ اس مبینہ آڈیو بیان میں ملا محمد عمر نے ملا اختر منصور سے خبردار کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ انہوں نے ایسے عمل کا ارتکاب کیا ہے جس سے وہ اسلام سے خارج اور مرتد ہو جاتے ہیں۔ داعش کی جانب سے ملا اختر منصور پر الزامات لگاتے ہوئے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ایران و پاکستان کی ایجنسیوں کے ایجنٹ ہیں اور انہیں امیر بنانے کے لئے جھوٹی خبروں اور تصاویر کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ داعش کے مطابق طالبان نے دو ہزار افراد کی طرف سے ملا منصور کی بیعت کرنے کی جو تصویر نشر کی تھی وہ افغانستان کے شہر جلال آباد کے ایک نماز جنازہ کے فوراً بعد کی تصویر تھی۔ اس صورتِ حال سے واضح ہوتا ہے کہ ملا عمر کی موت کی خبر نشر ہونے کے بعد جو ''پاور گیم'' شروع ہو چکی ہے اس میں داعش بھی غیر معمولی کردار ادا کرنا چاہتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ داعش کے ایسے بیانات کا اثر تحریک طالبان افغانستان سے منسلک جہادیوں پر کم ہی ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں گروپ اسلام کے نام پر افغانستان میں آپس میں ہی لڑ رہے ہیں۔

''خودکش بمبار کے تعاقب میں'' جیسی شہرہ آفاق کتاب کے مصنف، تحقیقاتی صحافی سید بدر سعید کی یہ تحریر ہفت روزہ فیملی نوائے وقت گروپ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ادارے کے شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے (ادارہ)

☆■☆

غزل

حیا بٹ۔ میرپور

آپ اپنے آپ سے جنگ ہے زمانہ
پھر بھی کتنا ملنگ ہے زمانہ

سانس اپنی ہے ڈور کی مانند
اور جیسے پتنگ ہے زمانہ

اِک یہی آج کی حقیقت ہے
میں ہوں شیشہ تو سنگ ہے زمانہ

ہر گھڑی چار سُو یہی احساس
دل کا کس درجہ تنگ ہے زمانہ

زندگی کی تھکن مٹانے کو
موت کی اِک پلنگ ہے زمانہ

دیکھ کر آدمی کو اب حیاؔ!
آج ہر لمحہ دنگ ہے زمانہ

ایک تاثر ایک کہانی

چور

میرا بوٹی، اوجڑی، پھیری، بھینس کے گھٹنے کی ہڈی، گوشت اور شلجم قیمہ ہی کھاتا ہے۔ اُسے ''آلو قیمہ'' بالکل پسند نہیں۔

☆ پیر شہزادہ علیم معصوری
shahzada.7073@yahoo.com--0300-8607072

دھڑ، دھڑ، دھڑ
دھڑ، دھڑ، دھڑ، دھڑ۔

ساتھ ہی میرے موبائل نے بُری طرح تڑپنا شروع کر دیا۔ وائبریشن (Vibration) پر جو لگا تھا۔

حسین سید، میرے موبائل کی سکرین پر میرے دوست اور لاء کے ہم فیلو کا نام اُبھرا۔ خیر رات کے تین بجے مرکزی گیٹ کا بجنا۔ میری بیداری کے لئے کافی سے زیادہ تھا کیونکہ میرے جاگنے کے لئے تنکا گر جانا بھی کافی ہے۔

ساتھ ہی ہمارے چوکیدار کی آواز اُبھری۔

''خالد!'' وہ میرے باورچی کو آوازیں دے رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' ادھ جلے خالد نے نہایت سے زیادہ بیزاری سے ہوک لگائی۔

''بات سنو''۔ چوکیدار نے کہا۔

''آ تا ہوں ... صبر کرو''۔ خالد کی بے زاری صاف ظاہر تھی۔

میں نے تڑپتے ہوئے فون کو ایک بٹن سے Press سے پُرسکون کر دیا اور Hello کا شہرۂ آفاق کلمہ ادا کیا۔

''سرکار! معذرت، آپ کو زحمت دی مگر مجبور تھا''۔

حسین کہہ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں مگر خیر تو ہے؟" میں فوراً مدعے پر آ گیا۔

"ایک چور پکڑا ہے، زیارت کرنے کی اجازت دیں تو عرض کروں تفصیل!" حسین سید گویا ہوا۔

"او کے!" اور میں نے فون کاٹ دیا۔

"سائیں کو بتاؤ وکیل صاحب آئے ہیں ساتھ چھ سات بندے بھی ہیں۔ میں نے بہت منع کیا مگر درشن کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے پہلے گیٹ پر پہنچ گئے"۔ چوکیدار، باورچی و تفصیل آگاہ کر رہا تھا۔

"میں تو اس وقت نہیں جا سکتا۔ ان سے کہا ہوتا، صبح تشریف لے آتے"۔ خالد کے لہجے کی تلخی چھپائے نہ چھپی۔

"یار! ان لوگوں کو باہر والے کمرے میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں"۔ میں نے باورچی کو حکم دیا۔

"جو حکم سائیں! سن لیا"۔ باورچی نے مجھے Obey کرنے کے بعد اپنی جلن چوکیدار پر ظاہر کی۔

☆☆☆

ملاقاتی کمرے میں ایک مریل سا ادھیڑ عمر شخص تین چار بٹے کٹوں کے شکنجے میں تھا اور دو تین معززین الگ بیٹھے تھے جبکہ حسین ناف پر ہاتھ باندھے مؤدب سر نیہوڑائے کھڑا تھا۔

"بھئی حسین دالی لے آؤ، سب کے لئے اپنے لئے، موسیٰ، مختار اور چوکیدار کے لئے بھی"۔ میں نے باورچی سے کہا۔

"حضور! یہ جو چور پکڑا گیا ہے اس کے لئے بھی؟" باورچی نے میری مزاج شناسی اور دی ہوئی چھوٹ دونوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں اپنے قہقہے پر قابو نہ پا سکا اور ہنستے ہنستے ہی کہا۔ "ہاں ہاں بھئی! چور کے لئے بھی"۔ وہ ادب سے جھک کر تعمیل حکم کرنے بڑھ گیا۔

"بھئی، حسین شاہ! کچھ کہو بھی اور براہ کرام، بیٹھ جاؤ!" میں نے اپنے پیارے دوست سے کہا جو خود کو میرا مرید سمجھتا ہے۔

"جو حکم"۔ پھر حسین میرے دائیں ہاتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"سائیں! یہ لوگ چور پکڑ کر میرے پاس لائے کہ اس کو حوالۂ پولیس کیا جائے۔ میں نے حالات کا بغور جائزہ لیا تو اپنے کو کوئی فیصلہ لینے سے قاصر پایا۔ حضور کی شفقت کا دھیان کیا اور ساتھ یہ بھی سوچا کہ شاید حضور جاگ ہی رہے ہوں تو معاملہ آپ کے حضور پیش کرنے کی سوچی کہ بہتر ہو جائے گا"۔ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"ہاہاہا! واہ، حسین شاہ!" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم خود اچھے بھلے Criminal Lawyer ہو، یہ معاملہ تم بخوبی طے کر سکتے تھے۔ بہرحال آ گئے ہو تو دیکھتے ہیں"۔

☆☆☆

ہماری حویلی سے دو سو میٹر دور واقع ایک کوٹھی کے ڈرائنگ روم کی باہری دیوار میں بنے اگزاسٹ فین والے خالی سوراخ سے چور کا داخلہ بتایا گیا۔ میں نے سینہ چور کو نظروں سے ناپا تولا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقعی یہ چور اگر چھپکلی مہارت بھی رکھتا ہے تو یقیناً ممکن ہے کہ وہ اپنا جسم اس سوراخ سے داخل کر لے۔

چور اسی سوراخ سے اندر آیا اور ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم میں آیا اور وہاں سے ایک دروازے کی طاقچی جو کچن میں کھلتی تھی، کے ذریعے کچن میں داخل ہوا۔ وہاں سے کچھ برتن اٹھائے اور واپس اسی سوراخ سے باہر جانے لگا کہ پکڑا گیا۔

خیر، اہل محلہ کے شدید اصرار پر میں نے چور کو

غضب ناک آواز میں ڈانٹا اور اپنے پرائیویٹ گارڈز کو کہا کہ اس کو جیپ میں بٹھاؤ پکڑ کے اور ساتھ ہی اہل محلہ سے کہا کہ اس کو میں ابھی حوالہ پولیس کرتا ہوں اور سخت قانونی کارروائی کرواتا ہوں اس کے خلاف۔ پھر ہم سب جیپ میں سوار ہو کر وہاں سے نکل پڑے۔

☆☆☆

''جاوید بھائی! جیپ دائیں موڑیں''۔ میں نے قبلہ والد محترم کے معتمد خاص جاوید بھائی سے کہا جو جیپ ڈرائیو کر رہے تھے۔

''شہزادہ صاحب! تھانہ تو بائیں جانب ہے''۔ جاوید بھائی کہنے لگے۔

''میں عرض کر رہا ہوں ناں، ڈیرے پر چلیں''۔ میں نے کہا۔

''جی بہتر''۔ جاوید بھائی نے جیپ ڈیرے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''کھانا کھاؤ جی''۔ میرے ایک ملنگ نے چور سے کہا۔

چور چپ چاپ پچھلے پانچ منٹ سے اپنے آگے دھرے آلو قیمہ شامی کباب رائتہ اور روٹیوں کو گھورے جا رہا تھا۔

''کھا لو بھئی، لنگر ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔ میں نے بھی چور کو مخاطب کیا۔

''اب تو بھوک نہیں مرشد!'' بالآخر چور بھی گویا ہوا۔

''کیوں، میری ذات سے پیٹ بھر گیا یا محلے والوں نے مار کھلائی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مار سے تو آپ کے شاہ جی نے بچا لیا اور آپ کی ذات تو دنیا کی جیسی لگی بڑا سا ہیں! اطہر... مگر روٹی میں نے چوری والے گھر کھائی تھی''۔

سات تباہ کُن گناہ

1- اللہ کے ساتھ شریک کرنا۔
2- جادو کرنا۔
3- ناحق کسی کی جان لینا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔
4- سود کھانا۔
5- یتیم کا مال کھانا۔
6- جنگ کے دن پیٹھ پھیرنا۔
7- پاک دامن مومن عورتوں پر تہمت لگانا۔

(بخاری 6857)

مرسلہ: شہزادہ علیم

''تم چوری والے گھر دعوت پر گئے تھے یا جمعرات کا ختم دیا تھا وہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں حضور! جب میں ان کے کچن میں پہنچا تو ایک برتن کو ہاتھ مارا جس میں آلو قیمہ پکا پڑا تھا۔ میں نے سونگھا تو اتنی مزے کی خوشبو تھی کہ مجھ جیسے ''جہاز'' کی بھوک بھی جاگ گئی حالانکہ ہم لوگوں کی بھوک مر چکی ہوتی ہے۔ حضور! میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو ایک روٹی بھی مل گئی۔ میں نے تو پیٹ بھر کھایا۔ مگر... سرکار! میں مارا گیا''۔ چور نے اپنے کھانے کی روئیداد سنائی۔

''مارے کیسے گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل... سرکار! میری نیت صرف برتن یا لوہا اٹھانے کی تھی تاکہ اپنے نشے پانی کا بندوبست کر سکوں۔ مگر آلو قیمے نے مجھے مروا دیا۔ حضور! میں نے آلو قیمے والا دیگچہ اٹھا لیا کہ اسے لے چلتا ہوں گھر جا کے آلو قیمہ نکال لوں گا اور دیگچہ بیچ لوں گا۔ حضور! یہی غلطی تھی میری کچھ تو کھانے کی وجہ سے میں سست ہو گیا اور پھر دیوار سے بھی بمشکل اترا... مگر نکل ہی گیا تھا۔ اس کے نیچے میں نے چارپائی کھڑی کی ہوئی تھی انہی لوگوں کی گلی سے

اٹھا کر اس پر اترتا اور آرام سے نکل جاتا مگر وہ دیگچہ کمبخت پھنس گیا سوراخ میں۔

"دراصل دیگچہ بڑا تھا سوراخ سے۔ حضور! جب مجھے اندازہ ہوا کہ دیگچے کا اس سوراخ سے نکلنا ناممکن ہے تو مجھے غم سے رونا ہی آ گیا۔ اس وقت اور کچھ بھی ممکن نہ تھا تو پاگل پن میں میں نے آلو قیمے کی مٹھیاں بھر کر اپنی جیب میں ڈالنے کی کوشش کی اور اور دیگچہ گر پڑا اور میں۔" چور نے ساری واردات سنائی۔

"اتنے شوقین ہو تم آلو قیمے کے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی نہیں، سرکار! حق بات تو یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نشے سے پیار ہے مگر مگر گزشتہ تین چار دنوں سے میرے اندر کا مرا ہوا باپ جاگ اٹھا ہے۔" اچانک چور نے کہا۔

"تو وہ باپ تمہیں کہتا ہے کہ چوریاں کرو؟" میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

"نہیں نہیں، حضور! دراصل تین چار دن سے میری گڑیا اپنی ماں کو روز کہتی ہے کہ مجھے آلو قیمہ کھلاؤ۔ وہ دراصل اس کی ماں اسے چار روز پہلے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ایک شادی والے گھر میں برتن دھونے تو وہاں شادی سے واپس آئے برتنوں میں گڑیا نے آلو قیمہ چکھا تھا۔ حضور! ورنہ اس باپ اور بانیا شریف ماں کی غریب کی بچی کو کیا پتا آلو قیمہ۔" چور کی آواز بات کرتے کرتے رندھنے لگی۔ پھر اس نے کوشش کر کے بات شروع کی۔ "پرسوں لوہا بیچا تھا جی میں نے پچاس روپے کا اور آدھ پاؤ قیمہ لیا تھا جی گڑیا کے لئے مگر ساتھ ہی مجھے تو طلب پڑ گئی وہ آدھ پاؤ بھی واپس دیا قصائی کو جی۔ اس نے بھی مجھے چالیس روپے واپس کئے دس روپے کٹوتی کر لی۔ بس آج برتنوں کے ساتھ آلو قیمہ میں تو سمجھا تھا جی اللہ نے میری گڑیا کے لئے دیا ہے۔" چور کی آنکھوں سے نور ٹپکتا گیا اور اداسی بڑھتی گئی۔ "مگر چلو اللہ سائیں کی مرضی مجھ جیسے کے گھر گڑیا پیدا کر دی۔ وہ تو جی پری ہے پری کسی محل میں پیدا ہونی چاہئے تھی پر یہاں کئی کئی دن بھوکی رہتی ہے۔ اللہ کی بادشاہی ہے۔"

چور باتیں کر رہا تھا اور میری بولتی بند تھی۔ میرا دایاں ہاتھ جیب میں گیا باہر آیا اور چور کی طرف بڑھا۔

"جاؤ، چلے جاؤ اور پھر کبھی اس طرف نہ آنا ورنہ مجھے..." میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"آباد رہے میرا مرشد خانہ، مرشد والی کی خیر۔ حضور! اجازت ہو تو آلو قیمہ لے جاؤں؟" چور کی آنکھوں میں ایسی حسرت امنڈ آئی گویا اسے سات براعظموں کی شہنشاہی مل چکی ہے۔

"لے جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں یوں چمک اٹھیں جیسے تاج سر دارا مل گیا ہو۔

میں اٹھا اور اپنی جیب کی طرف چل پڑا۔ میرے چیلے بھی مجھے گھیرے ہوئے چل پڑے۔ ایک چیلا چلایا۔ "قبلہ!"

دراصل میری تر آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ میں اپنے اس بوڑھے کتے سے الجھ گیا تھا جو ایک طرف دنیا و مافیہا سے بے خبر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میرے الجھنے سے بھی اس کی نیند میں کوئی خاص خلل نہ پڑا۔ اس نے بے زاری سے آنکھیں کھولیں اور منہ سے اوں اوں کی آواز نکالی اور پھر نیند کی وادی میں کھو گیا۔

کیوں نہ سوتا۔ ڈنر میں پانچ کلو قیمہ مع دو کلو شلجم، بلیک کالی اور سفید مرچ میں لتھڑے ہوئے کھا کر سویا تھا۔ ہاں، میرا بوڑھا اور جری مجھری، جیلس نے گھٹنے کی ہڈی، گوشت اور شلجم قیمہ ہی کھاتا ہے۔ اسے "آلو قیمہ" بالکل پسند نہیں۔

★★★

گرگٹ

حاجی صاحب نے نماز چلتی ٹرین میں ادا کی اور سلام پھیر کر تاش نکالی اور پتے بانٹنے شروع کر دیئے۔

ڈاکٹر خادم حسین مجاہد

یہ 1993ء کی بات ہے، میں بی اے کر کے فارغ تھا۔ ان دنوں تین چار کام ہی تھے لکھنا، پڑھنا، سیر و تفریح کرنا اور ملازمتوں کے لئے درخواستیں دینا اور ان کی تلاش میں جوتیاں چٹخانا۔ انہی دنوں میں نے خاندانی منصوبہ بندی والوں کے ترجمان رسالے میں ایک کہانی فیملی پلاننگ کے حق میں اور کثرت اولاد کے مسائل کے موضوع پر لکھی جس پر مجھے ایک غیر ملکی بینک کا چار سو مالیت کا چیک ملا۔ ان دنوں یہ خاصی معقول رقم تھی، خصوصاً میرے جیسے بے روزگار کے لئے۔ سوچا ایک چکر مری کا لگا آتے ہیں لہٰذا اکاؤنٹ کھلوا کر چیک کیش کرایا اور ابھی سیر کا پلان ترتیب دے ہی رہا تھا کہ شہر سے چچا کا فون آیا کہ ان کا ملنے والا ایک بندہ اسلام آباد جا رہا ہے جس کے وہاں بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اور اداروں میں وسیع تعلقات ہیں اور یہ کہ میں اپنے تعلیمی کاغذات لے کر ان کے ساتھ جانے کے لئے فوراً پہنچوں۔ میں نے دو جوڑے کپڑے اور سندیں بیگ میں اور چیک والے روپے جیب میں ڈالے اور شہر روانہ ہو گیا۔

چچا کے پاس پہنچا تو انہوں نے مذکورہ شخص کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے کہ وہ اتنا کمال کا بندہ ہے کہ تمہارا کام تو اشارے سے ہو جائے گا کل تمہیں اس کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے اس کے ساتھ کچھ اور لڑکے بھی جا رہے ہیں جن کو اس نے یورپ کے کسی نہ کسی ملک کا ویزہ لگوا کے دینا ہے۔ خود یہ بندہ فرانس میں ہوتا ہے، وہاں اس کا اپنا حلال کھانوں کا ہوٹل ہے۔ یہ واپسی میں ان لڑکوں کو بھی ساتھ ہی لے جائے گا۔ اتنے میں ایک مولوی صاحب چچا کی دکان میں داخل ہوتے نظر آئے۔ چچا نے اشارہ کیا کہ یہی ہیں وہ صاحب۔ انہوں نے آتے ہی بڑے خوبصورت لہجے میں کہا۔ ”السلام علیکم ورحمتہ اللہ شیخ صاحب!“

"وعلیکم السلام" ہم نے جواب دیا اور چچا نے ان کو بیٹھنے کے لئے سیٹ دیتے ہوئے کہا۔ "آیئے بیٹھئے حاجی صاحب!"

میں نے نووارد کا جائزہ لیا۔ مٹھی بھر شرعی داڑھی، لمبی زلفیں اور یہ دونوں چیزیں ابھی مکمل سیاہ تھیں لیکن سیاہی اور چمک قدرتی نہیں لگتی تھی۔ ہاتھ میں پتھر کی خوبصورت تسبیح سر پر ٹوپی کندھے پر رومال۔ منہ میں پان، لب پان و سگریٹ سے سرخ و سیاہ۔ سرخ و سفید رنگ موٹی موٹی چمکدار آنکھیں، درمیانہ قد فربہی مائل گٹھا ہوا جسم قیمتی لباس میں ملبوس دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں میں انگوٹھیاں۔ سردیوں کی آمد آمد تھی چچا نے ان کے لئے چائے کا آرڈر دیا اور حاجی صاحب کو بتایا کہ یہ ہے وہ لڑکا جس کا ذکر کیا تھا۔

"برخوردار! تم یوں سمجھو کہ تمہاری نوکری پکی۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسی نوکری چاہئے؟" حاجی صاحب نے پوچھا۔

"میری تعلیم بی اے ہے، اس کے مطابق کوئی بھی اچھی سی نوکری ہو جائے"۔

"کافی تعلیم ہے، تمہیں کئی نوکریاں مل سکتی ہیں۔ اپنے کاغذات کی نقول کے آٹھ دس سیٹ بنوالو میں کل تمہیں لے لوں گا"۔

چائے پینے کے دوران حاجی صاحب چچا کو حج کے قصے سناتے رہے چچا خاصے مرعوب تھے پھر وہ نماز کا وقت ہونے پر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہم دکان پر بیٹھے تھے کہ ایک گاڑی آ کر رکی اس میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر حاجی صاحب اور پیچھے سمارٹ سے تین لڑکے بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں بیگ سنبھالتا پچھلی سیٹ پر بیٹھے تین نوجوانوں کے ساتھ گھس کر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی تو حاجی صاحب نے میرا ان سے اور ان کا مجھ سے تعارف کرایا ان میں سے ایک کے باپ کی شوز فیکٹری تھی دوسرا ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا اور تیسرا ایک گدی نشین کا بھائی تھا یعنی وہ تینوں ہر لحاظ سے تگڑی پارٹیاں تھیں اور ان کے سامنے میری مالی حیثیت کم تھی۔ اسی دوران ریلوے سٹیشن آ گیا اور حاجی صاحب نے ایک لڑکے کو ٹیکسی والے کو فارغ کرنے اور دوسرے کو ٹکٹیں لانے کا کہا۔ حاجی صاحب نے سٹیشن سے وضو کیا اور ہمیں لے کر گاڑی میں سوار ہو گئے اور تیسرے لڑکے کو کچھ کھانے کے لئے لانے کو کہا۔ یعنی وہ منصفانہ طور پر سب کا ساتھ ساتھ خرچ کرا رہے تھے اور لڑکے مریدوں کی طرح ان کے دست بستہ غلام بنے ہوئے تھے۔

گاڑی چلی تو حاجی صاحب نے پیرس کے رنگین قصے چھیڑ دیئے اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا تو حاجی صاحب نے چلتی ٹرین میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے بیگ سے تاش نکالی اور تینوں کو ساتھ بٹھا کر پتے بانٹ دیئے۔ اسلام آباد پہنچنے تک وہ مسلسل تاش کھیلتے رہے ہاں جہاں کہیں نماز کا وقت ہوتا حاجی صاحب اسی وضو سے نماز تاکید سے ادا کرتے۔ کھیل کے دوران حاجی صاحب ہر موضوع پر بولتے رہے جن میں مذہب سیاست معاشرت سے بھی شامل تھے اور سچی بات ہے ان کی اکثر باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں میں ان کی شخصیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ نماز اور تاش، دین اور یورپی رنگینیاں متضاد تھیں۔ مجھے انہوں نے بچہ سمجھ کر اپنے معاملات سے بارہ پتھر باہر کر رکھا تھا البتہ کھانے پینے میں مجھے برابر شریک رکھا جس کا سلسلہ ہر سٹیشن پر گاڑی رکتے ہی چل پڑتا۔

راولپنڈی پہنچ کر انہوں نے پھر ٹیکسی کرائی اور کسی ملنے والے کے پاس پہنچے وہ بھی حاجی صاحب کا معتقد لگتا تھا وہ اپنے ایک خالی مکان پر لے گیا اور تالہ کھول کر چابیاں حاجی صاحب کے حوالے کر کے کھانے کا پوچھا تو

حاجی صاحب نے کہا۔ رات کا کھانا بھجوا دینا کیونکہ ہم تھکے ہوئے ہیں لیکن پھر تکلف نہ کرنا صبح سے ہم اپنے ناشتے اور کھانے کا انتظام خود کرلیں گے۔ ان کا معتقد سلام کر کے چلا گیا اور گھنٹہ ڈیڑھ بعد نہایت پُرتکلف کھانا لے کر آیا جو ہم نے چٹخارے لے کر جی بھر کے کھایا جس کے بعد ہمارا میزبان برتن لے کر چلا گیا۔ اب حاجی صاحب نے ایک لڑکے کو چائے کا سامان لانے کا حکم دیا وہ پتی چینی اور ڈبے والا دودھ لے آیا تو حاجی صاحب نے خود چائے بنائی اور سب کو پلائی۔ اس کے بعد پھر یورپ کی باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ زور جنسی آزادی اور عیاشی کی سہولیات پر تھا لڑکے بڑے اشتیاق سے یہ گفتگو سن رہے تھے اس دوران مجھے نیند آ گئی تو میں سو گیا وہ نجانے کب تک جاگتے رہے۔

صبح میرے جاگنے سے پہلے پُرتکلف ناشتہ تیار تھا کچھ چیزیں بازار سے منگوائی گئی تھیں اور باقی حاجی صاحب نے تیار کی تھیں۔ ناشتے کے بعد ٹیکسی منگوائی گئی اور یورپی سفارت خانوں کی طرف رخ کیا گیا۔ حاجی صاحب کا دعویٰ تھا کہ ان کی سفارت خانوں میں اچھی جان پہچان ہے مگر وہاں پہنچ کر معاملہ کچھ اور نکلا۔ حاجی صاحب ہر سفارت خانے پر پہنچ کر چپڑاسی کی مٹھی گرم کر کے سفارت خانے کے کسی پاکستانی آفیسر کے بارے میں معلومات حاصل کرتے کہ وہ کس ٹائپ کا ہے کس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور کس پیر کا مرید ہے پھر وہ اسی چپڑاسی کے ذریعے اندر پہنچ کر اس افسر کے ہم مسلک یا پیر بھائی بن جاتے۔ چرب زبان تو تھے ہی مخاطب کو شیشے میں اتارنے کا فن بھی آتا تھا بغیر کسی لائن کے ان لڑکوں کے کاغذات کئی سفارت خانوں میں جمع کرا دیئے کہ چلو جہاں سے ویزہ پہلے لگ گیا۔ اتنے میں دوپہر ہو گئی اور وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اب تمہارا کام کرتے ہیں۔ اس سے پہلے

خوبصورت بات

تم دنیا میں ہر کسی سے جیت سکتے ہو مگر اس سے نہیں جیت سکتے جو تمہارے لئے جان بوجھ کر ہار جائے۔

انھوں نے مجھے یوں نظرانداز کر رکھا تھا جیسے میں موجود ہی نہیں ہوں۔

راستے میں حاجی صاحب مجھے لے کر کچھ اداروں میں گئے اور اسی طریقہ کار کے مطابق چپڑاسی کی مٹھی گرم کر کے افسر اعلیٰ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے تھوڑی بہت اپنے حلیے میں تبدیلی کر کے یعنی پگڑی ٹوپی بدل کے افسر اعلیٰ سے ملتے۔ اپنا تعارف اس کے ہم مسلک یا پیر بھائی کے طور پر کرا کے اس کے مواقف گفتگو کر کے میری ملازمت کے لئے بات کرتے اور کاغذات جمع کرا دیتے۔ افسر اعلیٰ اخلاقاً وعدہ کر لیتا کہ میں آرڈر کرا کے بھجوا دوں گا۔ میں نے نوٹ کیا کہ حاجی صاحب کو تمام فرقوں اور ان کی ذیلی شاخوں، تصوف کے سلسلوں مشہور پیروں، ان کے خلفاء اور سسٹم کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل تھیں اور ان میں سے کسی کا بھی ہم خیال بننے میں ان کو ذرا بھی دیر نہ لگتی تھی۔ خود ان کا اپنا نظریہ کیا تھا یہ میں آخر تک نہیں جان پایا کہ وہ ہمیشہ وہ ہو جاتے تھے جو مخاطب ہوتا تھا۔ دفتر ٹائم ختم ہونے پر واپس ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے۔ واپسی سفر کے لئے کرایہ و دیگر اخراجات کی ادائیگی کے لئے مجھے حکم دیا جو میں نے خاموشی سے کر دی۔

ٹھکانے پر پہنچ کر مرغ بھونا جو راستے سے لے لیا گیا تھا وہ ہم نے مزے لے لے کر کھایا پھر سو گئے اور شام کو مچھلی منگوائی گئی جو رات کو فرائی کی گئی۔ پھر چائے کے بعد دوبارہ گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا۔ حاجی

صاحب نے رومیو جولیٹ کی داستان سنائی اور یورپ کی تفریح گاہوں کا حال بڑے رنگین انداز میں سنایا جس سے وہ لڑکے یوں بے قرار ہو گئے کہ بس چلتا تو اڑ کر یورپ پہنچ جاتے۔

دوسرے دن بھی پہلے دن کی طرح پہلے سفارت خانوں کی طرف گئے اور کچھ مزید جگہوں پر کاغذات جمع کرائے۔ پھر کچھ اداروں کے سربراہان کو میرے کاغذات دے کر آرڈر کا وعدہ لیا گیا۔ دفتر ٹائم کے بعد مجھے انہوں نے واپسی کا اذن دے دیا کہ ان کا کام لمبا تھا اور انہیں کئی دن رکنا تھا جبکہ میرے آرڈر تو گھر پہنچے تھے۔

جب میں گھر پہنچا تو ان چار سو روپوں میں سے میرے پاس ایک روپیہ بھی نہ بچا تھا۔ آرڈر آنے تھے نہ آئے۔ ان لڑکوں کے ویزے بھی نہ لگے مگر وہ حاجی صاحب ان رنگین بیانیوں کی وجہ سے ہر صورت اور ہر قیمت پر یورپ جانا چاہتے تھے لہٰذا حاجی صاحب نے ان سے خاصی رقم اینٹھ کر انہیں غیر قانونی طور پر لے جانے کی کوشش کی وہ تو ترکی سے آگے نہ جا سکے البتہ خود حاجی صاحب کسی نہ کسی طرح بارڈر پار کر گئے۔

بعد میں حاجی صاحب کے ایک ساتھی نے بتایا کہ حاجی صاحب یورپ میں غیر قانونی طور پر رہ چکے ہیں ایک عرصے کے بعد کسی مجبوری کے لیے گھر آئے تو ناگہانی طور پر ساری رقم خرچ ہو گئی۔ ویزہ پہلے ہی نہ تھا لہٰذا انہوں نے تین موٹی آسامیوں کو چرب زبانی سے پھنسا کر خرچہ اکٹھا کیا اور کچھ ایجنٹوں کو دے دلا کر واپس پہنچ گئے اور جاتے جاتے میری حرام کی کمائی کو بھی ٹھکانے لگا گئے۔ تب سے میں بطور کفارہ فیملی پلاننگ کے خلاف لکھنے لگا۔

☆★☆

تاریخی ناول

سمرقند سے ہندوستان آنے والی بے نام خاتون کی اولاد کے بے مثل عروج کی کہانی اس کی بیٹی کے زوال اور بے نام تنزل کے سفر پر ختم ہوگئی۔

مغلانی بیگم

رفیق ڈوگر

آخری قسط

شاہی لشکر گاہ کے محافظ دستے نے نصف رات گزرے دور سے سواروں کو آتا دیکھ کر وہیں رک جانے کا حکم دیا تو شجاع الدولہ نے بلند آواز میں اپنا نام پکارا اور فوری طور پر بادشاہ معظم کے حضور حاضری کی خواہش ظاہر کی۔ دستے کے کمانڈار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''رات کے اس حصہ میں بادشاہ معظم کے حضور حاضری ممکن نہیں بادشاہ معظم خواب گاہ میں تشریف لے جاچکے ہیں''۔

''مجھے بادشاہ معظم کے آرام میں مخل ہونے کا احساس ہے مگر پیغام حضور کی نیند اور آرام سے زیادہ اہم ہے''۔ شجاع الدولہ نے تیزی سے جواب دیا۔

وہ شجاع الدولہ کو شاہی خیمہ گاہ کے محافظ دستے کے کمانڈار کے پاس لے گیا۔ وہ بھی رات کے اس حصہ میں نواب شجاع الدولہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوا اور بادشاہ کو خواب سے بیدار کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک شاہی خیمہ گاہ میں شمع کی روشنی پھیلی۔

''ہم سمجھتے ہیں نواب شجاع الدولہ کوئی اہم خبر لے کر آئے ہیں''۔ احمد شاہ ابدالی نے خیمہ کے اندر سے بلند آواز سے پوچھا۔

''بادشاہ معظم! خبر بہت بری ہے''۔ شجاع الدولہ نے وہیں سے چلا کر کہا۔

بادشاہ شب خوابی کے لباس میں خیمہ سے باہر آگئے۔ محافظوں اور شجاع الدولہ نے سر جھکا کر سلام کیا۔

''حضور مرہٹہ فوجیں حملہ کے لئے اپنی لشکر گاہ سے روانہ ہو چکی ہیں''۔ شجاع الدولہ نے بادشاہ کو دیکھتے ہی بتایا۔

''ہمارے پاس تو ان کی درجنوں صلح کی درخواستیں موجود ہیں جن میں آپ کی سفارشیں بھی شامل ہیں۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع تو نہیں دی؟'' احمد شاہ ابدالی نے اطمینان سے پوچھا۔

''حضور! میرے مخبر کی اطلاع درست ہے۔ مرہٹہ توپ خانہ بھی حرکت میں آچکا ہے''۔

احمد شاہ ابدالی نے گھوڑا منگوایا اور اسی لباس میں شجاع الدولہ کے ہمراہ خود جائزہ لینے نکل پڑے۔ افغان سردار اور ہندوستانی امراء کے ڈیروں میں مکمل سکون تھا۔ وہ مرہٹوں کی طرف سے صلح کی درخواستوں کے بعد بے فکر سو رہے تھے۔ نجیب الدولہ کے ڈیرے کے پاس پہنچے تو سامنے سے چند سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ملے۔ شاہی محافظ دستے کے کمانڈار نے انہیں رک جانے کا حکم دیا تو سب نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ''مابدولت اس پریشانی کا سبب جاننا چاہتے ہیں''۔ احمد شاہ ابدالی نے سواروں کو قریب بلا کر پوچھا۔

''حضور! مرہٹہ فوجیں حملہ کے لئے اپنی لشکر گاہ سے باہر صفیں باندھ چکی ہیں''۔ ایک سوار نے بادشاہ کو پہچان کر سلام کے بعد بتایا۔

''مابدولت خوش ہیں کہ ہماری غفلت کے وقت بھی تم ہوشیار رہے۔ اپنے ساتھیوں کو خبردار کرو، ہم تیار ہیں''۔ بادشاہ نے کہا اور شجاع الدولہ سے مخاطب ہوئے۔ ''نواب صاحب بھاؤ نے آپ کو بھی دھوکہ دیا اور مجھ کو بھی دھوکہ دیا مگر آج معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان کو دھوکہ دینا آسان نہیں، خدا حافظ! آپ بھی تیاری کریں''۔ انہوں نے اپنے محافظ دستے کے کمانڈار کو جنگ کا طبل بجانے کا حکم دے کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔

شجاع الدولہ وہیں کھڑا رہا، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ ''مسلمان اتنی جلدی تیار نہیں ہو سکتے''۔ انہوں نے اپنے پرچہ نویس سے کہا۔ مرہٹے آج انہیں فنا کر دیں گے اور مستقبل کا مورخ مجھ پر غداری کا الزام دے گا۔ ان کی آواز سے افسوس اور دکھ ٹپک رہا تھا۔

جنگ کا طبل بجنے کے بعد سب سے پہلے نجیب الدولہ کے ڈیرہ میں تکبیر کا نعرہ بلند ہوا، پھر شاہی لشکر گاہ افغان سرداروں روہیلہ سرداروں اور ہندوستانی امراء کی لشکر گاہوں میں ایک سرے سے دوسرے تک تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے۔

شجاع الدولہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا، رات کی سیاہی صبح کی روشنی سے پسپا ہونے لگی تھی، وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے مرہٹہ فوجیں چڑھی آتی تھیں۔ مسلمانوں کی لشکر گاہ میں تکبیر کے نعروں کے باوجود اس کا دل کانپ رہا تھا۔ ''حضور! چلیں شاہی فوجیں سمندر کی لہروں کی مانند چڑھی آتی ہیں''۔ پرچہ نویس نے پیچھے کی طرف دیکھ کر شاہی لشکر گاہ کی طرف اشارہ کیا۔

شجاع الدولہ نے گردن گھما کر دیکھا تو حیران رہ گیا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو فوجیں ایک گھنٹہ پہلے غفلت کی نیند سو رہی تھیں۔ وہ اتنی تیزی سے لڑائی کے لئے صف بستہ ہو گئی ہیں۔ ''اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ آج مسلمان ہی فتح یاب ہوں گے۔ اگر نہ بھی ہوئے تو غفلت میں نہیں مارے جائیں گے''۔ اس نے اپنے پرچہ نویس سے کہا۔ ''رات تک میرا ارادہ لڑنے کا نہیں تھا مگر اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی تلوار نکال کر مسلمانوں کا ساتھ دوں''۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ اپنی لشکر گاہ کی طرف موڑ لیا۔

***

طبل جنگ سے مغلانی بیگم کے خواب پریشان ہو گئے۔ وہ زرہ بکتر لگا کر خیمے سے باہر آئی تو اس کے مختصر سے دستہ کے ہتھیار بند سوار منتظر تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے پہلے سے جنگ کا جو نقشہ تیار کر رکھا تھا اس کے مطابق ہر سردار اور سالار کو معلوم تھا کہ لڑائی کے وقت اسے کس پوزیشن پر اپنے لشکر کو صف بستہ کرنا ہے۔ مغلانی بیگم اور اس کے دستہ کے لئے اس نقشہ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ لڑائی میں عملاً شامل ہونے سے زیادہ احمد شاہ ابدالی کو دکھانا چاہتی تھی کہ مرحلہ جنگ میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ اس نے بھی گھوڑے کا رخ میدان جنگ کی طرف موڑ دیا۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی، جنگ کے نقشہ میں خون سے رنگ بھرا جا رہا تھا، تین لاکھ مرہٹہ فوج کے سامنے بادشاہ اور ان کے ہندوستانی ساتھیوں کی چھیاسٹھ ہزار فوج سات کوس چوڑے محاذ پر پھیل چکی تھی، ابراہیم گاردی کی توپیں آگ برسا رہی تھیں، لشکر گاہ سے باہر نکل کر وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی، ارد گرد کا جائزہ لیا اور قلب کا اندازہ کر کے گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا۔

احمد شاہ ابدالی کے لئے قلب سے پیچھے ایک اونچے ٹیلے پر سرخ خیمہ نصب کر دیا گیا تھا، اس خیمہ سے وہ لڑائی دیکھ رہے تھے اور تیز رفتار ہرکاروں کے ذریعے مختلف محاذوں پر اپنے سرداروں کو ہدایات بھیج رہے تھے۔ بیگم اپنے سواروں کے ہمراہ ٹیلے کے قریب پہنچی تو ایک ہرکارے نے بادشاہ کو اس کی آمد کی اطلاع کر دی، بادشاہ نے بیگم کے سواروں کو اپنے خاص دستہ کے ساتھ ٹھہرنے کا حکم دیا اور بیگم کو ایک خیمے میں بھجوا دیا۔

جیسے جیسے دن کی روشنی پھیل رہی تھی جنگ اور گولہ باری میں شدت آتی جا رہی تھی۔ بادشاہ کے احکامات لے جانے والے ہرکاروں کے گھوڑے اور بھی تیز دوڑنے لگے تھے۔ گرد و غبار چیخ و پکار توپوں، بندوقوں اور بانوں کی آوازیں ''تکبیر'' اور ''جے بھوانی'' اور ''ہر ہر مہادیو'' کے فلک شگاف نعرے۔ مغلانی بیگم نے لڑائی کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ فتح کس کی ہو گی وہ کچھ اندازہ نہ کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ پرسکون تھی۔ فتح کسی کی بھی ہو، شکست کسی کے مقدر میں آئے ذاتی طور پر اسے کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ وہ خود بادشاہ معظم کے لشکر کے ہمراہ تھی اور عماد الملک میدان جنگ میں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی مرہٹوں کا حلیف تھا۔ جنگ کی صورت حال کی بجائے وہ

جنگ کے بعد کی صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

پوہ کی آخری دوپہر اپنا چمکدار دامن پھیلانے کی کوشش میں کافی کامیاب ہو چکی تھی۔ بادشاہ کے سرخ خیمے اور گرد کے بادلوں میں چھپے میدانِ جنگ کے درمیان بھاگنے والے گھوڑوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی تو بیگم کے خیمہ کے باہر شاہی دستہ کے سواروں اور سرداروں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے لڑنے والے اس کے خیمہ کے بہت قریب پہنچ چکے ہوں مگر جب کافی دیر تک وہ کچھ اندازہ نہ کر سکی تو خیمے سے باہر آ گئی۔ ٹیلے کی بلندی سے اس نے افغان فوجوں کو پسپا ہوتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تو ایک لمحہ کے لیے اسے عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ زرہ بکتر اور تلوار اتار کر نقاب اوڑھ لے اور خیمے میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ افغان فوجیں مرہٹوں کے مقابلہ میں جس بے ترتیبی اور تیزی سے پسپا ہو رہی تھیں اس سے مرہٹوں کی فتح یقینی دکھائی دیتی تھی۔

اسی لمحے شاہ کے خیمے سے تکبیر کا نعرہ بلند ہوا اور شاہی دستہ کے سوار بھاگ بھاگ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ اس کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ کوئی اس کا اپنا سوار یا خدمت گار قریب موجود تھا، وہ پریشان ہو گئی اگر بادشاہ بھی بھاگ رہا ہے تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ ابھی وہ یہی سوچ ہی رہی تھی کہ بادشاہ خیمے سے برآمد ہوا نہایت اطمینان سے اپنے دستوں کا معائنہ کیا اور گھوڑے کا رخ میدانِ جنگ کی طرف موڑ دیا۔ ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے شاہی دستہ کے سوار گرد اڑاتے جا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ بادشاہ کو خود محاذ کی طرف جاتا دیکھ کر پسپا ہونے والے سوار اور پیدل بھی پلٹنے لگے ہیں اور میدانِ جنگ سے بھاگنے والی افغان فوج پھر سے منظم ہونے لگی ہے اور تکبیر کے نعروں کی آواز اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

ایک سوار نے اطلاع دی کہ شاہی دستہ کے کمانڈر انہیں شاہی حرم کے خیموں میں پہنچانے کا حکم دے گئے تھے۔

شاہی حرم کی بیگمات کنیزیں اور خادمائیں ایک خیمہ میں جمع تھیں اور قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اس نے وضو کیا اور قرآن کھول کر بیٹھ گئی مگر اس کی نظر قرآن کے حرفوں پر تھی اور کان توپوں کی آوازوں کی طرف لگے تھے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو بیگمات نے قرآن بند کر کے نماز ادا کی اور پھر تلاوت شروع کر دی۔ عصر کے وقت بھی سب نے ایسا ہی کیا۔ بیگم اور کنیزوں میں سے کسی نے دن بھر نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ غروبِ آفتاب کے قریب خیمے میں فرشی دسترخوان پر کھجوریں اور مشروب چنے جا رہے تھے کہ خیمہ گاہ سے باہر ایک سوار نے بلند آواز میں تین بار کلمہ شہادت پڑھا، بیگمات اور کنیزوں نے بھی کلمہ شہادت پڑھا اور سب قبلہ رخ ہو کر سجدہ میں گر گئیں۔ سجدہ سے سر اٹھا کر خواتین ملکۂ عالیہ کو فتح کی مبارکباد دینے لگیں۔ مغرب کی اذان کی آواز پر ملکہ افطاری کے لئے اپنے ہاتھ سے کھجوریں تقسیم کرنے لگی۔ وہ سب روزہ سے تھیں، مغلانی بیگم نے بھی ملکہ کو فتح کی مبارکباد دی مگر وہ اپنے دل میں ایسی خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی جو حرم کی کنیزوں کے چہروں پر چمکنے لگی تھی۔

***

قاضی اور یس شاہی خیمے میں داخل ہوئے تو احمد شاہ ابدالی نے اپنی مسند سے اتر کر ان کا استقبال کیا اور جب تک وہ تشریف فرما نہیں ہو گئے بادشاہ، وزراء، امراء اور سردار سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

سب بیٹھ چکے تو قاضی اور یس پھر کھڑے ہو گئے۔ حمد و ثنا کے بعد انہوں نے باطل پر حق کی فتح عظیم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور بادشاہ معظم کو مبارکباد دی۔

بادشاہ معظم سر جھکائے بیٹھے تھے۔ قاضی ادریس بات ختم کر چکے تو بادشاہ نے کفر پر اسلام کی فتح کے لئے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لا کر کہا۔ ”یہ فتح اللہ کے کرم، ہمارے سامنے اور اپنے خیموں میں موجود غازیوں کی بہادری اور ان ہزاروں شہیدوں کے خون سے حاصل ہوئی ہے جو اب ہم میں موجود نہیں۔ یہ فتح ہندوستان کے مسلم امراء اور حاکموں کے اتحاد کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ انتشار باہمی نے ملت پر سیاہ بختی کے جو سائے دراز کر دیئے تھے آج وہ سب لپٹ گئے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ مسلمانان ہندوستان کا یہ اتحاد جاوداں رہے، ان کا مقدر پہلے کی طرح درخشاں ہو اور ہمیں پھر کبھی ہندوستان کا سفر اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے“۔

قاضی ادریس نے نگاہیں اٹھا کر پہلے بادشاہ کی طرف دیکھا اور پھر نواب نجیب الدولہ کی طرف جو بادشاہ کے چہرے پر نظریں جمائے سن رہے تھے، ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ معظم کے الفاظ ان کی توقع کے مطابق نہیں۔

”مابدولت کوشش کریں گے کہ ہندوستان کے مسلمان امراء اور سردار جلد کسی مستحکم نظم پر متفق ہو جائیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری اس خواہش میں بھی ہماری اسی طرح مدد کریں گے جس طرح باطل کے خلاف اس لڑائی میں انہوں نے ہم سے تعاون کیا۔ آج ہم اپنے شہداء کو دفنائیں گے اور کل سب مسلمان اس فتح پر شکرانے کا روزہ رکھیں گے“۔ بادشاہ نے کہا۔

قاضی ادریس نے بے چینی سے کروٹ بدلی، ان کے چہرے پر اطمینان کی جگہ پریشانی چھانے لگی تھی۔ انہیں امید تھی کہ اتنی بڑی فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس قندھار جانے کا ارادہ ترک کر دیں گے اور شاہجہان آباد کے تیموری تخت پر جلوہ افروز ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کرنے کے لئے جہاد جاری رکھیں گے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہجہان آباد کے علماء کرام بھی اس امید میں ان کے ہم خواہش تھے۔ ان سب کی رائے تھی کہ ہندوستان کی مسلم ملت اور سلطنت کو احمد شاہ ابدالی جیسے مضبوط حکمران کی ضرورت ہے۔

بادشاہ نے نواب نجیب الدولہ کی فراست اور ہوشیاری کی تعریف کی اور بھاؤ کی صلح کی درخواستوں کا ذکر کر کے نواب شجاع الدولہ سے مخاطب ہوئے۔ ”نواب شجاع الدولہ مرہٹوں کی دوستی کے جذبے سے دھوکہ کھا گئے اور ہم نے نواب صاحب کے خلوص پر اعتبار کر لیا۔ اگر خدا تعالیٰ کا کرم شامل نہ ہوتا تو ہم کفر کی چال میں پھنس جاتے“۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ ”مابدولت اس غازی کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ہماری غفلت میں بھی ہوشیار رہا اور دشمن کی چال پر نظر رکھی“۔

بادشاہ کے حکم پر شاہ ولی خاں نے ملک قاسم کو دربار میں طلب فرمایا۔ اس نے سلام کیا، سب نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ بادشاہ نے اپنی تلوار اتار کر حکم دیا۔ ”مابدولت اس غازی سے بہت خوش ہیں، یہ شمشیر انہیں پہنا دی جائے“۔

ملک قاسم نے تلوار کو بوسہ دیا اور آداب عرض کر کے خیمے سے باہر چلا گیا۔

نواب شجاع الدولہ لڑائی سے پہلے صلح کی کوششوں میں مصروف رہے تھے۔ لڑائی کے دوران بھی مرہٹہ فوجوں نے ان کے مورچوں پر حملہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے خود آگے بڑھ کر مرہٹوں پر وار کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ شاہی فوج کے قلب پر مرہٹوں کے حملے کی شدت کے وقت جب افغان فوجیں پسپا ہو رہی تھیں اور شاہ ولی خاں گھوڑے سے کود کر پیدل دست بدست لڑائی میں مصروف تھے تو انہوں نے شجاع الدولہ کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ ان کی مدد کو آئیں لیکن انہوں نے جواب دیا تھا کہ وہ

اپنے مورچے نہیں چھوڑ سکتے۔ مرہٹہ دستے شجاع الدولہ کے مورچوں کے پاس سے گزر کر نجیب الدولہ پر بار بار حملے کرتے رہے تھے کیونکہ وہ انہیں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے جس نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلایا تھا اور شجاع الدولہ کی صلح کی کوششوں کو ناکام بنایا تھا۔ بادشاہ نے نواب نجیب الدولہ کی فراست کے ذکر کے ساتھ شجاع الدولہ کی صلح کی کوششوں اور مرہٹوں کی فریب کاری کا ذکر کیا تو شجاع الدولہ نے نگاہیں جھکائی تھیں۔

''بادولت نواب شجاع الدولہ کی ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی مسلم سلطنت کے استحکام کے لئے آئندہ بھی اسی خلوص اور جذبہ سے سب کو اکٹھا رکھنے میں تعاون کریں گے''۔ بادشاہ نے ان کی نگاہیں جھکتے دیکھ کر کہا وہ انہیں ہندوستان کی مسلم سلطنت کا وزیراعظم نامزد کر چکے تھے اور ان کے مقام و مرتبہ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

شجاع الدولہ نگاہیں جھکائے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

***

مغلانی بیگم اپنے خیمے میں بیٹھی بہت اداس تھی۔ شاہی لشکرگاہ میں لڑائی میں فتح پر خوشی اور شادمانی کا جو ماحول تھا اس کے خیمے میں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے اپنے سواروں اور خدام نے بیگم کے اس رویہ کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس لئے جب ملک سجاول اور قاسم کی سواریاں ان کے ڈیرے میں داخل ہوئیں تو ان کی نگاہیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ پس پردہ کی ڈیوٹی پر مامور کنیز نے ان کی آمد کی اطلاع بیگم کو دے کر قصداً تاخیر سے باہر آئی تاکہ بیگم اپنی حالت پر قابو پا سکیں۔ ملک سجاول اور قاسم اپنے گھوڑے خدام کے سپرد کر کے خیمے کے سامنے کھڑے تھے مگر کنیز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ ''خدانہ کرے بیگم عالیہ کی طبیعت ٹھیک ہو؟'' قاسم نے آہستہ سے اپنے سردار سے کہا۔

''کفر پر مسلمانوں کی اس عظیم فتح سے ہندوستان کے سابق وزیراعظم اور نامزد وزیراعظم دونوں کے خواب پریشان ہو گئے ہیں اور بیگم صاحبہ سابق وزیراعظم کی خوشدامن ہیں''۔ ملک سجاول نے نوجوان قاسم کو سمجھایا۔

''جب بادشاہ معظم نے نواب نجیب الدولہ کی فراست کی تعریف کے بعد نواب شجاع الدولہ کی صلح کے لئے کوششوں اور بھاؤ کی فریب کاری کا ذکر کیا تو نواب شجاع الدولہ کے چہرے کے تاثرات کچھ اچھے نہیں تھے''۔ قاسم نے کہا۔

''نواب شجاع الدولہ کے حسد اور بغض کا نشانہ اب نواب نجیب الدولہ ہوں گے اور یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اچھی نہیں ہو گی''۔

ملک سجاول نے اتنا ہی کہا تھا کہ خادم نے انہیں بیگم صاحبہ کے اذن باریابی سے آگاہ کیا، وہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر خیمے کی طرف چل دیئے۔

مغلانی بیگم نے خلاف آداب خیمے کے دروازے پر دونوں کا استقبال کیا۔ ''ہم غازی بھائی اور بیٹے کا استقبال کرتے ہوئے بے پایاں مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ کفر پر اسلام کی اس عظیم فتح میں ان کا کردار ہمارے لئے باعث فخر ہے''۔ مگر کوشش کے باوجود ان کا چہرہ ان کی حالت دل کی گواہی سے انکار نہ کر سکا۔

''یہ ان جذبوں کی فتح ہے جو ہندوستان کی مسلم ملت کی سلامتی کے لئے وقف ہیں''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔ ''نصرت خداوندی اور شوق شہادت اس کا سبب ہے۔ ہم تو اس لشکر کی گرد راہ بھی نہیں''۔

بیگم نے ملک سجاول کے غیر ارادی الفاظ کی چبھن کو مسکراہٹ کی ڈھال پر لیا۔ ''ہم مسلم ملت کی فتح کے لئے دعا کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ سوچا آپ کو دیکھ کر اپنی دعاؤں کی قبولیت پر یقین پختہ ہو جائے گا''۔

''حضور کے حکم کی تعمیل لازم تھی۔ بادشاہ معظم شہداء

کو دفنانے جا چکے ہیں، یہ خادم بھی اس فرض کی ادائیگی میں شامل ہونے جا رہا تھا کہ حضور کا پیغام موصول ہو گیا"۔ ملک سجاول نے اپنے الفاظ کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

"ہم سنتے ہیں کفار کی لاشیں میلوں تک پھیلی ہیں، حق نے ان کا غرور پانی پت کے میدان میں دفن کر دیا؟"

"یہ خداتعالیٰ کا کرم ہے، اس نے قلت کو کثرت پر فتح یاب کیا"۔ ملک سجاول نے ظاہر کیا کہ وہ بیگم کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

کنیز جواہر سے مرصع تلوار دونوں ہاتھوں پر اٹھائے خیمے میں داخل ہوئی اور سیدھی چلتی ہوئی بیگم کے سامنے جا کر رک گئی۔ بیگم اپنی نشست سے اٹھی تو ملک سجاول اور ملک قاسم بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بیگم نے کنیز کے ہاتھوں سے تلوار لی، اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غور سے دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھا کر قاسم کی طرف بڑھا دی۔ "ہم نے اپنے بیٹے کی جاں نثاری کا سنا تو سجدہ شکر ادا کیا۔ اس غربت اور مسافرت میں ہم اس حقیر سے تحفے کے سوا کچھ پیش نہیں کر سکتے، اس سے آپ کو ہماری خوشی اور مسرت کا تھوڑا سا اندازہ ہو سکے گا۔ یہ تلوار ہمارے خاندان میں تین نسلوں سے چلی آئی ہے اور اب اس کو لگانے اور لڑائی کے میدان میں چلانے والا اس خاندان میں ہمارے اس بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں"۔

بیگم کے الفاظ میں چھپا دکھ اور تلخ حقیقت محسوس کر کے ملک سجاول افسردہ ہو گیا۔ بیگم کا حال اس کے خاندان کے ماضی کے مزار پر سر جھکائے دل گرفتہ کھڑا تھا۔ اس نے قاسم کی طرف دیکھا تو قاسم نے آگے بڑھ کر بیگم سے تلوار وصول کر کے شکریے کے لئے سر جھکا دیا۔

کنیز آداب عرض کر کے خیمے سے باہر جا چکی تو بیگم نشست پر بیٹھ کر ملک سجاول کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے الفاظ نے ملک سجاول کے دل پر گہرا اثر کیا تھا اور وہ ابھی تک "اب ہمارے خاندان میں اس تلوار کو لگانے اور چلانے والا کوئی نہیں رہا" پر غور کر رہا تھا۔

"ہم نے وقت کے طوفانوں سے لڑنے کی کوشش کی مگر ہم ناکام رہے اور طوفان جیت گئے۔ ہمیں نہ کسی سے شکوہ ہے نہ گلہ، بس ایک بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وقت نے دوسروں کے اعمال کی سزا کے لئے ہمیں کیوں منتخب کیا"۔ بیگم نے ملک کو زخمی دیکھ کر ایک اور تیر چلایا۔

"بادشاہ معظم حضور کی بہت قدر کرتے ہیں، کل لڑائی کے مرحلے میں حضور نے جو جرأت دکھائی کبھی کوئی مغل خاتون نہ دکھا سکی۔ افغان سردار اور امراء حضور کی جرأت اور جذبے کے معترف ہیں"۔ ملک نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہم بادشاہ معظم کی شفقت سے کبھی محروم نہیں رہے، ہم ہمیشہ ان کے کرم کے زیر بار رہے ہیں"۔

"بادشاہ معظم جلد شاہجہان آباد جانے والے ہیں، وہاں دربار میں حضور کی شرکت بعید نہیں"۔

"ہم تو سنتے تھے بادشاہ معظم نے واپس قندھار جانے کا اعلان کر دیا ہے"۔ بیگم نے ان کے شاہجہان آباد جانے کے ارادے کے بارے میں سن کر پوچھا۔

"واپس جانے سے پہلے بادشاہ معظم شاہجہان آباد میں سلطنت کے معاملات سلجھانے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔

"ہمیں تو بتایا گیا تھا بادشاہ معظم نے شاہ عالم ثانی کو شہنشاہ ہند اور نواب شجاع الدولہ کو وزیراعظم مقرر کر دیا ہے"۔

"حضور نے درست سنا مگر ملکہ عالیہ زینت محل کی خواہش پر بادشاہ معظم نے شاہجہان آباد جانے کا پروگرام بنایا ہے"۔ ملک نے بتایا۔

ملکہ زینت محل کی خواہش پر بادشاہ معظم نے قندھار واپسی کے پروگرام میں تبدیلی کر دی ہے، بیگم کے لئے یہ

بڑی اہم خبر تھی مگر وہ اس پر اپنی حیرانی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ''ملکہ عالیہ نواب نجیب الدولہ پر بہت اعتماد کرتی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ لڑائی میں شجاع الدولہ کے رویہ کی وجہ سے ملکہ عالیہ نواب نجیب الدولہ کو وزیر اعظم ہندوستان بنانے پر زور دیں گی''۔ بیگم نے سوال کیا۔

ملک سجاول اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ ''بادشاہ معظم نواب شجاع الدولہ کی بہت قدر کرتے ہیں اور جو بات کہہ دیں واپس نہیں لیا کرتے''۔

بیگم کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اس نے بادشاہ سے پہلے شاہجہان آباد پہنچنے کا ارادہ کرلیا۔ ''ہم بھی شاہجہان آباد جانے والے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ آپ کے کچھ سوار ہمارے ہمراہ رہیں''۔

''قاسم کا دستہ بھی شاہجہان آباد جانے والا ہے''۔ ملک سجاول نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''حضور کی تیاری مکمل ہوجائے تو اسے اطلاع بھجوادیں''۔

''ہم سنتے ہیں شاہجہان آباد کا مرہٹہ گورنر بخیریت بھاگ گیا''۔ بیگم نے ملک سجاول کے جواب پر غور کرنے کی بجائے ان سے پوچھا۔

''پانی پت میں مرہٹہ فوج کی شکست کے بعد بھاگنا اس کی مجبوری تھی''۔

''ہم یقین کرلیں کہ مرہٹہ گورنر کے بخیریت فرار میں ملکہ زینت محل نے مدد کی؟''

ملک سجاول مغلانی بیگم سوال پر چکرا گیا کہ اس خیمے میں مقیم ہوتے ہوئے بھی وہ سازشوں سے اتنی زیادہ باخبر ہے۔ ''ایسی افواہوں کی تصدیق شاہجہان آباد پہنچ کر ہی ہوسکے گی۔ اتنی بڑی لڑائی کے بعد افواہیں بھی بہت بڑی بڑی پھیلا کرتی ہیں''۔

''اقتدار کی جنگ میں سب کچھ ممکن ہے ملکہ عالیہ کا بیٹا ہندوستان کا شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے قیدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے رہائی دلانے کے لئے ملکہ کو سب فریقوں سے بنا کر رکھنا ہوگی''۔ مغلانی بیگم کی کوشش تھی کہ وہ ملک سجاول سے ہندوستان کی نئی صورت حال کے بارے میں معلومات حاصل کرے تاکہ ان کی روشنی میں نیا لائحہ عمل تیار کرسکے۔

''شاہ عالم ثانی کے اس حالت تک پہنچنے میں جن قوتوں کا ہاتھ ہے ان میں بیٹے بھی شامل ہیں۔ ملکہ زینت محل ان حقائق سے یقیناً باخبر ہوں گی''۔ ملک سجاول نے بات مکمل کرکے نگاہیں بیگم کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

بیگم نے محسوس کیا کہ اس نے خود ملک سجاول کو اس جواب پر مجبور کیا ہے۔ شاہ عالم ثانی کے فرار کا سب سے بڑا ذمہ دار تو عماد الملک اور اس کے اتحادی مرہٹے تھے۔

''ہم نواب نجیب الدولہ کو اس فتح پر مبارکباد دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان کی فراست اور خلوص نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔ ان سے آپ کے تعلقات ہمارے کام آسکتے ہیں''۔ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''نواب صاحب کے دشمن بھی ان کے خلوص اور فراست کے معترف ہیں، یہ خاکسار تو ان کا دعا گو ہے وہ اپنے شہداء کو دفنانے سے فارغ ہوں تو بندہ انہیں حضور کی خواہش سے آگاہ کردے گا''۔ ملک سجاول نے بے نیازی سے جواب دیا۔

مغلانی بیگم نے اندازہ کیا کہ وہ کسی موضوع پر بات بڑھانے پر آمادہ نہیں۔ ''ہم منتظر رہیں گے''۔ اس نے کہا۔

ملک نے شہداء کو دفنانے میں حصہ لینے کی خواہش پیش کرکے رخصت چاہی اور آداب عرض کرکے خیمے سے باہر نکل گئے۔

ملک قاسم خاموش بیٹھا بیگم اور ملک سجاول کے سوال و جواب سنتا رہا تھا۔ بیگم چاہتی کیا ہے وہ کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔ خیمے سے باہر آکر وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ملک

سجاول سے اس بارے میں پوچھنا چاہئے یا نہیں۔ ملک سجاول اس کی الجھن سمجھ گیا تھا۔ میدان جنگ میں کامیابی کے بعد وہ اسے میدان سیاست کے معاملات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

"ملکہ زمانی بیگم اپنے داماد کو معافی دلا کر کوئی منصب دلانے کی امید سے ابھی تک دست بردار نہیں ہوئی۔ شاہجہان آباد وہ اس لئے جلد پہنچنا چاہتی ہے تاکہ ملکہ زینت محل کو آمادہ کرسکیں اور نواب نجیب الدولہ سے اس لئے ملنا چاہتی ہے کہ نواب صاحب عماد الملک کے سب سے بڑے مخالف ہیں اور بادشاہ معظم نواب صاحب کی رائے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اگر ملکہ اور نواب صاحب آمادہ ہو جائیں تو احمد شاہ ابدالی بخوشی عماد الملک کو معاف کردیں گے۔ بیگم صاحب کی باتوں کو سمجھنے کے لئے ان کی خواہشات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔"

"لیکن کیا نواب نجیب الدولہ آمادہ ہو جائیں گے؟" قاسم نے پوچھا۔

"مومن کو ایک سوراخ سے دو بار ڈسنا ممکن نہیں ہوتا"۔ ملک سجاول نے رکاب میں پاؤں جماتے ہوئے جواب دیا۔

***

جس وقت احمد شاہ ابدالی پانی پت کے میدان جنگ سے شہداء کے جسد خاکی جمع کروا کر گنج شہیداں تیار کروا رہے تھے۔ شہداء کو لمبی لمبی مشترکہ قبروں میں دفنایا جا رہا تھا۔ نواب شجاع الدولہ مرہٹہ کمانڈر سداشیو بھاؤ کی لاش ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ان کے ہمراہ پانی کی مشکیں اٹھائے سقوں کے دستے تھے۔ نواب کے فوجی میلوں میں پھیلی مرہٹہ لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور جس لاش پر کسی سالار یا سردار کی ہونے کا شبہ ہوتا اسے پانی سے اچھی طرح دھو کر قیدی برہمنوں کو دکھاتے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون سی لاش کس کی ہے۔ لڑائی میں ایک لاکھ کے قریب مرہٹہ فوجی مارے گئے تھے جن میں سدا شیو بھاؤ کے علاوہ پیشوا بالاجی راؤ کا نوعمر بیٹا وشواس راؤ بھی شامل تھا جسے مہارانی نے شاہجہان آباد میں لال قلعہ کے تخت پر بٹھانے کے لئے مرہٹہ فوج کا برائے نام سالار بنا کر لشکر کے ساتھ بھجوایا تھا۔ اتنی ڈھیر لاشوں میں سے بھاؤ کی لاش ڈھونڈنا بہت دشوار تھا لیکن شجاع الدولہ مرہٹوں سے دوستی نبھانے اور مستقبل میں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر میدان جنگ میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ ایک بے سر کا دھڑ لباس سے کسی سردار کا دکھائی دیا تو شجاع الدولہ کے سقوں نے اسے اچھی طرح پانی سے دھویا قیدی برہمنوں نے پہچان کر تصدیق کردی کہ یہ سداشیو بھاؤ کا دھڑ ہے۔ شجاع الدولہ نے اسے اٹھوا کر بھجوادیا اور اس کا سر تلاش کرنے میں لگ گیا مگر تلاش بسیار کے باوجود مرہٹہ سالار کا سر نہ ملا۔ دھڑ کے گرد برہمنوں کا ہجوم دیکھ کر ایک افغان سپاہی رک گیا تھا۔ کچھ دیر تک کھڑا دھڑ دیکھتا رہا تھا پھر اپنے ساتھی کو اشارے سے کچھ کہہ کر آگے نکل گیا تھا۔ شجاع الدولہ کے آدمیوں نے انہیں اشارے کرتے دیکھ کر شجاع الدولہ سے کہا کہ وہ افغان سپاہی ضرور بھاؤ کے سر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ شجاع الدولہ نے اس سپاہی کا نام دریافت کیا اور سوچنے لگا تھوڑی دیر بعد وہ شاہ ولی خاں کے سامنے کھڑا تھا۔ احمد شاہ ابدالی بھی سداشیو بھاؤ کے سر اور دھڑ کے ملاپ کے خواہشمند تھے۔ شجاع الدولہ نے یہ ظاہر کیا کہ افغان سپاہی بھاؤ کے سر کے بارے میں جانتا تھا۔ شاہ ولی خاں نے اس سپاہی کو بلا کر پوچھا تو وہ مان گیا کہ جس سردار کا دھڑ شجاع الدولہ کے سقے دھو رہے تھے اسے اس نے قتل کیا تھا۔

"عین جنگ میں اس کی تلوار بجلی کی مانند چمک رہی تھی، وہ بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے کر نیزے کا وار کیا تو وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ ہم

اس کے ساتھیوں سے لڑنے گئے تو وہ بھاگ گئے، مڑ کر دیکھا تو وہ اپنے نیزے کے سہارے کھڑا ہو کر بڑی حسرت سے میدان جنگ میں اپنے سپاہیوں کے لاشے دیکھ دیکھ کر ہائے ہائے پکار رہا تھا۔ ہم نے گھوم کر اس کو ختم کیا اور آگے بڑھ گئے"۔

شاہ ولی خان کو بھی یقین ہو گیا کہ بھاؤ کا سر اسی افغان کے پاس ہے۔ "بادشاہ معظم جہاد کے لئے ہندوستان آئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں سرخرو کیا۔ تم نے کفار کے سالار کو قتل کیا اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ بادشاہ معظم بھی جان کر خوش ہوں گے۔ اگر آپ نے اس کا سر نہ دیا تو کفار کہیں گے۔ مسلمانوں نے جواہرات کے لالچ میں ہمارے سردار کا سر چھپا لیا تھا"۔

افغان سپاہی چپکے سے اپنے خیمے کی طرف چل دیا اور کپڑے میں لپٹا ہوا بھاؤ کا سر لا کر شاہ ولی خان کے حوالے کر دیا۔ "ہم کافر کے بچے کا یہ سر قندھار لے جانا چاہتا تھا تاکہ اپنے بھائیوں کو دکھائے کہ ہم نے اسے قتل کیا تھا"۔

شجاع الدولہ نے بھاؤ کا سر پہچان لیا۔

برہمنوں نے بھاؤ کا چہرہ صاف کیا اور دھڑ کے ساتھ رکھ کے شجاع الدولہ کے خیمے میں پہنچا دیا۔

نو عمر وشواس راؤ کی لاش ابھی تک نہیں ملی تھی۔ شجاع الدولہ بہت پریشان تھا۔ ایک افغان سپاہی نے شاہ ولی خان کو بتایا کہ اس کے کچھ ساتھی مرہٹوں کے بادشاہ کی لاش میدان جنگ سے اٹھا لائے تھے۔ وہ اسے کابل لے جانا چاہتے ہیں۔ شاہ ولی خان نے حکم دیا کہ وہ لاش لائی جائے۔ افغان سپاہیوں نے انکار کر دیا اور شجاع الدولہ کی مداخلت پر لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ شاہ ولی خان نے بادشاہ معظم کو آگاہ کیا تو بادشاہ نے ان افغان سپاہیوں اور ان کے سرداروں کو طلب فرمایا۔ "ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ دوسری قوموں کے سردار جو ذلیل ہو جائیں ان کی عزت کرو۔ کیا تم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے؟"

افغانوں نے بادشاہ معظم سے اس گستاخی کے لئے معافی کی درخواست کی اور وشواس راؤ کی لاش لا کر پیش کر دی۔

لاش بالکل صاف تھی، زخموں سے بہنے والا خون بھی صاف کر دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے پیشوا کے نوعمر بیٹے کی لاش دیکھی تو افسردہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خاص دستے کے سواروں کو حکم دیا کہ وہ وشواس راؤ کی لاش کی حفاظت کریں اور احترام کے ساتھ برہمنوں کے حوالے کر دیں اور دستہ اس وقت تک لاش کے ساتھ رہے جب تک اس کی چتا کی آگ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ احمد شاہ ابدالی کو مائل رحم دیکھ کر شجاع الدولہ نے ابراہیم گاردی کو ان کے حضور پیش کر دیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ جنگ سے پہلے بادشاہ نے اسے ذاتی مراسلہ بھیجا تھا کہ کفر کے خلاف اس جنگ میں وہ مسلمانوں کا ساتھ دے مگر اس نے جواب دیا تھا کہ وہ افغان ہے اور اس نے مرہٹوں کا نمک کھایا ہے اس لئے وہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ بادشاہ معظم کو دیکھتے ہی اس نے گڑگڑا کر درخواست کی کہ اس کے ماضی کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ آئندہ وہ زندگی بھر بادشاہ معظم اور مسلمانوں کی خدمت کرے گا۔

مرہٹوں کی طرف سے جنگ کی پہل ذاتی طور پر گاردی نے کی تھی۔ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں جھنڈا اٹھائے وہ حملہ کرتے والے اپنے افغان دستوں کی قیادت کر رہا تھا اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اس کے توپ خانہ اور سواروں نے پہنچایا تھا۔ افغان سردار اسے دیکھتے ہی مشتعل ہو گئے اور بادشاہ سے درخواست کی کہ گاردی کو ان کے حوالے کیا جائے۔ وہ خود اسے سزا دینا

چاہتے ہیں۔ افغان سردار شجاع الدولہ پر بھی برہم تھے کہ اس نے گاردی کو اپنے خیمہ میں چھپا کر پناہ کیوں دی۔ بادشاہ نے معاملہ کی نزاکت دیکھ کر گاردی کو اپنے ایک سردار کے حوالے کرنے کا حکم دیا اور کہا۔ وہ اس کے زخموں کا علاج کرے، جب وہ ٹھیک ہو جائے گا تو اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

افغان سرداروں کا غم وغصہ دیکھ کر ابراہیم گاردی کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ افغان سردار نے جلدی سے اسے اپنے ڈیرے پر بھجوا دیا۔

''بادولت کو بتایا گیا تھا کہ پیشوا کا بھائی مسلمان ہو گیا تھا، ہم اس کے بارے میں جاننا چاہیں گے''۔ بادشاہ معظم نے شجاع الدولہ سے پوچھا۔

''شمشیر بہادر لڑائی میں مسلمانوں کے خلاف بہت جان توڑ کر لڑتا ہوا دیکھا گیا تھا مگر سر بندہ زخمی اور برہمن اس کے بارے میں کچھ بتانے پر تیار نہیں۔ میدان جنگ میں اس کی لاش بھی کہیں نہیں ملی''۔ شجاع الدولہ نے عرض کیا۔

''بادولت غروب آفتاب سے پہلے شمشیر بہادر کے بارے میں جاننا چاہیں گے تاکہ اگر وہ جنگ میں کام آ گیا ہے تو ہم اسے دفنا کر اس کی قبر بنوا سکیں''۔ ابدالی نے شاہ ولی خان کو حکم دیا۔

***

شاہجہان آباد اسے ایک اجنبی شہر محسوس ہوا، خاموش ویران اور ماگھ کی سردی میں کانپتا ہوا۔ مغلانی بیگم نے اس شہر کے کئی روپ دیکھے تھے مگر یہ روپ اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ شہر کے مدرسوں اور مسجدوں میں مرہٹوں پر مسلمانوں کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا جا رہا تھا اور شاہ عالم ثانی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا تھا۔ لال قلعہ میں احمد شاہ ابدالی کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے باوجود بیگم کو شہر میں نہ فتح کی کوئی خوشی نظر آئی نہ استقبال کی گرمی کا احساس ہوا۔ اس کا مختصر سا قافلہ شہر میں داخل ہوا تو راہ چلتے لوگ گھوم کر دیکھتے اور آگے نکل جاتے۔ شاہجہان آباد کی حکمرانی کے خلاف بغاوت کے دنوں میں بھی یہ شہر اسے اپنا محافظ محسوس ہوا کرتا تھا مگر آج وہ اپنے کو ایک اجنبی شہر میں اجنبی مسافر محسوس کر رہی تھی، عدم تحفظ کے ایک انجانے خوف نے اس کی سوچ پر گرفت کر لی تھی۔

جب اس کا قافلہ حویلی میں داخل ہو رہا تھا تو مسجدوں سے شام کی اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس نے سواری کی لگامیں کھینچ لیں اور احتراماً اس وقت تک دروازے کے سامنے کھڑی رہی جب تک اذان ختم نہیں ہو گئی ملک قاسم نے اپنا گھوڑا خادم کے حوالے کیا اور جلدی سے مردانہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی اور اپنے اپنے گھوڑے وہیں چھوڑ کر مردانہ کی طرف چل دیئے۔ بیگم وہیں دیکھتی رہ گئی، وہ سوچنے لگی کہ اگر آج وہ پنجاب کی حاکم ہوتی تو کسی کو جرأت ہو سکتی تھی کہ اسے وہیں چھوڑ کر چلا جائے۔ اذان ختم ہوئی تو اپنے گھوڑے کی لگامیں خادم کے سپرد کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا گھوڑے کی نہیں وقت کی لگامیں اس کے ساتھ سے نکل رہی ہیں۔ نشست گاہ کے راستہ کے دونوں جانب کھڑے خدام کے وجود سے بے نیاز وہ اسی سوچ میں گم چلی جا رہی تھی اور اس کے خیالوں کے بے قابو شہسوار کابل وقندھار سے دکن تک اڑتے پھر رہے تھے۔ اسے اذان یاد رہی نہ نماز جب کنیز نے وضو کے لئے پانی پیش کیا تو وہ شتابی سے وضو کر کے جانماز پر کھڑی ہو گئی لیکن قیام وسجود کے دوران بھی وہ خیالات کے آوارہ گھوڑوں کی لگامیں قابو میں نہ رکھ سکی جیسے وہ نماز نہیں نماز کی رسم ادا کر رہی ہو۔ نماز کے بعد آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس گئی اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ حویلی میں رات کی سیاہی کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ خدام

نے شمعیں روشن کر دی تھیں مگر یہ روشنیاں بھی اس کے دل سے خوف دور نہ کر سکیں تو وہ واپس نشست پر جا کر بیٹھ گئی اور فرشی شمعدان کے شعلے کو دیکھنے لگی۔ کافی دیر تک وہ شعلے کے آر پار دیکھتی رہی اس کے نچلے حصے میں سیاہی کا دھبہ تھا اس سے اوپر آگ کی سرخی اور اس سے اوپر روشنی کی چمک اس چمک سے اوپر کچھ بھی نہیں تھا۔ دھبہ سرخی اور چمک اور اس کے بعد شعلہ ختم ہو گیا؟ کمرے میں کنیز کے پاؤں کی غیر محسوس آواز سے وہ گیان کے ویرانے سے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شمعدان کی نرم و نازک روشنی میں اپنے پاؤں کی پشت پر نظر جما کر چلنے والی کنیز اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی پھر بھی اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”حضور کی اجازت ہو تو دستر خوان جمایا جائے“۔ کنیز نے ادب سے معلوم کیا۔

”اجازت ہے!“ اس نے آہستہ سے جواب دیا کنیز واپس مڑی تو اسے بلایا۔ ”شہباز خاں سے کہو کھانے کے بعد ہم ملک قاسم سے ملنا پسند کریں گے“۔

***

عظیم مغلیہ سلطنت کا مشہور عالم دارالحکومت شب کے سیاہ نقاب میں منہ چھپائے بے چین بے چین سا محسوس ہو رہا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے احاطہ میں محفل سماع جاری تھی۔ قوال حضرت امیر خسرو کا کلام گا رہے تھے۔ درویش اور سامعین سب سر ڈالے سن رہے تھے کسی مصرع پر کوئی درویش بلند آواز میں ”حق“ کا نعرہ لگاتا تو محفل کے مختلف حصوں سے ”حق حق!“ کی مشترکہ آواز بلند ہوتی اور پھر ماحول پر قوالوں کی آواز غالب آ جاتی ایک شعر کی گائیکی کے خاتمہ پر ساز خاموش ہوئے تو قوال کی آواز بلند ہوئی۔ ”درد خسرو ہر زماں افزوں تر است“ قوال کی آواز میں لچک آئی تو طبلہ ”درد خسرو ہر زماں افزوں تر است“ چلانے لگا پھر ساز اور آواز نے مل کر درد کا اس پُر سوز انداز میں اظہار کیا کہ کوئی زبان بھی خاموش نہ رہ سکی۔ طبلے کے زیر و بم کے ساتھ سب والہانہ انداز میں جھوم رہے تھے اور ”درد خسرو ہر زماں افزوں تر است“ پکار پکار کر نڈھال ہوئے جاتے تھے ایسے محسوس ہوتا تھا در و دیوار اور شب سیاہ بھی درد سے تڑپ رہے ہیں۔ جب وہ نیم بے ہوش ہو چکے تو آوازیں سازوں کے حلق میں پھنس گئیں قوال نے پھیپھڑوں کے پورے زور کے ساتھ ”از کہ گیرم عیب چوں درماں توئی“ کی آواز لگائی تو تڑپنے والوں نے کان اس کے معنی پر لگا دیئے سازوں نے مل کر زمانے کے درد کے درماں کے در پر دستک دی تو ماحول پر سکوت کے سائے دراز ہوتے گئے۔ محفل سماع ختم ہوئی تو ایک درویش نے دونوں بازو لہرا لہرا کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ”از کہ گیرم عیب چوں درماں توئی“ کے ورد میں شامل ہو گئے۔

رات اپنے سفر کی تیسری منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ ملک سجاول کچھ دیر کھڑا درویشوں کا کرب و بلاد دیکھتا رہا اور پھر حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی طرف چل دیا۔ ملک قاسم سر جھکا کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے لئے زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ راوی کے کناروں پر جنگل بیلے میں شکار اور میر ستو کے کیمپ سے اس نے جو سفر شروع کیا تھا وہ پانی پت کی لڑائی سے ہوتا ہوا اسے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء تک لے آیا تھا اس سے آگے کون سی منزل آئے گی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ سر جھکا کر ملک سجاول کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا سردار اب اسے کہاں لے جا رہا ہے، یہ سوچنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔

درگاہ سے باہر آئے تو بستی نظام الدین پر صبح کا نور برسنا شروع ہو گیا تھا، زندگی نے اپنے چہرے پر سے سرد لحاف سرکا دیا تھا مگر ابھی تک گلیوں اور بازاروں میں قدم

نہیں رکھا تھا تھوڑا سا گھوم کر وہ مقبرہ ہمایوں کے سامنے پہنچے تو ملک سجاول نے اپنا گھوڑا روک لیا۔

''کبھی فرصت ہو تو اس مقبرہ کی زیارت ضرور کرنا'' اس نے قاسم سے کہا۔ ''اس میں آل تیمور کے شاندار ماضی سے عبرتناک حال تک کے بہت سے سنہری اور سیاہ ورق ملیں گے وہ گنبد عظیم مغل شہنشاہ ہمایوں کا مزار ہے اسی احاطے میں کہیں شہنشاہ عالمگیر ثانی کی قبر بھی ہوگی جس کی برہنہ لاش چھ پہر جمنا کی ریت پر پڑی رہی تھی۔ آل تیمور کے اس زوال کے اسباب تو بہت سے ہیں مگر عالمگیر ثانی کے قتل کا واحد سبب اس کا احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان اور شاہجہان آباد آنے کی دعوت دینا تھا شہنشاہ کا قاتل وہ شخص ہے جسے بیگم صاحبہ ایک بار پھر سے مسلم ملت پر مسلط کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں نواب جانی بیگ خان سے روابط کے احترام میں ہم ہرگز شامل نہیں ہوں گے۔''

قاسم سر جھکائے سنتا رہا تھا۔ ''سردار فیصلہ کرنا آپ کے ذمہ ہے، میرے ذمے صرف آپ کے حکم کی تعمیل ہے، آپ نے بیگم کو شاہجہان آباد پہنچانے کا حکم دیا ہے، میں نے اس کی تعمیل کی بیگم نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میں نے آپ تک پہنچا دی اس میں غلطی ہوئی ہو تو معافی کا طالب ہوں۔''

ملک سجاول نے مسکرانے کی کوشش کی تاکہ قاسم سمجھ جائے کہ اس نے بیگم کا پیغام پہنچا کر غلطی نہیں کی۔ ''میں نے اپنے بیٹے کی وفا شجاعت اور دانش پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ میں نے جو کہا اس لئے کہ آپ بیگم صاحبہ کی خواہشات اور ارادوں سے باخبر رہیں۔ بادشاہ سلامت پانی پت سے کوچ کر چکے ہیں اور پٹیالہ سے سردار لکھنا شاہجہان آباد پہنچ چکے ہیں۔ آلا سنگھ نے سردار لکھنا کی وجہ سے مرہٹوں کو خوراک اور رسد فراہمی بند کی تھی میں اپنی گردن پر ان کے احسان کا بوجھ محسوس کر رہا ہوں، وہ بادشاہ معظم کے حضور آلا سنگھ کی عرضداشت پیش کرنا چاہتے ہیں، بیگم کے حکم کی تعمیل اس کے بعد ہی ہو سکے گی۔ مجھے امید ہے کہ اب تم بیگم صاحبہ کے احکامات کو بہتر طور پر سمجھ سکو گے۔''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بیگم صاحبہ کی حویلی میں مقیم رہنے کی کوئی ضرورت ہے۔'' قاسم نے پوچھا۔

''آج مجھے تمہارے ساتھ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ بیگم صاحبہ خیال کریں کہ ہم نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔'' سجاول نے اسے سمجھایا۔

ان کے ساتھی کچھ فاصلہ پر پیچھے آرہے تھے وہ رک گئے وہ ساتھ آملے تو ملک نے اپنے گھوڑے کا رخ مدرسہ رحیمیہ کی طرف موڑ دیا اور قاسم نے بیگم کی حویلی کی طرف۔

***

شہنشاہ ہند شاہ عالم ثانی کی والدہ ملکہ زینت محل کا جلوس لال قلعہ سے برآمد ہوا تو شاہجہان آباد کے باسی سڑکوں پر نکل آئے اس کے پوتے شہزادہ جواں بخت اور شاہ عالم کے وکیل کی سواریاں زینت محل کے ہاتھی کے دائیں بائیں چل رہی تھیں۔ ملکہ اپنے بیٹے کی شہنشاہیت منوانے کے لئے خود میدان سیاست میں نکلی تو اقتدار کی شطرنج کے کھلاڑی ان کی چالوں کا گہری نظر سے جائزہ لینے لگے۔ جو امراء مستقبل کے دربار شاہی میں کسی مقام، مرتبہ کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ سب ملکہ کے جلوس میں شامل تھے۔ آج ایک طویل مدت کے بعد لال قلعہ سے ایک پروقار جلوس برآمد ہوا تھا جسے دیکھ کر شاہجہان آباد کے خوفزدہ باسیوں کے چہروں پر رونق آگئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اپنی فوج کے ساتھ شہر سے باہر خیمہ زن تھے اور سابق ملکہ ان کے احسانات کے لئے اظہار تشکر اور انتظام سلطنت کے بارے میں ان سے مشاورت کے لئے جا رہی تھیں۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے مغلیہ سلطنت کا تخت و تاج شاہ عالم ثانی کے سپرد کر کے واپس جانے کے اعلان کے بعد اگرچہ علماء کرام کو مایوسی ہوئی تھی مگر وہ نجیب الدولہ کی ذات میں ایک بہتر منتظم اور مخلص کمانڈار کو دیکھ رہے تھے اور ان کی حمایت کر کے ان کی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم تو شجاع الدولہ کو مقرر کر رکھا تھا مگر شاہجہان آباد کے نظم میں ملکہ اور نواب نجیب الدولہ سب سے نمایاں تھے۔ افغان لشکر گاہ سے باہر وزیر اعظم شاہ ولی خاں افغان دربار کے امراء اور سرداروں نے اور شاہی خیمہ گاہ سے باہر خود احمد شاہ ابدالی نے ملکہ کا استقبال کیا اور شاہ قندھار نے ملکہ عالیہ کو تعاون اور تحفظ کا یقین دلایا اور ان کی درخواست پر نواب نجیب الدولہ کو شاہجہان آباد کی افواج کا سالار مقرر کر کے نظم سلطنت میں توازن اور استحکام کے اسباب جمع کر دیئے۔

سورج مل جاٹ سے کیا سلوک کیا جانا چاہئے۔ نجیب الدولہ اور ملکہ کی رائے اور مشورے الگ الگ تھے۔ شمشیر بہادر زخمی ہو کر میدان جنگ سے فرار ہوا تو سورج مل نے اس کی تیمارداری کی تھی وہ زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا تو اس نے اسے مسلمان مانتے ہوئے اسلامی طریقہ سے اس کی تجہیز و تکفین کرائی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اس کے اس اقدام سے بہت متاثر تھے۔ سورج مل نے بھاؤ کے توہین آمیز رویہ کی وجہ سے پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کا ساتھ بھی نہیں دیا تھا اور اپنی فوجوں کے ساتھ واپس چلا گیا تھا اس لئے احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ اس کی بہتر تعلقات کی درخواست قبول کرنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے سورج مل کے وکیل کو ابدالی کے حضور پیش کر کے شاہ کو مشورہ دیا تھا کہ جاٹ کے خراج کے وعدہ پر یقین کر لینا چاہئے لیکن ملکہ اسے اپنے خاوند کے قاتل عماد الملک کو پناہ دینے کے جرم کی سزا دینا چاہتی تھیں اور سورج مل جاٹ کی طاقت اور ریاست کو کچل دینا چاہتی تھیں ان کا موقف تھا کہ اس سے مغلیہ سلطنت محفوظ اور مستحکم ہو جائے گی۔

احمد شاہ ابدالی سابق ملکہ کا بہت احترام کرتے تھے انہوں نے سورج مل کی درخواست اور نجیب الدولہ کا مشورہ مسترد کر دیئے اور بادل نخواستہ سورج مل کے خلاف فوجی مہم بھیجنے کا اعلان کر دیا اور حکم دیا کہ خود ملکہ زینت محل ان کا پوتا شاہزادہ جواں بخت اور داماد مرزا بابر اس مہم پر فوج کے ساتھ رہیں گے۔ بادشاہ نے نواب نجیب الدولہ کو اس مہم میں شامل نہیں کیا تاکہ جاٹ اسے بھی اپنا مخالف فریق نہ سمجھیں ملکہ بادشاہ معظم کے اس فیصلہ اور فراست کو نہ سمجھ سکیں مگر اس فیصلہ سے عدم اطمینان کے باوجود وہ ان سے اختلاف نہیں کر سکتی تھیں۔

وزیر اعظم شجاع الدولہ نے اس تنازعہ میں بھی کسی کا ساتھ نہیں دیا وہ نہ ملکہ عالیہ کو ناراض کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی شاہجہان آباد کے سالار نجیب الدولہ سے تعلقات بگاڑنا چاہتے تھے ان کی یہ خاموشی سورج مل سے دوستی کی وجہ سے بھی تھی۔ شاہ ولی خان اور افغان سرداروں کے لئے شاہجہان آباد کے تخت و تاج کے تین مرکزی کرداروں کے تین الگ الگ رویے حیران کن تھے۔ اس کے باوجود بادشاہ معظم کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے نیم دلی کے ساتھ فوجی مہم کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اب تک وہ اسی امید میں تھے کہ پانی پت میں اتنی بڑی فتح کے بعد ہندوستانی امراء اپنے معاملات سنبھال لیں گے اور وہ واپس اپنے گھروں کو جا سکیں گے۔ تندخو جاٹوں اور ان کے سنگین قلعوں پر نئے حملہ کا فیصلہ ان کی توقعات اور خواہشات کے خلاف تھا۔

ملکہ اپنے پوتے، امراء اور شہنشاہ کے وکیل کے ہمراہ واپس لال قلعہ پہنچیں تو ان میں پہلے سے بھی زیادہ اعتماد آ گیا تھا۔ نجیب الدولہ کی طرف سے مخالفت کے

باوجود ابدالی نے ان کی خواہش پر ایک کٹھن فوجی مہم کا فیصلہ کر کے ان کی ہمت اور اہمیت بڑھا دی تھی۔

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں راجوں مہاراجوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کے نام مراسلے بھی ارسال کر دیئے کہ وہ شاہ عالم ثانی کو ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کر کے ان کی فرمانبرداری کا اعلان کریں۔ پانی پت کی جنگ کے عظیم فاتح کی طرف سے اس حمایت اور فرمان کی وجہ سے لال قلعہ کی سطوت بحال ہوتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

***

مغلانی بیگم کو ہر شب امید کی ایک نئی کرن دکھائی دیتی اور ہر روز سورج کی روشنی پھیلتے ہی وہ کرن نابود ہو جاتی تھی۔ شاہجہان آباد کا سارا سیاسی اور سماجی نقشہ درہم برہم ہو چکا تھا پرانے امراء اور درباریوں میں سے اکثر شہر چھوڑ گئے تھے اور مرہٹوں کے قبضہ اور احمد شاہ ابدالی کی جوابی کارروائی کے خدشہ کے پیش نظر دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے تھے جو چند امراء شہر میں موجود تھے وہ نئے نقشہ میں اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش میں لگے تھے اور عمادالملک یا ان کی خوش دامن سے روابط قائم رکھ کر ملکہ زینت محل کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مغلانی بیگم اپنی حویلی میں عملاً قیدی تھی ان کی ملکہ زینت محل کے حضور حاضری کی خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی ابدالی نے سورج مل کے خلاف فوجی مہم بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تو مغلانی بیگم کو ہر طرف تاریکی دکھائی دینے لگی تھی لیکن جب ایک روز شہباز خان نے اپنے ذرائع کے حوالہ سے اسے خبر دی کہ مرہٹہ پیشوا بالاجی راؤ اپنے بیٹے اور بھائی کی موت اور شکست کا بدلہ چکانے کے لئے پانچ لاکھ کے لشکر جرار کے ساتھ پونا سے روانہ ہو چکے ہیں تو بیگم نے سفارت کاری تیز کر دی۔

''ہم سمجھتے ہیں بادشاہ معظم اور مرہٹوں کے درمیان ایک اور لڑائی ہندوستان کی مسلم سلطنت اور ملت کے لئے مفید نہیں ہو گی''۔ بیگم نے ملک سجاول کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ملک سجاول نے جواب دیا۔ ''بادشاہ معظم ان شاء اللہ اس جہاد میں بھی کامیاب ہوں گے اور ملت کے وجود کے لئے خطرہ کا خوف نہیں رہے گا''۔

یہ جواب بیگم کی توقع کے خلاف تھا۔ ''بادشاہ معظم واپس قندھار جانے کا عزم ظاہر کر چکے ہیں، مرہٹوں کے خطرہ کے بارے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا اتفاق اور مشورہ لازم ہے''۔ وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوئی۔

''پانی پت کی لڑائی کا فیصلہ بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے کیا تھا، اب بھی وہی فیصلہ کریں گے''۔ ملک سجاول بیگم کا مدعا جانتا تھا۔

''ہم سنتے ہیں پیشوا نے پونا سے روانگی سے پہلے حلف لیا ہے کہ وہ نجیب الدولہ کی ریاست میں زندگی اور ہریاول کا ہر نشان مٹا دیں گے وہ اپنے چچازاد بھائی اور بیٹے کی موت کا ذمہ دار نواب نجیب الدولہ کو قرار دیتے ہیں''۔

''حضور نے جو سنا درست سنا''۔ ملک نے بیگم کی بات کی تصدیق کر دی۔

''اتنے بڑے خطرہ کی موجودگی میں سورج مل سے لڑائی کو ٹال دیا جاتا تو مناسب نہ ہوتا''۔

''نواب نجیب الدولہ اس لڑائی کو ٹالنا چاہتے تھے مگر بادشاہ معظم کو ملکہ زینت محل کی ضد پر یہ فیصلہ کرنا پڑا''۔

''ہم لال قلعہ میں اس وقت ذاتی دشمنی اور دوستی کی بجائے کسی ملکی مفاد کو دیکھنے والی ہستی کی موجودگی بہت اہم جانتے ہیں''۔

''حضور کا فرمانا بجا ہے لیکن لال قلعہ میں ملی مفاد دیکھنے والے کم ہی رہے ہیں۔ مغلیہ سلطنت اور لال قلعہ کی بربادی ذاتی مفاد دیکھنے والوں کی وجہ سے ہی ہوئی''۔

ملک سجاول نے جواب دیا۔

بیگم ملک سجاول کے اشاروں کو سمجھ گئی تھی لیکن جس مقصد کے لئے انہوں نے اسے طلب فرمایا تھا اس کا بیان ابھی باقی تھا۔ "بادشاہ معظم واپس جانے کے فیصلہ کا اعلان فرما چکے ہیں۔ ہندوستان کی مسلم ملت کے وجود کے لئے نواب نجیب الدولہ جیسے مخلص اور بہادر رہنماؤں کا وجود لازم ہے۔ لال قلعہ کے احکام اور فرمان کے احترام کے لئے مرہٹوں اور جاٹوں سے مفاہمت ضروری ہے اور یہ دونوں مقصد تب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب کوئی ایسا فریق درمیان میں ہو جس پر جاٹ اور مرہٹے دونوں اعتماد کر سکیں"۔

ملک قاسم نے نگاہ اٹھا کر ملک سجاول کی طرف دیکھا، بیگم نے اپنی بات صاف صاف کہہ دی تھی۔

"حضور کا فرمانا بجا ہے لیکن اس فریق کو درمیان میں لانے پر نواب نجیب الدولہ اور ہندوستان کی مسلم ملت کا اعتماد ہونا لازم ہے اور پورے ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسا فریق موجود نہیں"۔ ملک سجاول نے عماد الملک کا نام لئے بغیر اسے اس کام کے لئے غیر موزوں قرار دے دیا۔

"ماضی آپ کی بات کی تائید کرتا ہے مگر ہم تو حال کے دربار عالیہ میں بیٹھے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں۔ مستقبل کے کندھوں پر ماضی کا لاشہ بھی رکھ دیا تو وہ طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مجرم کو سزا دینے کی بجائے اس کو معاف کر کے اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے سے اگر مستقبل کا بوجھ ہلکا ہو سکے تو مجرم کی نسبت مستقبل زیادہ فائدہ میں رہے گا"۔ بیگم نے دلیل دی۔

"حال کے دربار عالیہ میں یہ خاکسار بہت دور دست بستہ کھڑا ہے کسی بھی مجرم کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ ملت کے ان رہنماؤں کو کرنا ہے جن کے ہاتھ میں ان کے جرائم اور صلاحیتوں کا ترازو ہے"۔ ملک سجاول اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے تھے۔

"ہماری خواہش ہے کہ آپ نواب نجیب الدولہ تک ہماری یہ خواہش پہنچا دیں"۔

"بندہ حضور کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کرے گا"۔

ملک سجاول کے جواب پر بیگم کے چہرے پر اطمینان پھیلنے لگا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ ملک سجاول نواب نجیب الدولہ کو اور نواب نجیب الدولہ احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں اور جاٹوں سے مفاہمت کے لئے عماد الملک کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ کر لے گا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے کر مایوسیوں کے بحر بیکراں میں زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پس پردہ سے شہباز اور کنیز کی سرگوشی سن کر ملک قاسم نے ملک سجاول کی طرف دیکھا تو وہ اس کی نگاہوں کا پیغام سمجھ گیا۔ اس نے بیگم صاحب سے اجازت چاہی اور آداب بجا لا کر دونوں دیوان سے باہر نکل گئے۔

کنیز نے شہباز خاں کی حاضری کی درخواست پیش کی تو بیگم بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ مہمانوں کی موجودگی میں وہ بلا سبب دروازے پر حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔

"حضور مرہٹہ پیشوا بالا جی راؤ اپنی فوج کے ساتھ راستہ ہی سے واپس پونا لوٹ گیا ہے"۔ شہباز خاں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی خبر سنائی۔

بیگم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "کیا ہم سچ مان لیں کہ بالا جی راؤ اپنے بیٹے اور بھائی کے قتل اور قوم کی شکست کا بدلہ لینے کا عہد پورا کئے بغیر راستہ سے ہی واپس لوٹ گیا"۔

"حضور کا یہ غلام بلا تصدیق اطلاع دینے کے جرم کی سنگینی سے واقف ہے"۔ شہباز خاں نے محسوس کیا کہ بیگم بالا جی راؤ کی واپسی پر یقین نہیں کرنا چاہتی اس نے

اپنی اطلاع کی صداقت بڑھانے کے لئے بتایا کہ بالاجی راؤ کے پونا سے روانہ ہو جانے کی خبر ملتے ہی حیدرآباد کے نواب نظام علی خاں نے پونا کو لوٹ کر آگ لگا دی، پیشوا کے محلات مسمار کر دیئے تو پیشوا کے لئے واپسی کے سوا چارہ نہ تھا۔

امید کی نئی کرن بھی نابود ہوگئی بیگم کو نظام علی خاں پر اس کے بھائی عمادالملک سے بھی زیادہ غصہ آنے لگا۔

❊❊❊

حویلی کی وسعت اور ایوانوں کی رفعت سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی وقت اس میں بھی بہاروں کا قیام ہوتا ہوگا۔ فی الوقت پائیں باغ کے اشجار کی مانند ایوانوں کے در و دیوار بھی خزاں زدہ ہو رہے تھے۔ وہ مردانہ کی طرف جاتے ہوئے حویلی کی حالت سے اس کے مکینوں کے حال کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''زمانے کے زخم دلوں پر زیادہ گہرے ہوتے ہیں یا شہروں اور آبادیوں پر میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا''۔ سردار لکمنا نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ملک سجاول نے نظر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جو زخم نظر آئے وہ زیادہ گہرا دکھائی دیتا ہے، جو دلوں کے زخم دیکھ سکتے ہیں ان کا خیال ہے کہ دل کا زخم سب سے مہلک ہوتا ہے۔ جن کی نگاہیں اینٹ پتھر میں الجھ کر رہ جائیں وہ بستیوں اور شہروں کے گھاؤ کو شدید سمجھتے ہیں''۔

''میں جب سے آیا ہوں شاہجہان آباد کے گرد نابود بستیوں کے کھنڈرات دیکھتا رہا ہوں۔ صدیوں پرانے وہ زخم آج بھی تازہ دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے باسیوں نے ایک زخم کے بعد دوسری بستی بسالی۔ زمانے نے ان کے دلوں پر جو زخم لگائے تھے وہ وقت کے ساتھ بھر گئے مگر وہ بستیاں پھر کبھی آباد نہ ہو سکیں، پانی پت کی لڑائی میں شکست اور اپنے بیٹے اور بھائیوں کی موت پر پیشوا بالاجی راؤ کے دل کے زخموں کا اندازہ کریں پھر بھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا مگر اپنے محلات کے کھنڈرات اور پونا کی راکھ دیکھ کر سنتے ہیں اس کے آنسوؤں کا سیلاب روکے نہیں رکتا تھا''۔ سردار لکمنا نے اپنی مشکل کی وضاحت کی۔ ''اور یہی زخم اسے موت کی وادی میں لے گئے''۔

''دل کے زخم پر آنکھ نہیں دل روتے ہیں اور دلوں کے زخموں کی مانند دلوں کے آنسو بھی ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔ ''پیشوا بالاجی راؤ کے خواب جتنے بڑے تھے ان کے ٹوٹنے کے زخم بھی اتنے ہی گہرے ہوں گے''۔

ملک قاسم کو آتا دیکھ کر سردار لکمنا آگے بڑھ کر اس سے بغلگیر ہو گیا اور زخموں کی بات درمیان میں رہ گئی۔

''ہماری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ قاسم ہماری آنکھوں سے بھی اتنا ہی قریب رہے جتنا ہمارے دل سے قریب ہے''۔ سردار لکمنا نے ملک سجاول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر بادشاہوں کے مقدر ہم خاک نشینوں کے مقدر پر اور ان کی خواہشات ہماری امیدوں پر ہمیشہ سے غالب رہے ہیں''۔

ملک قاسم اپنے سردار کو سلام کہہ کر سر جھکائے ان کے ساتھ چلنے لگا اور سردار لکمنا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''مغلانی بیگم نے بادشاہ معظم سے وعدہ لیا تھا کہ گنا بیگم کبھی ہندوستان نہیں آئے گی، اس عہد کی پابندی ہماری مجبوری ہے۔ قاسم کی جدائی ہمارے مقدر میں تھی اور مقدر کے زخم برداشت کرنا پڑتے ہیں''۔ ملک سجاول کی آواز درد سے لبریز تھی۔

سردار لکمنا نے قاسم کی طرف دیکھا جیسے اس کے دل کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتا ہو مگر وہ آنکھیں جھکائے چل رہا تھا۔ سردار لکمنا اس کی آنکھوں کے راستے اس کے

دل میں نہ اتر سکا۔

مردانہ کے سامنے ملک سجاول کے اپنے قبیلہ کے نوجوان استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ سردار لکھنا ایک ایک سے ہاتھ ملا کر ان کے احوال پوچھنے لگا۔ نوجوان بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سکھ مسلمانوں کے وجود کے دشمن ہیں اور ان کے خلاف جہاد ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے مگر ان کا یہ ہم قبیلہ سکھوں کا جرنیل ہے اور سکھوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہے اور مسلمانوں کے جہاد کے علمبردار احمد شاہ ابدالی سے ایک سکھ کے لئے حاکمیت کے پروانہ کا وعدہ لے کر واپس پنجاب لے جا رہا ہے وہ انہیں اپنے بھائی اور دست و بازو بھی کہتا ہے اور ان کے جانی دشمنوں کا دست و بازو بھی بنا ہوا ہے۔ اس الجھن اور تضاد کے باوجود انہیں اس سے مل کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ سردار لکھنا نوجوانوں کی آنکھوں میں جھانکتے سوالات پڑھ رہا تھا مگر آنکھوں کے سوالات کے جواب میں زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ ملک قاسم اجازت لے کر زنانہ کی طرف چلا گیا۔ اس کی رفتار سے اس کی مصروفیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ملک سجاول اور سردار لکھنا بڑی دلچسپی سے اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔

''قاسم تو شاہجہان آباد کی اس حویلی اور ملک پور کی حویلی میں کوئی فرق محسوس ہی نہیں کر رہا''۔ سردار لکھنا نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ملک سجاول بھی مسکرا دیا۔

''ان در و دیوار نے علی قلی خاں کا عروج بھی دیکھا اور آج ''

''شاہجہان آباد میں ایسی سینکڑے حویلیاں ہیں''۔ ملک سجاول نے سردار لکھنا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جن کا آج ان کی کل کا مزار ہے اسکی سب سے بڑی حویلی تو لال قلعہ ہے پھر بھی انسان وقت کی ان کروٹوں سے کبھی عبرت حاصل نہیں کرتا''۔

سردار لکھنا نے محسوس کیا کہ ملک سجاول اس حویلی اور علی قلی خاں کے عروج و ادبار کی بات چھیڑنا نہیں چاہتے۔ ''آپ کی اجازت ہو تو بندہ قاسم اور ان کی خوش دامن کی چند روز تک مہمان نوازی کا شرف حاصل کر سکے گا''۔

''میں چاہتا ہوں بادشاہ معظم کی لاہور واپسی تک قاسم اپنے گھر اور گاؤں میں رہ لے۔ بیگم صاحبہ بھی اپنی بیٹی کا گھر اور گاؤں دیکھ لیں۔ پھر بادشاہ کے لشکر کے ہمراہ وہ قندھار روانہ ہو جائیں گے۔ اپنی بیٹی سے جدائی کے بعد سے وہ پہلی بار اس کے پاس جا رہی ہیں۔ سفر طویل بھی ہے اور کٹھن بھی گاؤں کی کھلی فضاء میں ان کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو سکے گا۔ اس لئے آپ انہیں جلد روانہ کر دیں''۔ ملک سجاول نے اسے سمجھانے کو بتایا۔

''ان شاء اللہ راستہ میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ملک پور تک ہمارے سوار ان کے ہمراہ جائیں گے۔ بادشاہ معظم کے استقبال کی تیاری کی مصروفیت ہے ورنہ میں خود اپنے مہمانوں کے ساتھ جاتا''۔ سردار لکھنا نے کہا۔ ''مغلانی بیگم جلد از جلد جموں پہنچنا چاہتی ہیں میں نے راستہ کے جتھے داروں کے نام چٹھیاں بھجوا دیں ہیں، قاسم کے روانہ ہوتے ہی انہیں جموں بھجوانے کا انتظام ہو جائے گا''۔

''مغلانی بیگم بادشاہ معظم کے لشکر کے ساتھ سیالکوٹ تک جانے کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن اب انہوں نے اچانک روانگی کا پروگرام بنا لیا تو میں نے سوچا آپ کو زحمت دی جائے۔ ہمارے جوان کئی ماہ سے گھروں سے دور ہیں، نواب نجیب الدولہ کا حکم نہ ہوتا تو میں خود بھی واپس چلا جاتا۔ اب مجبوری ہے جاٹوں کے خلاف مہم مکمل ہونے تک مجھے یہیں رہنا ہوگا''۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ سورج مل کے خلاف مہم وقت

کی ضرورت ہے؟" سردار لکھنا نے وہی سوال پوچھ لیا جو مغلانی بیگم اپنے انداز میں پوچھ چکی تھیں۔

"بادشاہ معظم اس مہم کے حق میں نہیں تھے مگر وہ اپنے بیٹے کی خوش دامن ملکہ زینت محل کی خواہش مسترد نہ کر سکے"۔ ملک سجاول نے سردار لکھنا سے اتفاق کیا۔

"سورج مل کے خلاف مہم سے پہلے ہی بادشاہ معظم کی شاہجہان آباد میں موجودگی کے باوجود بیگم صاحبہ کا جموں روانہ ہو جانا ان کی روایات اور دور اندیشی کے منافی نہیں؟" سردار لکھنا نے موضوع بدل دیا۔

"بیگم صاحبہ کے لئے شاہجہان آباد میں مزید قیام میں کوئی کشش نہیں، پرانی قوتیں اور تعلقات ختم ہو گئے ہیں۔ وقت نے جن نئی قوتوں کو جنم دیا ہے وہ عماد الملک کے حال اور ماضی سے باخبر ہیں۔ احمد شاہ ابدالی بیگم صاحبہ کے لئے ہمدردی رکھتے ہیں مگر ان کی توقعات پوری کرنے کے حق میں نہیں۔ ان حالات کو جان کر بیگم صاحبہ مزید قیام کے حق میں نہیں اور جموں جا رہی ہیں تاکہ بادشاہ معظم کی ہندوستان میں موجودگی میں جاگیر پر تصرف مستحکم کر لیں۔ بادشاہ معظم کے قندھار چلے جانے پر جہاں خان کا گورنر بیگم کے لئے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ اسے بیگم صاحبہ کی بدقسمتی ہی کہا جانا چاہئے کہ وہ جہاں بھی قیام رکھتی ہیں وہاں کے حاکم ان سے خوفزدہ رہتے ہیں اور بیگم صاحبہ کا ماضی ہر جگہ ان کے تعاقب میں رہتا ہے"۔ ملک سجاول نے مغلانی بیگم کی روانگی کے اسباب کا تجزیہ کیا۔

"پنجاب کے افق پر جو طوفان اٹھ رہے ہیں ان کے تیور بڑے خوفناک ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ بتانا چاہوں گا کہ احمد شاہ ابدالی قندھار میں بیٹھ کر زیادہ دیر تک ان طوفانوں کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ بہت کچھ ان طوفانوں کے ساتھ نابود ہونے والا ہے۔ میر منو اور سکھوں کے درمیان دشمنی کی نوعیت دیکھتے ہوئے کیا بیگم صاحبہ کی جاگیر اور ذات محفوظ رہے گی؟ ان کے لئے شاہجہان آباد میں قیام زیادہ مناسب نہیں؟" سردار لکھنا نے کہا۔

"آپ سے اختلاف کرنا خود کو دھوکہ دینا ہوگا۔ بیگم صاحبہ کو بھی ان طوفانوں کا احساس ہے مگر شاہجہان آباد میں کسمپرسی کی زندگی گزارنا ان کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ یہاں کے اینٹ پتھر بھی ان کے آباء اور احوال سے واقف ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے زندگی کے بقیہ دن جموں میں گزارنے کا فیصلہ کیا ہے"۔

"کیا واقعی بیگم صاحبہ نے زندگی کے بقیہ دن صرف گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" سردار لکھنا نے اس انداز میں ملک سجاول کی طرف دیکھا جیسے انہیں ان کی بات پر یقین نہ آیا ہو کہ بیگم کی حکمرانی کی خواہش ہمیشہ کے لئے دم توڑ چکی ہے۔

"میں نے بھی محسوس کیا ہے، ہندوستان کے اندر اور باہر اس وقت کوئی طاقت ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں، کل کو حالات بدل جائیں تو الگ بات ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ان کی مجبوری ہے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"ان کی ہوس اور ہوشیاری نے پنجاب کو بھی برباد کیا اور انہیں بھی برباد کر دیا؟" سردار لکھنا کے لہجے میں افسوس تھا۔

"شاید اکیلی مغلانی بیگم کو پنجاب کی بربادی کا الزام دینا آدینہ بیگ کے ساتھ زیادتی ہو۔ پنجاب کی بربادی کا زیادہ ذمہ دار آدینہ بیگ ہے یا مغلانی بیگم یہ بحث ہو سکتی ہے مگر دونوں میں سے کسی ایک کو اس اعزاز سے محروم رکھنا اس کی حق تلفی ہوگی"۔ ملک سجاول کے جواب میں طنز تھا۔

زنان خانہ سے پالکی برآمد ہونے کی اطلاع ملی تو ملک سجاول اور سردار لکھنا گفتگو ادھوری چھوڑ کر کھڑے ہو

گئے ان کے ساتھی بھی اپنے اپنے ہتھیار اٹھا کر ان کے پیچھے ڈیوڑھی کی طرف چل پڑے۔ ملک قاسم پالکی کے پیچھے چل رہے تھے۔ پالکی اٹھانے اور ساتھ چلنے والے خدام کے چہرے پائیں باغ کے خزاں رسیدہ اشجار کی مانند بے رونق تھے۔

***

جامع مسجد کے خطیب نے شاہ عالم ثانی کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کیا تو نمازیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا دیئے۔ احمد شاہ ابدالی کے وزیراعظم شاہ ولی خان سورج مل کے خلاف فوجی مہم کا ارادہ ترک کر کے واپس شاہجہان آباد آ چکے تھے۔ افغان سرداروں اور فوجیوں کو ہندوستان آئے گیارہ ماہ ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے متھرا کی طرف بڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور بادشاہ کو مجبوراً مہم ختم کر دینے کا حکم دینا پڑا تھا۔ ملکہ زینت محل کی خواہش پر انہوں نے نواب نجیب الدولہ کو نائب السلطنت مقرر کر دیا تھا اور قندھار واپسی کے لئے تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم ثانی ابھی تک بہار میں حراست کی حالت میں تھے اور جامع مسجد کے امام ان کے نام کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ ملک سجاول نے شاہجہان آباد کے باسیوں کو سر جھکاتے دیکھا تو وہ خود بھی سر تان کر تنہ بیٹھ سکے۔

نماز کے بعد وہ مسجد سے باہر آئے تو سرمد کے مزار کے پاس ایک درویش قہقہے لگا رہا تھا۔ ''شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم'' وہ بلند آواز میں کہتا اور پھر خود ہی اس سے بھی بلند آواز میں ''زندہ باد'' کا نعرہ لگاتا اور پھر قہقہے لگانا شروع کر دیتا۔ مسجد سے برآمد ہونے والے نمازی درویش کے گرد جمع ہونے لگے۔ ملک سجاول بھی کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ درویش اپنے گرد جمع ہونے والوں کی موجودگی سے بے نیاز نعرے اور قہقہے لگاتا رہا۔ نمازی آتے رکتے اور درویش کو دیکھ کر آگے نکل جاتے لیکن ملک

وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ درویش نے بلند آواز میں ''شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم'' کا نعرہ لگایا تو اس کے گرد کھڑے نمازیوں میں سے کسی نے کہا۔ ''شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم ثانی کہو''۔ درویش نے اور بھی بلند آواز میں قہقہہ لگایا اور خاص انداز میں ''ثانی'' کہہ کر قہقہے لگانے لگا پھر اچانک قہقہے روک کر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''کوئی کسی کا ثانی نہیں''۔ پھر جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو۔ ''کہاں ہے ثانی؟ کہاں ہے شاہ عالم؟ کون ہے شہنشاہ ہندوستان؟ وہ جو قید میں ہے اور امام صاحب کے خطبہ میں ہے؟ لال قلعہ تو خالی ہے، کل بھی خالی تھا، آج بھی خالی ہے۔ شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم زندہ باد''۔ وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔

ملک سجاول نے نگاہیں اٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کی طرف ایسے دیکھا جیسے ان کی بلندی ناپ رہا ہو اور درویش کو قہقہے لگاتا چھوڑ کر چل دیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ درویش نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہے۔ جو سوالات نمازیوں کی نگاہوں میں تھے وہ درویش کی زبان پر آ گئے ہیں۔ خطیب جامع منبر پر بیٹھ کر احمد شاہ ابدالی کے حکم کا مذاق اڑا رہا تھا اور درویش جامع کی سیڑھیوں پر خطیب کے خطبہ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ شہنشاہ نہ لال قلعہ میں تھا اور نہ ہی ہندوستان کا کوئی شہنشاہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے فرمان اور آئمہ کرام کے خطبوں سے باہر کہیں کسی شہنشاہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔

بادشاہ معظم سے جامع مسجد کے امام تک ہندوستان کی مسلم ملت کے ساتھ یہ مذاق کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا مگر اس کے پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''ملک صاحب ہندوستان کا تخت و تاج مرہٹوں سے چھڑا کر شاہ عالم کے نام کر کے بادشاہ معظم کے خود قندھار واپس جانے کا یہ فیصلہ ان کا ایثار نہیں، ہندوستان

کی مسلم ملت پر ظلم ہے"۔ مغلانی بیگم نے ناراضی کے ایک لہجہ میں کہا تھا۔ "ان کے اس فیصلے سے ملت کے آج کے محسن کل کے مجرم بھی بن سکتے ہیں۔ مجھے عماد الملک اور اپنے گناہوں کا احساس ہے لیکن بہت سے لوگوں کو شاید ملت کے ساتھ زیادتیوں کے احساس کا وقت بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ میرے محسن ایسے لوگوں میں شامل ہونے سے بچ جائیں"۔

اگلی صبح جب وہ بادشاہ احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ہمراہ لاہور کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو شاہجہان آباد کے میناروں کو دیکھ کر درویش کے قہقہے اور سوالات اور مغلانی بیگم کی مرحلہ ناراضی کی باتیں اسے بار بار یاد آ رہی تھیں۔

گمنامی کا سفر

پنجاب کے میدانوں میں موسم کا مزاج گرم ہونے لگا تو احمد شاہ ابدالی نے لاہور سے قندھار واپسی کے لئے سیالکوٹ کا راستہ اپنایا۔ پنجاب میں سکھوں کی قوت بڑھتی دیکھ کر جموں کے راجہ نے شاہی احکامات پر عمل سے لاپروائی شروع کر دی تھی۔ سیالکوٹ کے زمیندار سکھوں سے مل کر سر اٹھانے لگے تھے۔ شاہ کے سیالکوٹ پہنچتے ہی چہار محل کے جاگیردار اور زمیندار نذرانے لے کر حاضر ہونے لگے۔ جموں کا راجہ اپنے امراء اور وزراء کے ہمراہ دربار شاہی میں حاضر ہوا اور نذرانہ پیش کر کے اطاعت شاہی کا عہد دہرایا۔ چہار محل کے افغان گورنر کی طرف سے اظہار تشکر کے بعد بادشاہ معظم نے اگلی صبح کوچ کی تیاریوں کا حکم جاری فرما دیا۔

شام کی سیاہی پھیل رہی تھی، شاہی لشکرگاہ میں قندیلیں اور خیموں میں شمعیں روشن ہو چکی تھیں، ملک قاسم اسباب سفر تیار کروا رہے تھے کہ ایک خادم نے مغلانی بیگم کی آمد کی اطلاع دی تو وہ تیزی سے ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ بیگم صاحبہ ایک سفید گھوڑے پر سوار تھیں، نصف درجن سوار اور دو درجن پیادے ان کی سواری کے پیچھے اور دونوں طرف چل رہے تھے۔ ملک قاسم نے آداب عرض کیا اور آگے بڑھ کر بیگم کے گھوڑے کی لگام تھام کر آگے آگے چلنے لگا۔ قاسم نے افغان فوجی سرداروں کا سا لباس اور کلغی والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر آواز اور انداز گواہی نہ دیتے تو ہم تو آج تم کو پہچاننے میں دھوکا کھا جاتے"۔

قاسم نے چلتے چلتے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

گنا بیگم کی ماں نے خیمے کے دروازے پر بیگم کا استقبال کیا اور جب تک بیگم نشست پر بیٹھ نہیں گئیں وہ پاس کھڑی رہیں۔ قاسم مصروفیت کا بتا کر باہر جانے لگا تو بیگم نے پیچھے سے دیکھ کر کہا۔ "قندھار کے اس سردار کو دیکھ کر کون مانے گا، یہی ملک پور کا قاسم ہے۔ اگر ہم آواز اور انداز آشنا نہ ہوتے تو خود بھی نہ مانتے۔ اس کے برا ماننے کا خدشہ نہ ہوتا تو ہم آج سے اسے قاسم بیگ کہتے"۔

قاسم مسکرا کر باہر نکل گیا۔

"آپ جو نام پسند فرمائیں ہمارا فرزند کبھی برا نہیں مانے گا"۔ اس کی خوشدامن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہماری خوش بختی ہے کہ حضور نے زحمت گوارا فرمائی، ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ حضور سے یہاں ملاقات ہوگی"۔

"شہنشاہ معظم کے تشریف لانے کی اطلاع پر ہم نے سفر کا ارادہ کیا۔ بعض معاملات بھی تھے اور آج آپ سے اور قاسم سے ملاقات کی خواہش بھی حالات جس رخ جا رہے ہیں کیا معلوم کل کو کیا ہو جائے"۔

میزبان خاتون نے بیگم کے جواب پر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہم شکرگزار ہیں کہ حضور نے اس لائق جانا"۔

کنیز دسترخوان بچھا خشک میوے چن کر چھوٹی

چھوٹی پیالیوں میں خوشبودار قہوہ ڈال کر پیش کرنے کو جھکی تو بیگم نے فنجان اٹھا کر قہوہ کا جائزہ لیا اور لبوں سے لگانے کی بجائے سامنے رکھ دیا۔ میزبان خاتون نے بھی فنجان دسترخوان پر رکھ دی۔ ''کشمیر کے دامن میں قندھار کا قہوہ حضور کے لائق تو نہ تھا مگر مسافت کی مجبوری ہے''۔

بیگم نے فنجان اٹھا کر لبوں سے لگا لی۔ ''اس میں قندھار کی خوشبو کے علاوہ آپ کی محبت کی مہک بھی تھی، ہم نے سوچا خیمے کی فضا بھی اس میں شریک ہو جائے''۔

میزبان نے شکریہ کے لئے سر خاص انداز میں جھکایا۔

کنیز خیمے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی اور دونوں خواتین کی مشکل کا اندازہ کر رہی تھی جس کی بناء پر وہ چاہتے ہوئے بھی گفتگو کو وسعت نہیں دے پا رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا ان کے لفظوں کا خزانہ بھی لٹ گیا ہے۔

''ہم سنتے ہیں ملک سجاول بھی اپنے خیمے میں موجود ہیں، جانے سے پہلے ہم ان سے ملنا چاہیں گے''۔ بیگم نے ماحول کو بوجھل دیکھ کر اجازت کا بہانہ بنایا۔

میزبان خاتون نے کنیز کو اشارہ کیا، تھوڑی دیر بعد قاسم نے خیمے میں جھانک کر دیکھا تو دونوں خواتین کے جبری ملاپ کی بے کلی محسوس کر کے اندر آ گیا۔ ''سردار حضور کے استقبال کے لئے خیمے سے باہر موجود ہیں''۔

بیگم کھڑی ہوئی تو میزبان بھی اسے الوداع کہنے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ کنیز ایک پیکٹ کے ساتھ داخل ہوئی۔ مغلانی بیگم نے اس سے پیکٹ لیا اور میزبان خاتون کی طرف بڑھی۔ ''موسم سرما تو گزر چکا ہے لیکن یہ ہماری بچی کو پہنچا دیں، آئندہ سردیوں میں کشمیر کی یاد تازہ ہو گی''۔

اس نے پیکٹ وصول کر کے کنیز کے حوالے کر دیا اور شکریہ ادا کر کے خاموش کھڑی ہو رہی۔

بیگم خیمے کے دروازے کی طرف بڑھی تو میزبان بھی پیچھے چلنے لگی۔

خیمے کی حدود بہت تنگ تھیں، سو نے پردہ نے جلد ہی انہیں ایک دوسری سے جدا کر دیا۔

***

''طوفان کے ساتھ اڑتا ہوا خشک پتہ کسی دریا میں جا گرے گا یا کسی پہاڑ کی کھوہ میں کون جانے''۔ بیگم نشست پر کروٹ بدلتے ہوئے قاسم اور سجاول سے مخاطب ہوئی۔ ''جو طوفان ترکوں کو اڑا لے گئے، افغان اس سے بچ جائیں گے۔ ہمیں تو نظر نہیں پڑتا۔ وقت کے ترازو میں ہم نے اپنا وزن کیا تو خشک پتے سے بھی کم نکلا۔ افق پر اٹھتے طوفانوں کو دیکھتے ہیں تو اپنے لئے ندی کی لہر اور پہاڑ کی کھوہ میں کچھ فرق محسوس نہیں کرتے''۔

قاسم مغلانی بیگم کی بجائے ملک سجاول کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو تکیے سے ٹیک لگائے سر ڈالے کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے اور بیگم کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہے تھے۔

''شیش محل کی کھڑکی سے سیالکوٹ اور جموں ہمیں اپنے قدموں کے نیچے معلوم ہوا کرتے تھے۔ جموں کی حویلی میں اپنے دیوان کا دروازہ کھول دیں تو بھی ہمیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا''۔ وہ مسلسل بول رہی تھی جیسے تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ کہہ دینا چاہتی ہو۔ ''لاہور کا راستہ کدھر سے ہو کر جاتا ہے، ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لاہور ہمارے دل میں آباد ہے مگر آنکھ کو دل تک کی راہ کا علم نہیں۔ اس شہر میں ہمارے آباء کے درجنوں مقبرے ہیں۔ عزیزوں اور پیاروں کی قبریں ہیں مگر اب وہاں ان پر فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی موجود نہیں۔ آپ نے تعلقات کی رسی کو ہمیشہ مضبوطی سے تھامے رکھا ہمیں یہ اعتراف کرتے ہوئے سکون ملتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کبھی کبھی نواب معین الملک مرحوم کی قبر

پر مٹی ڈال دیا کریں تب تک جب طوفان اس کی خاک بھی اڑا کر اسے بے نشان نہیں کر دیتے''۔

وہ اپنی آواز کا توازن بحال کرنے کو رکی تو ملک سجاول نے تھوڑا سا سر اٹھایا۔ ''یہ خادم ہر خدمت کے لئے حاضر ہے اور اپنے گاؤں کا راستہ اچھی طرح جانتا ہے۔ حضور پسند فرمائیں تو ہمارے جھونپڑے حاضر ہیں۔ نواب معین الملک پنجاب کے مسلمانوں کے محسن تھے اہل پنجاب نے کبھی کسی کے احسان کو فراموش نہیں کیا۔ نواب مرحوم ان کے دلوں سے بہت قریب ہیں اور قریب رہیں گے''۔

مغلانی بیگم نے اس کے بات ختم کرنے کا انتظار نہیں کیا جیسے وہ باتیں سننے کے لئے نہیں جانے کے لئے آئی ہو۔ ''ملک سجاول! ہم نجیب الطرفین ترک ہیں، ہمارا تعلق اس ترک خاندان سے ہے جس نے نصف صدی تک پنجاب پر حکومت کی۔ ہم نے بچپن سے اب تک اہل پنجاب کو دیکھا آزمایا اور ہمیشہ بات اور دل کے صاف پایا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ترکوں نے ان پر کبھی بھروسہ نہ کیا جس کی سب سے زیادہ سزا ہم حکمرانوں کو ہی بھگتنا پڑی۔ ہم جانتے ہیں کہ پنجاب کے مسلمانوں کو جس عذاب سے گزرنا پڑ رہا ہے یا آگے گزرنا پڑے گا اس کے ذمہ دار ہم ترک اور حکمران ہیں۔ پنجاب کا مسلمان معصوم اور مسکین ہے اور نواب معین الملک شاید آخری ترک تھے جو اس معصوم کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرتے تھے۔ اس لئے ہمیں آپ کی بات پر یقین کر لینا چاہئے لیکن معلوم نہیں کیوں ہمیں سب سے زیادہ فکر ان کی لگی ہے''۔

ایک بار پھر وہ اپنی آواز کا توازن بحال کرنے کے لئے رک گئی مگر اس بار ملک سجاول نے اس کے اپنی بات جاری کرنے کا انتظار کیا اور سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

''ملک پور کی مٹی اور کنارہ راوی ہمیں بہت عزیز ہیں''۔ بیگم نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم نے وہیں پر نواب معین الملک کی زندگی کے شعلہ کو موت کی برف میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ ان کے دوستوں اور اپنے ہمدردوں کے بدلتے رنگ دیکھے اور تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنا سیکھا تھا۔ اس وقت سے اس لمحہ تک ملک پور کا رنگ تبدیل ہوتے ہم نے کبھی نہ دیکھا مگر شاید اب اس صاف ہوا میں شفاف ماحول میں سانس لینا کبھی ہمارے مقدر میں نہ ہو گا''۔

بیگم ایک بار پھر رک گئی، قاسم خاموش تھا، ملک نے کافی دیر تک بیگم کے بات شروع کرنے کا انتظار کیا لیکن جب وہ بات شروع کرنے کی بجائے ان کے چہروں پر لکھے حروف کو ایک دوسرے سے ملانے اور دل کو لفظوں کے کھیل سے بہلانے کی کوشش کرتی نظر آئی تو ملک نے اس کی مدد کی۔ ''ہم نے آج قاسم کو سر پر کلغی لگائے افغان سردار کے روپ میں دیکھا تو ہمیں خدشہ ہوا کہ یہ بھی کہیں ملک پور کی جھونپڑیاں کنارہ راوی کی صاف ہوا اور قندھار سے واپسی کا راستہ ہی نہ بھول جائے۔ اس کے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ہم بادشاہ معظم سے درخواست کرتے کہ آئندہ مہم تک اسے ہمارے پاس رہنے دیں''۔

ملک نے احمد شاہ ابدالی کی آئندہ مہم کا جان بوجھ کر ذکر کیا تھا تاکہ بیگم کے ذہن میں اٹھنے والے طوفانوں کا رخ بدل جائے لیکن بیگم نے اس اشارے کو نظر انداز کر دیا۔ ''ہم بھی کبھی سوچتے ہیں کہ کاش ہمیں سمرقند کی راہ یاد ہوتی۔ ہمارے اجداد حکمرانی کی مصروفیات میں وہ راہ بھول نہ گئے ہوتے مگر یہ احساس ہمیں بھی بہت دیر بعد ہوا ہے، ہم نے یہ صرف اس لئے بتایا تاکہ قاسم اپنے گھر کی راہ کی اہمیت سے آگاہ رہے''۔

قاسم اچانک گفتگو کا موضوع بن گیا تو بے چینی محسوس کرنے لگا۔

''کابل اور قندھار میں راوی کے کناروں جیسا کوئی جنگل پھولتا ہے نہ چمکدار دھاریوں اور سنہری

آنکھوں والے ہرن شکار کرنے کو ل سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارا دل اپنا خدشہ آپ ہی مسترد کر دیتا ہے"۔ ملک سجاول نے بیگم کو جذبات کی خندق سے باہر آنے پر آمادہ کرنے کو کہا۔

"کابل اور قندھار اقتدار کی مسند ہیں، ایسے شہروں کی ہوا اور فضا انسان کو مدہوش رکھتی ہے"۔ بیگم نے قاسم کی طرف دیکھ کر طنز کیا۔

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ بادشاہ معظم کی پنجاب میں آمد و رفت جاری رہے گی اس لئے فی الحال ہمیں قندھار کی ہوا کے اثر کا کوئی خدشہ نہیں"۔ ملک سجاول نے کہا۔

"آپ کا پروگرام کیا ہے؟" بیگم نے اچانک ملک سجاول سے پوچھا۔

"بادشاہ معظم کی قندھار روانگی کے ساتھ ہی ہم ملک پور روانہ ہو جائیں"۔ اس نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہماری خواہش تھی کہ آپ دو چار روز کے لئے جموں تشریف لے چلتے"۔

"حضور کے حکم کی تعمیل لازم ہے مگر گاؤں سے طویل غیر حاضری اور لاہور کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ہمیں جلد از جلد واپس پہنچنا ہے، فرصت ہوتے ہی حاضر ہونے کی کوشش کروں گا"۔

"ہم نے طہماس خاں کو جاگیر کا مختار بنا کر بھیجا تھا، آکر دیکھتے ہیں تو وہ خود ہی نہیں، جموں کی فضا بھی غیر موافق ہے۔ وہ تو ترک بچہ ہے، جموں کو کیا ہوا؟ جان نہیں سکتے"۔ بیگم نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی وہاں موجودگی میں ہم کوئی بہتر فیصلہ کر سکتے تھے"۔

ملک سجاول اور قاسم بھی کھڑے ہو گئے۔ بیگم خیمے سے باہر آئی تو خادم سلام کے لئے رکوع میں چلے گئے، وہ گھوڑے پر سوار ہو کر محافظوں کے ہمراہ واپس چلی گئی اور ملک سجاول اور قاسم وہیں کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔

"سردار! میں یہ سمجھنے میں غلطی تو نہیں کر رہا کہ بیگم صاحبہ نے زمانہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں"۔ ملک قاسم نے خیمے کی طرف واپس مڑتے ہوئے ملک سجاول سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ کی باتوں سے آپ نے درست نتیجہ اخذ کیا مگر ان کے ماضی کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو وہ اتنی آسانی سے اپنی کشتی مقدر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے والی نہیں"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"سردار! بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ ترک بچے اور جموں بدل گئے ہیں۔ میں نے تو محسوس کیا ہے کہ افغان بھی پہلے والے نہیں رہے۔ بیگم صاحبہ نے بادشاہ معظم کے حضور حاضری کی خواہش ظاہر کی تھی۔ شاہ ولی خان نے اس میں بھی بے رخی برتی جہان خان کے بعد وزیر اعظم کے رویے میں یہ تبدیلی بہت بامعنی ہے۔ بیگم صاحبہ پر بادشاہ معظم کے التفات کو دیکھیں تو اس تبدیلی پر یقین دشوار ہو جاتا ہے"۔

"اقتدار کے کھیل میں جس مہرے کی کوئی اہمیت نہ رہے اسے کوئی کھلاڑی اہمیت نہیں دیا کرتا"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔ "عماد الملک کی ہوس نے اس خاندان کو سارے کھیل سے نکال دیا ہے ممکن ہے بادشاہ معظم کو اپنی لشکر گاہ میں بیگم صاحبہ کی موجودگی کا علم تک نہ ہو مگر ان کے لئے بھی مغلانی بیگم اب وہ نہیں جس کی خاطر وہ شاہجہان آباد کو برباد کرنے پر آمادہ ہو جایا کرتے تھے"۔

"بیگم صاحبہ کی زبان سے اپنے خاندان کی اور اپنی غلطیوں کا ذکر سن کر مجھے کافی حیرانی ہوئی ہے"۔ قاسم نے بتایا۔

"کہتے ہیں کہ جواری کو اپنی غلطیوں اور خامیوں کا علم تب ہوتا ہے جب وہ بازی ہار چکا ہوتا ہے"۔ ملک

سجاول نے کہا۔ ”مگر اس وقت اس علم اور اعتراف سے نہ اسے کچھ فائدہ ہوتا ہے، نہ کسی اور کو۔ بیگم صاحبہ کے اس اعتراف سے صرف تمہارے اس اندازے کی تصدیق ہوتی ہے کہ حالات کے منہ زور گھوڑے کی لگام ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہیں۔ یہ گھوڑا انہیں کہاں پہنچائے گا یا کہاں گرادے گا، انہیں بھی علم نہیں۔ ہم ان کے لئے صرف دعا کر سکتے ہیں، ان سے ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں اور ان کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں، کرتے رہنا چاہتے ہیں“۔

***

جموں کی وہ رات بہت سرد تھی، مغلانی بیگم کی حویلی آرام کی نیند سو رہی تھی مگر ان کا سب سے قدیم ملازم طہماس خاں ایک چھوٹی سی ٹھنڈی کوٹھڑی کے تاریک کونے میں بیٹھا موم بتی کی روشنی میں کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ چھ ماہ سے اس کوٹھڑی میں قید تھا اور کسی کو اس کے قید خانے کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔ سردی کی وجہ سے قلم پر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تھی مگر وہ کاغذ پر جھکا موم بتی کی کانپتی روشنی میں مسلسل لکھ رہا تھا۔ کوٹھڑی کے باہر قدموں کی ہلکی سی آہٹ پر اس نے موم بتی بجھا دی اور سانس روک کر بیٹھ گیا۔ قدموں کی آواز اس کی کوٹھڑی کی طرف بڑھی آ رہی تھی۔ اس نے کان آواز پر لگا دیئے، آنے والے قدم کوٹھڑی کے سامنے آ کر رک گئے۔

”فرد واحد“ آنے والے نے کوٹھڑی کی سلاخوں پر منہ رکھ کر ہلکی آواز میں تین بار دہرایا تو طہماس خاں نے موم بتی جلا دی اور ایک بار پھر کاغذ پر جھک گیا۔ آنے والا دیوار کے ساتھ سایہ بن کر پیوست ہو گیا۔ طہماس خاں نے مراسلہ مکمل کر کے کاغذ طے کیا اور سلاخوں کے درمیان سے باہر کھڑے سائے کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کاغذ پکڑ کر جیب میں رکھ لیا تو طہماس خاں نے کھڑکی کے قریب منہ کر کے آہستہ سے کہا۔ ”ترک کا عہد اس کا ایمان ہے“۔

”ترک کا عہد اس کا ایمان ہے“۔ سائے نے جواب میں کہا اور شب کی سیاہی میں تحلیل ہو گیا۔

طہماس خاں وہیں کھڑا اسے اندھیرے میں تحلیل ہوتے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا پھر واپس آ کر موم بتی بجھا دی اور ٹھنڈے بستر پر لیٹ گیا مگر نیند بھی مغلانی بیگم کی مانند اس سے بہت خفا معلوم ہوتی تھی۔ اس نے موم بتی جلا دی اور تنگ کوٹھڑی میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چند قدم چلتا تو سامنے دیوار آ جاتی، وہ کھڑکی کے سامنے آ کر اندھیری رات کے آسمان پر ٹمٹماتے ستارے گننے لگا۔ بیگم کی جاگیر پر چند ماہ کی حکمرانی کے ان دنوں کو یاد کرنے لگا جب وہ پورے پرگنہ کے زمینداروں اور کاشتکاروں پر حکومت کرتا تھا۔ ان میں انعام اور سزائیں بانٹا کرتا تھا۔ دربار لگا کر احکامات جاری کیا کرتا تھا۔ اس طرز حکمرانی سے آشنائی کے بعد اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی مگر کب تک؟ وہ مسکرایا اور بستر پر واپس جا کر بیٹھ گیا۔

طہماس خاں کی کارگزاری اور حکمرانی کے انداز سے خفا بیگم نے اسے قید کر دیا اور اپنے کوکہ کو اس کی جگہ جاگیر کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ وہ جاگیر پر گئی تو چہار محل کے افغان گورنر نے پھر سے طہماس خاں کو سیالکوٹ بھیجنے کی سفارش کی۔ پرگنہ کے زمینداروں اور کاشتکاروں نے بیگم کے حضور حاضری نہ دی۔ جموں کے راجہ اور اس کے وزیر نے طہماس خاں کو قید سے رہا کرنے کی سفارش کی تھی۔ وہ سب اس کے ادنیٰ ملازم کو اتنا کیوں چاہنے لگے ہیں؟ اسے بہت غصہ آیا اور اس نے ملازمین اور خدام کو طہماس خاں کی کوٹھڑی کے قریب جانے سے منع کر دیا۔

سب طہماس خاں کو اس کی جاگیر کا حکمران کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ وہ جتنا زیادہ غور کرتی اتنی ہی قیدی پر

پابندیاں سخت کر دی تھی۔

—طہماس خاں نے غصے سے بستر میں کروٹ لی تو کہیں سے ایک پتھر اس کی کوٹھڑی کے دروازے سے آ کر ٹکرایا۔ وہ جلدی سے کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ رات کے اندھیرے میں حویلی میں پتھروں کی بارش ہونے لگی تھی۔ پتھر مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرا رہے تھے، ہر طرف سے پتھر آ رہے تھے۔

خدام کی آوازوں اور پتھروں کا شور سن کر بیگم کی نیند کھل گئی، اس نے شمع جلائی اور کھڑکی کھول دی۔ ایک پتھر کھڑکی سے آ کر ٹکرایا تو اس کا شیشہ ریزہ ریزہ ہو کر اس کے قدموں میں بکھر گیا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی، پتھر برستے رہے اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کھڑی سوچتی رہی پھر پتھروں کی بارش تھم گئی، اس نے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا، شمع بردار خدام ہر طرف دوڑ پڑے، پتھر آسمان سے برس رہے تھے یا کوئی اہل زمین انہیں سنگسار کرنے آیا تھا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رات کا بقیہ حصہ بیگم نے جاگ کر گزارا اور صبح ہوتے ہی کوتوال شہر کو پتھروں کی بارش سے آگاہ کرنے کو مراسلہ ارسال کیا۔

کوتوال شہر کے نام اس کے مراسلوں اور کوتوال کی یقین دہانیوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حویلی کے ناظم نے پتہ چلانے کی بہت کوشش کی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اتنے پتھر کہاں سے آتے ہیں اور صرف اسی کی حویلی میں کیوں برستے ہیں۔

بیگم کے لئے یہ سنگ باری بہت پریشان کن تھی۔ جس رات پتھر برسانے والے چھٹی کرتے وہ رات بھی وہ جاگ کر گزارتی۔ کوتوال کے بعد اس نے راجہ کو بھی مراسلہ ارسال کیا مگر راتوں کو اس پر اور اس کے ملازمین اور متوسلین پر پتھر برستے رہے اور سارے شہر میں بیگم کی حویلی میں پتھروں کی بارش کا شہرہ ہونے لگا مگر کوئی بااختیار اس سے اظہار ہمدردی کے لئے نہ آیا تو وہ شہر چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگی مگر جانے کہاں اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

ایک سہ پہر وہ دیوان خاص میں بیٹھی انجانی راہوں پر تصور کے سفر کے گھوڑے دوڑا رہی تھی کہ شہباز خان نے افغان وزیراعظم شاہ ولی خاں کے جموں میں نمائندہ کی حاضری کی درخواست پیش کی۔

بیگم اس کی آمد کے مقصد کے بارے میں سوچنے لگی۔

شاہ ولی خاں کا نمائندہ آداب عرض کر کے سیدھا ہوا تو بیگم نے سامنے کی نشست کی طرف اشارہ کیا، وہ آہستہ چلتا ہوا نشست تک پہنچا۔ بیگم اس کے چہرے سے اس کی آمد کے مقصد کا اندازہ کرنے لگی۔

''غلام شرمسار ہے کہ مصروفیت کی بناء پر جلد حاضر نہ ہو سکا، امید کرتا ہوں حضور یہ کوتاہی معاف فرما دیں گے''۔ اس نے تمہید باندھنا شروع کیا۔ ''جموں کے راجہ کی بادشاہ معظم کے حضور حاضری کے بعد اشرف الوزراء نے حضور کے اس غلام کو واجبات کے حساب اور وصولی کے لئے جموں میں متعین فرمایا تھا، اس سے فرصت نہ مل سکی''۔

''ہم آپ کی مصروفیات کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور آمد پر مسرت محسوس کرتے ہیں''۔ بیگم نے مختصر جواب دیا۔

''یہ غلام حضور کی ذات اور خاندان کی عظمت کو دیکھتا ہے تو اپنے مقدر پر فخر کرتا ہے کہ حضور نے شرف باریابی سے سرفراز فرمایا''۔

بیگم نے نگاہ اٹھا کر اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ''ہم اشرف الوزراء کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارا خیال رکھا''۔

''حضور کا یہ غلام اس شہر میں پہلی بار آیا ہے اور اس

شہر کی مٹی اور پانی میں بے وفائی سے بے حد رنجیدہ ہے"۔
"آپ کا جموں میں کب تک قیام ہوگا؟" بیگم نے شہر اور اس کے مٹی اور پانی کے اثرات کی بجائے اس کے اپنے بارے میں سوال کیا۔
"حضور کا یہ غلام جلد واپس جا رہا ہے مگر واجبات کے ساتھ وہ اس شہر کے حاکموں اور باسیوں کے بارے میں جو تاثرات ساتھ لے جا رہا ہے وہ عمر بھر اس کو اذیت پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ رہیں گے"۔ اس نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
"ہم نہیں سمجھ سکے جموں کے راجہ اور عوام اشرف الوزراء کے نمائندہ سے کسی بے اعتنائی کی جرأت کر سکتے ہیں"۔
"حضور کا یہ غلام اپنی ذات سے بے اعتنائی سے نہیں حضور کے لئے جموں کے حکام اور لوگوں میں پائے جانے والے عناد اور احسان فراموشی کے جذبات سے دل گرفتہ ہے۔ یہ غلام سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حضور کے ساتھ یہ لوگ اس حد تک ناروا سلوک کریں گے"۔ اس نے نگاہیں اسی طرح فرش پر جمائے ہوئے کہا۔ "حضور نے اپنی دائی اور اس کے خاندان کی ہمیشہ سرپرستی کی، ان کو ہمیشہ اعلیٰ مقام دیا، ان کے بیٹے کو اپنی جاگیر کا حاکم و مختار بنا دیا لیکن اس شہر کا پانی پیتے ہی وہ بھی حضور کے دشمن ہو گئے اور راجہ کے دربار میں حضور کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا"۔
بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہماری دائی نے ہمارے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے جس کا ہم نے دودھ پیا وہ ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہ کرے گی۔ ہم سمجھتے ہیں آپ کو ہمارے کسی بدخواہ نے یہ غلط اطلاع دی ہے"۔
"حضور کے غلام کے لئے یہ بات اور بھی شرمساری کی ہے کہ حضور اس مقدمہ سے بے خبر ہیں۔ اس غلام نے تو راجہ سے پُرزور الفاظ میں کہا کہ بیگم حضور تو اپنے خادموں میں لاکھوں بانٹتی رہی ہیں، اپنی دائی کا ایک لاکھ روپیہ وہ کسی طرح نہیں دبا سکتیں۔ مگر ان کے وزیر نے حضور کی دائی کی پُرزور حمایت کی اور راجہ نے اس غلام کی ایک بات نہ مانی۔ غلام کا تو خیال تھا کہ حضور اس درخواست سے آگاہ ہوں گی"۔
بیگم نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ "ہمیں شاہ ولی خاں کے عمال سے اسی ہمدردی کی امید تھی۔ ہم چاہیں گے کہ ہمیں اس درخواست کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا جائے"۔
"حضور کی دائی کی طرف سے دو روز قبل راجہ کے دربار میں درخواست گزاری گئی کہ حضور نے اس سے ایک لاکھ روپیہ ادھار لیا تھا مگر اب واپس کرنے کی بجائے ان پر عتاب کا ارادہ رکھتی ہیں اور ان کا مال و اسباب چھیننا چاہتی ہیں۔ اس نے راجہ سے تحفظ فراہم کرنے اور ایک لاکھ روپیہ واپس دلانے کی استدعا کی ہے۔ راجہ نے اپنے وزیر کو کارروائی کا حکم دے دیا ہے۔ حضور کے اس غلام نے اپنی طرف سے صفائی اور ضمانت دینا چاہی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا"۔
"دودھ سے بے وفائی ہمارے اجداد کی روایت نہیں دودھ کی طرف سے بے وفائی کا سن کر ہمیں زیادہ دکھ نہیں ہوا جو خاتون پیسے کے لئے اپنا دودھ بیچ سکتی ہے وہ پیسے کی خاطر اپنے دودھ سے پرورش پانے والے کی جان کی دشمن بھی ہو سکتی ہے"۔ بیگم نے کہا تو یہی کہ انہیں یہ سن کر زیادہ دکھ نہیں ہوا مگر ان کے الفاظ دکھ میں ڈوبے ہوئے تھے اور چہرے پر ناقابل برداشت تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔
"جس شہر کا حاکم کم ظرف ہو، وہاں دودھ پانی ہو جائے تو قصور دودھ کا نہیں حاکم کا ہوتا ہے۔ اس شہر کی مٹی اور پانی اس کا سبب ہوتے ہیں۔ حضور کا یہ غلام تو یہی جانتا اور مانتا ہے"۔

''جموں کے پانی اور مٹی کے علاوہ ہمیں دودھ پلانے والی خاتون جس کو ہم نے ہمیشہ ماں کی مانند عزت اور احترام دیئے، مقام مرتبہ دیئے، اس کے بچوں کو بہن بھائیوں کی مانند جانا۔ اس کے دودھ کے پانی ہو جانے کی ایک وجہ وہ ہوا بھی ہے جو پورے ہندوستان میں چل رہی ہے۔ اس تبدیلی کی ہوا نے ہمیں اس شہر اور حویلی میں مقید نہ کر دیا ہوتا تو ہماری دائی بھی اپنے دودھ اور ہمارے احسانات کو بھول نہ سکتی تھی''۔

''اس غلام کے لئے حضور کے ارشاد سے اتفاق لازم ہے، جموں کے راجہ اور اس کے وزیر کے مزاج پر بھی اس ہوا کا اثر ہے۔ چہار محل کے افغان گورنر کی سکھوں کے ہاتھوں شہادت کی خبر سنتے ہی ان کا مزاج بدلنے لگا تھا لیکن جب بادشاہ معظم کے ارادہ کا علم ہوا تو ان کے مزاج کی تبدیلی کو نابود ہوتے دیکھ کر یہ غلام تو ششدر رہ گیا تھا''۔

''چہار محل کے گورنر کو سکھوں نے شہید کر دیا ہے؟'' بیگم نے حیرانی سے سوال کیا۔ ''بادشاہ معظم کے ارادہ کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا؟'' پھر جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا ہو۔ ''ہاں بادشاہ معظم اس پر خاموش نہیں بیٹھ سکتے وہ سے اس کا بدلہ ضرور لیں گے''۔

''چہار محل کا افغان گورنر سکھوں سے لڑائی میں شہید ہو گیا ہے، سکھ سیالکوٹ شہر کو لوٹ کر فرار ہو چکے ہیں اور قندھار سے افغان فوج سیالکوٹ کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ بادشاہ معظم سکھوں کو اسی طرح کچلنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس طرح انہوں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا تھا، وہ بہت جلد خود بھی پنجاب آنے والے ہیں''۔

بیگم کی فکرمندی میں اضافہ ہو گیا، ان کی جاگیر پرگنہ سیالکوٹ میں تھی اور وہاں کا گورنر سکھوں نے شہید کر دیا تھا اور شہر لوٹ لیا تھا۔ اپنی دائی کی طرف سے جموں کے راجہ کے دربار میں داخل کردہ درخواست پر وہ اپنے کوکہ کو جاگیر کی حاکیت سے برطرف کرنے کا فیصلہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس خبر سے وہ اپنے کوکہ کی سلامتی کے بارے میں فکرمند ہو گئی۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کا ان کے سیالکوٹ کے دورہ کے وقت ہی رویہ باغیانہ تھا۔ گورنر کی شہادت اور سکھوں کی کامرانی کے بعد انہوں نے کیا رویہ اپنایا ہوگا، اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک ہفتہ سے وہ راتوں کی سنگ باری سے پریشان تھی۔ سیالکوٹ سے اسے کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔ گورنر کی شہادت جیسی اہم خبر کسی نے انہیں نہیں بتائی تھی۔ ان کی یہ خواہش مزید شدید ہو گئی کہ احمد شاہ ابدالی پنجاب کے سکھوں کی قوت بھی اسی طرح ختم کر دیں جس طرح انہوں نے دکن کے مرہٹوں کی قوت ختم کر کے ہندوستان پر حکومت کے ان کے خواب ہمیشہ کے لئے پریشان کر دیئے تھے مگر ان کا دل ان کی اس خواہش کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ''خدا کرے بادشاہ سلامت پنجاب کو اس عذاب سے نجات دلا سکیں''۔ اس نے نیم دلی سے دعا کی۔

''حضور کا یہ غلام دو روز تک قندھار روانہ ہو جائے گا، حضور اسے کسی خدمت کے لائق سمجھیں تو یہ اس کے لئے اعزاز ہوگا''۔ اس نے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے کہا اور سلام کر کے دیوان سے باہر نکل گیا۔

کنیز کمرے میں داخل ہوئی تو بیگم کے چہرے کی طرف دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے بیگم کو اس خبر سے آگاہ کرنا چاہئے یا نہیں۔ بیگم نے کنیز کو خاموش کھڑے دیکھ کر خود ہی پوچھا۔ ''ہم سمجھتے ہیں کوئی اہم خبر ہے''۔

کنیز نے ایک دفعہ رکوع کا مرحلہ مکمل کیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر سر جھکا دیا۔ ''ایک ناخوشگوار خبر حضور تک پہنچانے کے لئے اس ناچیز کو منتخب کیا گیا ہے۔ حضور کے

کو کہ سیالکوٹ میں وفات پا گئے ہیں"۔

"ابو تراب وفات پا گئے؟ انا للہ و انا الیہ راجعون' ہمارے مقدر کے صدمے ابھی باقی تھے"۔ بیگم نے اس انداز میں کہا جیسے وہ پہلے سے یہ خبر سننے کی منتظر ہو، کنیز کو بیگم کے پُرسکون ردعمل پر حیرانی ہوئی۔

***

"اماں حضور نے جن قبروں پر حاضری کا حکم دیا تھا ان میں مغلانی بیگم کی قبر بھی ہے۔ بابا حضور فرماتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی قبر کا کسی کو علم نہیں، میں اماں حضور کو واپس جا کر کیا جواب دوں گا"۔ نوجوان نے کہا۔

سردار لکھتا نے اپنے سامنے پھیلی قبروں سے نگاہ اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا۔ "جب سکھوں نے سرہند پر قبضہ کیا تو اس کے ایوانوں کے بعد مسلمانوں کے مزاروں اور قبروں کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر دریا میں پھینک دی۔ جانی خان اور مانی خان کی نسل سے ایک بچہ بھی زندہ نہ چھوڑا۔ لاہور میں میر منو کی قبر کا نشان مٹا کر اس سے اپنی دشمنی کا اظہار کیا۔ مغفور کی بیگم سکھوں کی دشمنی کی اس شدت سے واقف تھیں، شاید اسی لئے انہوں نے اپنی آخری آرام گاہ بے نام اور بے نشان رکھی ہوگی۔ ملک صاحب کا پیغام ملنے پر میں نے بہت جستجو کی مگر سکھ جتھے دار اور سردار بھی نہیں جانتے کہ بیگم زمین میں سما گئیں یا آسمان نے انہیں اٹھا لیا تھا"۔

سردار لکھتا آگے آگے چل رہے تھے ملک سجاول سر جھکائے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور نوجوان ان کے چہروں سے ان کی حالت کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سامنے ایک قبر پر تازہ مٹی ڈالی گئی تھی۔ سردار لکھتا اس کے پاس رک گئے۔ ملک سجاول کی طرف دیکھا اور فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ملک سجاول خاموش کھڑے رہے پھر جب انہوں نے ہاتھ اٹھائے تو آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ سردار لکھتا کے ہونٹ کانپنے لگے۔ نوجوان سر جھکائے قبر کے سرہانے کھڑا رہا اس کی آنکھیں خشک تھیں اور ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ پھر وہ ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگا تو اس کا سرخ و سپید چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔ اس کی دعا بہت طویل ہو گئی تو سردار لکھتا نے ملک سجاول کی طرف دیکھا۔ وہ چلنے کے لئے قدم اٹھانے لگے، نوجوان کی ٹانگیں اس کے جذبات کا بوجھ سہار نہ سکیں تو وہ قبر کے سرہانے بیٹھ گیا اور قبر کی مٹی چومنے لگا۔ ملک سجاول اور سردار لکھتا پاس کھڑے دیکھتے رہے پھر اس نے قبر کے قدموں سے مٹھی بھر خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگائی اور جیب سے رومال نکال کر اس میں باندھنے لگا۔ سردار لکھتا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور گھٹنے ٹیک کر اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں لے کر چومنے لگا۔ ملک سجاول سر جھکائے خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ سردار لکھتا نے سہارا دے کر اٹھانا چاہا تو نوجوان اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ رومال میں بندھی مٹی کو ایک بار پھر آنکھوں سے لگایا اور دونوں بزرگوں کی طرف دیکھنے لگا اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں سوال منجمد ہو گئے تھے۔

ملک سجاول نے آگے بڑھ کر اسے دوسرے بازو سے پکڑ لیا اور تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قبر سے دور ہوئے گئے۔

قبرستان سے باہر مسلح سواروں کا دستہ انہیں واپس آتا دیکھ رہا تھا۔ "کسی بڑی سے بڑی لڑائی میں بھی سالار کے قدم بھی اس طرح نہ ڈولے تھے جس طرح وہ ملک قاسم کو قبرستان کی طرف لاتے ہوئے ڈگمگا رہے تھے"۔ ایک سوار نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

"اتنے سال بیت گئے لیکن وہ جب بھی ملک قاسم کی قبر پر آتے ہیں بہت افسردہ ہو جاتے ہیں"۔ دوسرے سوار نے جواب دیا۔

"میں نے تو ایک دفعہ اس قبر پر سالار لکھتا کی

آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے تھے"۔ تیسرے سوار نے کہا۔
"کہتے ہیں، اس نعش پر تو اشرف الوزراء کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے"۔
"ہم نے افغانوں کو اپنے کسی شہید کا اس شان سے جنازہ اٹھاتے کبھی نہیں دیکھا"۔
"قاسم شہید کا بیٹا تو ترک سردار لگتا ہے"۔ ان کو قریب سے دیکھ کر دستے کے کماندار نے آہستہ سے کہا۔
"اس کی ماں بہت بڑے ترک سردار کی بیٹی ہے، ترک ماں کا دودھ پیا ہے"۔
"ترک حکمران کسی غیر ترک کو ملک کا خطاب بھی تو کم ہی دیتے تھے"۔
"تو کیا ملک سجاول ڈوگر نہیں ہوتے؟"
"ڈوگر نہ ہوتے تو سالار لکھنا ڈوگر کو اس مقام تک کیوں پہنچاتے۔ احمد شاہ ابدالی نے راجہ آلا سنگھ کو انہی کی وجہ سے تو معاف کر کے راجہ مان لیا تھا"۔
"لیکن ترکوں نے انہیں ملک کا خطاب کیوں دیا، اگر یہ ترک نہ تھے تو!"
"ہو سکتا ہے ترک بھی ہوں"۔
وہ تینوں اور بھی قریب پہنچ گئے تھے، سوار اپنے اپنے گھوڑوں کے پاس سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔
سب خاموش تھے سوار اپنے سالار اور ان کے مہمانوں کے احترام میں لب بستہ چلے جاتے تھے۔ سردار لکھنا ملک سجاول اور نوجوان ابھی تک کچی قبر پر فاتحہ خوانی کے اثرات پر قابو نہیں پا سکے تھے۔ قبرستان سے آگے حد نظر تک گندم کے کھیت تھے۔ نیلے آسمان پر چمکتے سورج کی دھوپ میں لہلہاتے سنہری خوشے بھی ان کی افسردگی کم نہ کر سکے۔
"اگر کسی سکھ نے مغلانی بیگم کو قتل کیا ہوتا یا اس کی قبر کا نشان مٹایا ہوتا تو وہ اسے ہرگز نہ چھپاتا بلکہ بڑے فخر سے اس کا اظہار کرتا اور اس کا یہ کارنامہ سکھوں کی مذہبی روایات اور تاریخ کا حصہ بن گیا ہوتا"۔ سردار لکھنا نے نوجوان کو دکھ اور غم سے باہر نکالنے کے لئے مغلانی بیگم کی قبر کی تلاش میں اپنی ناکامی کی کہانی پھر شروع کر دی۔
"مسلمان اور ان کے تاریخ دان شاید میر منو کو بھول جائیں مگر سکھوں کا بچہ بچہ انہیں جانتا ہے اور ان کے خاندان کے بچے بچے کو اپنا قومی دشمن سمجھتا ہے مگر مغلانی بیگم کی موت کا ان کی تاریخی کہانیوں میں بھی کہیں ذکر نہیں ملتا"۔
"پنجاب اور سکھوں کی کوئی تاریخ مغلانی بیگم کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی"۔ ملک سجاول نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"مغلانی بیگم نہ ہوتی تو سکھ پنجاب پر شاید اتنی جلد قبضہ نہ کر پاتے مگر سکھ انہیں اس پہلو سے کبھی نہیں دیکھتے میر منو کے حوالے سے ہی دیکھتے ہیں"۔ سردار لکھنا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

***

نوجوان لال قلعہ کی بلند فصیل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، سردار لکھنا نے اس کی طرف دیکھ کر ملک سجاول سے پوچھا۔ "آپ شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم ثانی کے حضور نذر پیش نہیں کریں گے؟"
"ابھی تو کوئی ارادہ نہیں"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔
سردار لکھنا نے محسوس کیا کہ اسے شاہ عالم ثانی کے حضور حاضری کی تجویز پسند نہیں آئی۔ "اس سے ہاشم کو لال قلعہ اندر سے دکھانے کی صورت پیدا ہو جاتی"۔ اس نے اپنے سوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔
"شاہجہان آباد اور اس کے گرد و نواح میں سینکڑوں مقامات عبرت ہیں پہلے وہ دیکھ چکے تو لال قلعہ کا اندر باہر بھی دکھا دیں گے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔
"میں اگر یہ کہوں کہ لال قلعہ اکیلا ہی شاہجہان

آباد کے جملہ مقامات عبرت پر بھاری ہے اور اس میں مقیم شہنشاہ ہند زمین کے اس حصہ میں سب سے بڑا عبرت کا نشان ہے تو آپ میری اس گستاخی کو درگزر فرمادیں"۔ سردار لکھنا نے ملک سجاول کی طرف سے لال قلعہ کو مقام عبرت قرار دینے پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"درگزر نہ بھی کروں تو میرے پاس اس کی تردید کے لئے کافی دلائل میسر نہیں۔ شاہ عالم ثانی ہندوستان کا ایسا شہنشاہ ہے جس کی شہنشاہیت شاید لال قلعہ کے اندر بھی مستحکم نہیں، اس صورت میں درگزر کئے بن میرے لئے چارہ ہی کیا ہے"۔

لال قلعہ اور اس کی فصیل بہت پیچھے رہ گئے تھے اور نوجوان بڑے غور سے اپنے بزرگوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"میں بھی سوچتا ہوں آل تیمور کے اس زوال کا سبب کیا ہے اور کیا کبھی پھر آل تیمور کی جرأت اور ندرت کردار واپس آسکے گی"۔ سردار لکھنا نے بتایا۔

"آل تیمور کے زوال کے اسباب اور تیموری ندرت کردار کی واپسی کے امکان پر غور میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ہندوستان کی مسلم ملت کو اس زوال کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے طریقوں پر غور کرنا چاہئے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔ "اور اس کے لئے حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ کے عمل اور فرمان سے رہنمائی حاصل کرنا چاہئے۔ انہوں نے ہندوستان کی مسلم سلطنت اور مسلمان حکمرانوں کو عروج سے قعر مذلت میں اترتے دیکھا مگر حوصلہ نہیں چھوڑا بددل ہوکر گوشہ نشین نہیں ہوئے قلم سے اہل سیف کی رہنمائی کی اور جہاں بھی کوئی چنگاری نظر آئی اس کو طوفان کے تھپیڑوں سے بچانے کی کوشش کی۔ جس کسی میں ملت کا درد محسوس کیا اس کی مدد کی آج جب شمال میں سکھ جنوب میں مرہٹے اور مشرق میں فرنگی حکمران ہیں اور لال قلعہ میں مقید مسلمان شہنشاہ ہندوستان کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں تو ہمارے لئے اس اصول پر عمل کرنا اور بھی ضروری ہوگیا ہے"۔

"سردار! اللہ کے حضور ہر مسلمان کو اس کی کوشش کے علاوہ خواہش کی بھی جزا ملے گی۔ میں نے آپ کی مانند خاک میں چنگاریاں تلاش کرنے اور ان سے امیدیں وابستہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی لیکن خواہش میری بھی وہی ہے جو آپ کی ہے مگر جب میں امرائے ملت کو دولت اور جاہ کے پیچھے دوڑتا دیکھتا ہوں، دولت اور جاہ کی خاطر ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے دیکھتا ہوں اور دوسری طرف سکھوں کو دیکھتا ہوں جو اپنے دین اور قوم کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لئے دیوانے ہورہے ہیں تو میری خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ آپ کہیں گے میں مسلم ملت کے دشمن آلا سنگھ کے ساتھ تلوار اٹھائے کھڑا ہوں لیکن میری کوششوں سے مسلم ملت کو کچھ فائدہ بھی ہوا ہے۔ آلا سنگھ نے ہمیشہ احمد شاہ ابدالی کی حاکمیت کو تسلیم کیا ہے جس سے سارے سکھ اس کے دشمن ہورہے ہیں، شاید اس حقیر کوشش کو بھی میرے اعمال نامہ میں شامل کرلیا جائے"۔

"خدائے بزرگ و برتر نیتوں کو جاننے والا ہے۔ اس کے ہاں لازماً نیتوں کی بھی جزا اور سزا ملے گی"۔ ملک سجاول نے سردار لکھنا کی طرف سے اپنے اعمال کی صفائی پیش کرنے کی کوشش پر کہا۔ "انسانوں کی نیتوں کو جاننے والا وہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اسے فکر وعمل کی آزادی دی۔ آپ کی کوششوں کا علم مجھ سے زیادہ اور کسے ہوگا؟ پانی پت کے میدان میں آپ نے ملت کے لئے جہاد کرنے والوں کو تقویت پہنچائی جس کے لئے میں ذاتی طور پر بھی آپ کا احسان مند ہوں لیکن میں ملت کو سرنگوں ہوتے دیکھ کر بھی مایوسی کے حق میں نہیں امرائے ملت کے بارے میں آپ سے اختلاف کرنا ممکن نہیں ہندوستان میں زوال ملت انہی امراء اور حکمرانوں کے جاہ وجلال عشرت پسندی اور ایک دوسرے سے دشمنی ہیں۔

ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں دکھائی دیتی، اس کے باوجود میں امید کو مایوسی سے بہتر سمجھتا ہوں اور خاک میں اگر کوئی چنگاری مل جائے تو اسے زندگی کی نشانی کے طور پر دیکھتا ہوں"۔

"سردار! میں یہ کہنے کی گستاخی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ جن حاکموں، امرائے ملت اور جاہ پسندوں نے ملت کو اس انجام تک پہنچایا ہے ان سے امیدیں وابستہ کر کے میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا ہوں۔ میں تو لال قلعہ کی بلند و بالا دیواروں کے پیچھے پناہ گزین شہنشاہیت کا جنازہ اٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں، میں اس جنازے کو کندھا دینے والوں میں شریک نہیں ہو سکتا"۔

نوجوان ہاشم اپنے بزرگوں کی باتیں سنتا ہوا ساتھ چل رہا تھا، اس کی اصل اور نسل کی جڑیں اسی ہندوستان میں پیوست تھیں جس کی شہنشاہیت کے جنازہ کی اس کے ایک بزرگ نے پیشگوئی کی تھی اور جس کی مسلم ملت کے مفاد کے لئے لڑتے ہوئے اس کے والد نے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا تھا مگر اپنے دل میں دکھ اور درد محسوس کرنے کے باوجود وہ اپنے کو راکھ کی اس ڈھیری سے الگ سمجھتا تھا۔

***

دہلی کے کوچہ بلی ماراں کی ایک شاندار حویلی کی ڈیوڑھی پر انہوں نے اپنے گھوڑے روک لیے، اجنبی سواروں کو رکتے دیکھ کر خادم نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔ "ہم نے محکم الدولہ کی حویلی کی تلاش میں غلطی تو نہیں کی!" سردار لکھتا نے خادم سے پوچھا۔

"یہ خادم عالی مرتبت محکم الدولہ اعتقاد جنگ طہماس خاں بہادر کی ڈیوڑھی پر ہی آداب کی سعادت سے سرفراز ہوا ہے"۔ خادم نے جواب دیا۔ "حضور اپنے اسم مبارک سے سرفراز فرما دیں تاکہ بندہ حضور محکم الدولہ کو جناب کی آمد کی خوشخبری سنانے میں تاخیر کا گنہگار نہ ٹھہرے"۔

"میرے ہمراہ میرے سردار ملک سجاول ہیں"۔ سردار لکھتا نے ملک سجاول کا نام بتایا۔

خادم تیز تیز چلتا ہوا اندر چلا گیا۔

"محکم الدولہ اعتقاد جنگ، کا وزنی خطاب پانے کے بعد بھی طہماس خاں کو مغلانی بیگم یاد رہی ہوگی"۔ سردار لکھتا نے کہا۔

"اگر مغلانی بیگم زندگی کے آخری ایام میں بھی شاہجہان آباد آئی تھی تو طہماس خاں جیسے ہوشیار اور مغلیہ سلطنت کے ایک محکم الدولہ کو اس کا ضرور علم ہونا چاہئے"۔ ملک سجاول نے امید ظاہر کی۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش تنومند شخص تیز تیز چلتا ہوا باہر آیا۔ "حضور نے کسی پرندے کے ہاتھ پیغام بھیجا ہوتا تو یہ غلام حاضری کی سعادت حاصل کرنا اپنی خوش بختی سمجھتا"۔ اس نے ملک کے گھوڑے کی رکاب تھام لی۔

ملک گھوڑے سے اتر آیا اس نے جھک کر سلام کیا اور سینے سے لگا لیا۔ "وقت اور مقدر کے بدلنے سے اپنے محسنوں کو یاد کر کے دل روشن کر لیا کرتا تھا، خوش بختی سے آج آنکھیں بھی دیدار سے روشن ہو گئیں"۔

ملک سجاول نے سردار لکھتا اور ہاشم کا تعارف کرایا تو طہماس خاں نے ہاشم کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی چومی۔ "ملک قاسم کی تصویر دیکھ کر دل کے زخم رسنے لگے ہیں اور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں"۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

ہاشم اس طرز کلام طرز تپاک اور طرز آداب سے ناآشنا تھا، وہ خاموشی سے ان مراحل سے گزر گیا۔

وسیع دیوان میں ریشمی قالینوں کے فرش پر دیواروں کے ساتھ مخملیں گاؤ تکیے جن پر نشستیں ترتیب دی گئی تھیں،

چھت کے مرکز میں آویزاں فانوس کی زنجیریں اور سلاخیں سنہری اور روپہلی رنگوں میں تھیں۔ ایک کونے میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی الماری تھی جس کے سامنے کی نشست کے ساتھ ایک چوکی پر لکھنے کا سامان ترتیب سے رکھا تھا۔ سردار لکھنا نے ایوان کی آرائش کا جائزہ لیا اور طہماس خاں کی انکساری کا اس کے جاہ امیرانہ سے موازنہ کرنے لگا جو ان کے سامنے بیٹھا ابھی تک ان کی آمد پر اپنی خوشی اور خوش بختی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ اور انداز سے لکھنا نے محسوس کیا جیسے وہ ملک سجاول کے دربار میں حاضری کی اجازت پر ان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ خادم فرشی دسترخوان پر میوے چن چکے تو طہماس خان اپنی نشست سے اٹھا اور پلیٹوں میں اپنے ہاتھ سے ڈال کر پیش کرنے لگا۔ ملک نے شکریے سے پلیٹ تھام لی تو وہ سردار لکھنا کی طرف بڑھا تو اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ اٹھالی تاکہ طہماس خاں کو اس ''سعادت'' کا موقعہ نہ مل سکے۔ ہاشم نے بھی سردار لکھنا کی تقلید کی تو وہ اپنی نشست پر واپس چلا گیا۔

''بیگم صاحبہ کو جموں کیوں چھوڑنا پڑا؟'' ملک سجاول کی بجائے سردار لکھنا نے طہماس خاں سے پوچھا۔

اس نے بڑے غور سے تینوں مہمانوں کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا جیسے سامنے قہوہ کی فنجان میں سردار لکھنا کے سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو۔ ''شہر کے حاکم کی آنکھ میں مروت نہ رہی تو شاید بیگم یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں''۔

ملک سجاول نے ''شاید'' کے لفظ پر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اس شاید کی وضاحت کر دیں تو ہمارے لئے آپ کی بات کے معنی تک پہنچنا آسان ہو جائے گا''۔

بیگم صاحبہ نے بہت ہی اچانک جموں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے فوراً ہی بعد اس خادم کو ہمیشہ کے لئے ان سے الگ ہونا پڑا تھا۔ اس لئے یقین سے کچھ کہنے کی بجائے شاید کہنا پڑا۔ افغان وزیر اعظم کے جموں میں نمائندہ کی سفارش پر بیگم حضور نے مجھے قید سے رہا کر دیا اور ایک بار پھر اپنے معاملات کا نگران بنا دیا۔ جو لوگ راتوں کو بیگم صاحب کی حویلی میں پتھر پھینکتے تھے، ان کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس خادم نے ان کو تلاش کرنے کا وعدہ کیا تو بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ ہماری دائی نے کوتوال کے ہاں ہمارے خلاف جو مقدمہ دائر کر رکھا ہے، اس کی پیروی بھی تم کرو گے۔ اس خادم نے ہر جگہ بیگم صاحب کی صفائی پیش کی۔ کوتوال کے ہاں درخواست گزاری رعب سے التجا کی مگر کسی کو آمادہ انصاف نہ کر سکا۔ وہ سب بیگم حضور کی دائی اور ان کے کوک کے باپ کی حمایت کرتے رہے۔ بیگم صاحبہ اس شہر میں ایک اجنبی لاوارث ملزم کی حیثیت کو پہنچ گئی تھیں اور بازاروں کی گفتگو کا موضوع بن چکی تھیں۔ ان حالات میں اچانک ایک رات وہ اپنے خدام اور وابستگان کے قافلہ کے ساتھ سانبہ روانہ ہو گئیں اور اس خادم کو حکم دیا کہ معاملات نپٹا کر تم بھی سانبہ پہنچ جاؤ اور جاگیر کی سند حاصل کر کے وہاں سے سیالکوٹ چلے جانا۔ سانبہ ایک اور راجہ کے ماتحت تھا۔ مجھے چھ سات روز جموں میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد جب میں سانبہ پہنچا تو میرے بیوی بچے اور وہ سب خواتین خادمائیں کنیزیں، خادم خواجہ سرا اور ان کے اہل خانہ جو بیگم کا خاندان تھا اور ہمیشہ ان کے زیر سایہ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی وہاں نہ تھا''۔

''اور بیگم صاحبہ خود؟'' طہماس خاں نے تھوڑا توقف کیا تو سردار لکھنا نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ خود وہیں تھیں، سانبہ میں''۔

''اکیلی؟'' سردار لکھنا کے انداز استفسار میں حیرانی تھی۔

''نہیں، ان کے ساتھ ایک مرد بھی تھا؟''

''بیگم اور وہ مرد وہاں دونوں ہی تھے؟''

''جی، ایک جگہ تھے اور دونوں ہی تھے''۔ طہماس خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ مرد بیگم صاحبہ کا پرانا خادم اور نیا شوہر شہباز خان تھا''۔

''بیگم صاحبہ کا نیا شوہر؟'' ملک سجاول نے چونکنے کے انداز میں پوچھا۔

''جی، ملک صاحب! بیگم حضور نے اس خادم کو یہی بتایا کہ انہوں نے شہباز خاں سے نکاح کرلیا ہے اور حکم دیا کہ ''اسے سلام کرو مبارکباد دو اور نذر پیش کرو، میں تمہیں مروارید کی ایک مالا، ایک قیمتی تلوار انعام دوں گی اور جاگیر کے انتظام کی سند لکھ دوں گی''۔ طہماس خاں نے فنجان میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بتایا اور پھر نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

سردار لکستا نے ملک سجاول کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ناممکن''۔ ملک سجاول کی آنکھوں میں بھی شکوک چمکنے لگے تھے مگر انہوں نے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔

''میں نے انکار کردیا میرا سر شرم سے جھک گیا، غصہ میں جو میرے منہ میں آیا کہہ دیا''۔ طہماس خاں نے ان کی نگاہوں میں چمکتے شکوک کے سائے محسوس کرکے تفصیل بتانا شروع کی۔ ''میں نے بیگم صاحبہ کے اجداد کے نام گنوائے۔ نواب قمرالدین، نواب معین الملک، نواب عبدالصمد خاں، خاں بہادر زکریا خاں، نواب جانی خان، نظام الملک میں نے کہا آپ نے ان سب کے نام و ناموس کو خاک میں ملا دیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے آپ کو اپنی بیٹی کہا تھا۔ آپ نے ان کے سر میں خاک ڈال دی ہے۔ آپ انہیں مراسلہ بھیج کر اطلاع کرتیں کہ لوگ مجھے بدنام کرنے لگے ہیں۔ اس لئے مجھے کسی خاندانی آدمی سے نکاح کی اجازت دی جائے اس سے آپ کے خاندان کی ناموس بھی بچ جاتی اور جاگیر بھی۔ بیگم صاحبہ خاموش بیٹھی سب کچھ سنتی رہیں اور بڑے اطمینان سے کہا۔

''تمہارا خاندان اور باقی سب وابستگان پرمنڈل کی پہاڑی پر مقیم ہیں، تم بھی وہیں پہنچ جاؤ، کل ہم بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔ جاگیر کے نظم کی سند لکھ کر تمہیں سیالکوٹ روانہ کردیں گے''۔ میں اسی روز پرمنڈل پہنچ گیا۔ ایک چوتھائی رات گزری ہوگی کہ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے اس قدیم خادم کو قتل کروانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بیگم صاحبہ نے شہباز خاں سے کہا کہ اگر طہماس خاں کو قید کرتے ہیں تو یہاں پر بھی جموں کی طرح حالات خراب ہو جائیں گے۔ اگر اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیتے ہیں تو یہ جہاں جائے گا ہمیں بدنام کرے گا۔ اس لئے اسے قتل کرنا لازم ہے۔ مجھے ان کے ارادے کا علم ہوگیا انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کرکے پچاس آدمیوں کو پہرے پر بٹھا دیا، وہ دوسری شب مجھے قتل کروانے کا پروگرام بنا چکی تھیں''۔

ملک سجاول اور سردار لکستا کی آنکھوں میں شکوک مزید گہرے ہونے لگے۔ سردار لکستا نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے علم ہوگیا کہ بیگم اور شہباز خاں نے راستہ میں کیا گفتگو کی تھی اور آپ کے قتل کا فیصلہ کرلیا تھا؟''

طہماس خاں اپنی نشست سے اٹھا، کتابوں کی الماری تک گیا اور ایک سنہری رجسٹر نکال کر واپس اپنی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا تو سب نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ نوجوان سب کو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ''یہ میرا بیٹا ہے اور قلعہ معلیٰ کے دروازے پر توپوں کا کمانڈار ہے۔ میرا دوسرا بیٹا بھی شہنشاہ معظم کے حفاظتی دستہ میں افسر ہے۔ خدا کے فضل اور بزرگوں کی دعا سے میں شاہجہان آباد میں نہایت آرام اور احترام کی زندگی بسر کررہا ہوں۔ اس کے باوجود میں نے کبھی اپنا ماضی نہیں چھپایا۔ میں سب کو بتاتا ہوں کہ میرا نام طہماس خاں نواب معین الملک نے رکھا تھا۔ میرے ماں باپ نے میرا نام کیا رکھا تھا مجھے کچھ

معلوم نہیں۔ مجھے اپنے ماں باپ کے نام بھی معلوم نہیں، وہ کون تھے کیا تھے، میں نہیں جانتا"۔ وہ اٹھا اور رجسٹر ملک سجاول کو پیش کر کے واپس اپنی نشست پر آ گیا۔ "یہ سب کچھ میں نے اس رجسٹر میں بھی لکھ دیا ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جب نادر شاہ کی فوج نے ہمارے شہر پر حملہ کیا تو ایک سوار نے مجھے میرے بھائی اور ماں سے چھین لیا تھا، میں بہت چھوٹا تھا، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری ماں سوار کے پیچھے بھاگ رہی تھی اور دوسرے سپاہی نے اس پر کوڑے برسائے تھے، میرے سفر اور مصائب کی کہانی بڑی طویل اور دردناک ہے۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا میں جس ازبک کے پاس پہنچا اس نے مجھے تحفہ کے طور پر پنجاب کے صوبیدار نواب معین الملک کو پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے میری پرورش اور تربیت کی تعلیم دلائی۔ سب اس میں درج ہے۔ پر منڈل کی قید تک میں خوشی اور دکھ میں ہمیشہ بیگم صاحبہ کے حضور حاضر رہا۔ انہوں نے اپنی خاص کنیز سے میری شادی کی، جہیز دیا، سب اخراجات خود ادا کیے، میں زندگی بھر ان کے اور نواب مغفور کے احسانات نہیں بھول سکتا۔ آپ اس رجسٹر میں یہ سب کچھ پڑھ سکتے ہیں اور اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو طہماس بیگ خان اپنے بارے میں جھوٹ نہیں لکھ سکتا وہ اپنے محسن اور بیگم عالیہ کے بارے میں غلط بیانی کیسے کرے گا"۔

ملک سجاول نے رجسٹر ایک طرف رکھ دیا۔

"اس قید اور قتل سے آپ کیسے بچے؟" سردار لکھنا نے پوچھا۔

"زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، آپ میری کہانی میں پڑھ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے کئی بار موت کے منہ سے نکالا، اسی نے مجھے بیگم کی قید اور قتل کے پروگرام سے بھی بچا لیا۔ وہ جگہ ایک ہندو بیراگی کے مندر کی جاگیر میں تھی، میں نے اس بیراگی کو خفیہ مراسلہ بھیجا اور منت کی کہ وہ مجھے اور میرے اہل و عیال کو بیگم کے ظلم سے نجات دلائے ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے گی۔ مراسلہ ملتے ہی بیراگی نے نقارہ بجا دیا، اپنے سوار اور پیادے جمع کیے اور لشکر بنا کر پر منڈل پہنچ گیا اور مجھے بیگم کی قید سے چھڑایا۔ بیراگی کی مدد سے اسی رات میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ جموں روانہ ہو گیا اور پھر لاہور اور سرہند ہوتا ہوا شاہجہان آباد آ گیا"۔

ملک سجاول سر جھکائے طہماس خان کی اسیری اور رہائی کی کہانی سن رہے تھے"۔ بیگم صاحبہ وہیں مقیم رہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ کا یہ خادم جب پر منڈل سے روانہ ہوا تو بیگم صاحبہ وہیں مقیم تھیں، میں کئی روز جموں میں سفر کی تیاریوں میں مصروف رہا، اس وقت تک وہ واپس تشریف نہیں لائی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی اور سکھوں کے درمیان برنالہ کی لڑائی کے بعد تک میرے اہل خانہ جموں میں تھے، انہیں بھی بیگم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا"۔

برنالہ کی لڑائی کے ذکر پر ہاشم نے طہماس خان کی طرف دیکھا، ان کے والد اسی لڑائی میں شہید ہوئے تھے اور سردار لکھنا نے انہیں اپنے گاؤں لے جا کر دفن کیا تھا۔

"تو کیا یہ کہنا درست ہو گا کہ اس بار بیگم صاحبہ نے احمد شاہ ابدالی کے حضور حاضری نہیں دی"۔ ملک سجاول نے پوچھا۔

"بادشاہ معظم کے اس سفر میں آپ کا یہ خادم سرہند اور برنالہ میں شاہی لشکر کے ساتھ تھا۔ بادشاہ معظم کے حضور بھی حاضری دی۔ شاہ ولی خان اور جہان خان کے لشکر کے ساتھ مل کر لڑائی میں حصہ لیا۔ تب وہاں نہ کسی نے بیگم صاحبہ کو دیکھا نہ کسی نے ان کا کوئی ذکر کیا"۔ طہماس خان نے بتایا۔ "اس کے بعد میں نے صرف ایک دفعہ بیگم صاحبہ کے حضور حاضری کی سعادت حاصل کی مگر یہ قید اور رہائی سے سترہ اٹھارہ سال بعد کی بات ہے۔ بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کی وفات سے بھی کئی سال بعد

ایک بار معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ شاہجہان آباد میں موجود ہیں۔ میں نے اپنے آدمی ان کی تلاش میں لگا دیئے۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو ڈھونڈ نکالا، وہ ایک معمولی سرائے میں مقیم تھیں۔ میں حاضری کے لئے حاضر ہوا تو ان کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شکستہ سرائے کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بیگم صاحبہ مقیم تھیں۔ دروازے پر ایک خستہ حال خادم حاضر رہتا تھا۔ کوٹھری کے ایک کونے میں لکڑی کے ایک تخت پوش پر میلے کچیلے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں۔ ان کی بینائی کمزور ہو چکی تھی، بہت نحیف و لاچار تھیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا عروج میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جس خاندان نے چالیس برس تک پورے ہندوستان پر حکومت کی تھی، اس کی بیٹی کو شاہجہان آباد میں کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ وقت کا قافلہ بہت آگے نکل گیا تھا، زمانہ اور شاہجہان آباد بہت بدل چکے تھے، امراء دربار، وزراء سب کچھ نیا تھا صرف تخت ہند پر جلوہ افروز شہنشاہ پرانا تھا۔ اس کے اردگرد چند لوگ وہ بھی تھے جو بیگم صاحبہ کے حضور حاضری اپنے لئے بہت اعزاز سمجھا کرتے تھے مگر آپ کے اس خادم کے سوا شاہجہان آباد کے کسی باسی نے ان کا حال نہیں پوچھا۔ میرا دل روتا تھا مگر بیگم صاحبہ خاموش رہتی تھیں۔ میں نے اپنے غریب خانہ پر قیام کی التجا کی مگر انہوں نے قبول نہیں کی۔ وہ اس کمرے میں تنہا بیٹھی رہتی تھیں، میں نے ان کے قیام کو آرام دہ بنانے کی پوری کوشش کی۔ اکثر حاضری دیتا، وہ نہ اپنے ماضی کی بات کرتی تھیں، نہ حال کے بارے میں کچھ بتاتی تھیں۔ عمادالملک راجہ جے پور کے دربار سے وابستہ ہو چکا تھا۔ میں نے معلوم کیا وہ اپنی بیٹی اور داماد کے پاس جانا پسند کریں گی تاکہ یہ خدمت انجام دے سکوں۔ بیگم حضور نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ایک روز حاضری کے لئے گیا تو معلوم ہوا وہ ایک قافلہ کے ہمراہ روانہ ہو گئی ہیں اور وہ قافلہ سرہند اور جموں کی طرف گیا ہے"۔

"شہباز خان بھی ان کے ساتھ تھا؟"

"نہیں اس ایک خادم کے سوا ان کے ساتھ اور کوئی نہ تھا"۔

"گویا سمرقند سے ہندوستان آنے والی بے نام خاتون کی اولاد کے بے مثل عروج کی کہانی اس کی بیٹی کے زوال اور بے نام منزل کے سفر پر ختم ہو گئی"۔ سردار لکھنا نے کہا جو بڑے غور سے طہماس خاں کی باتیں سن رہا تھا۔

"بے مثل عروج کی اس کہانی نے زوال کی جس بے نظیر کہانی کو جنم دیا کون جانے وہ کہاں پر ختم ہو گی۔ سمرقند سے آنے والی خاتون کی اولاد کی کہانی کے اوراق ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہیں اور اس کہانی سے جنم لینے والی کہانیوں کے مختلف ابواب ہندوستان کے مختلف حصوں میں لکھے جا رہے ہیں، ان کی ترتیب سے نئی کہانی کسی کے بھی عروج کی کہانی ہو، ہندوستان کی مسلم ملت کے زوال کی کہانی ہی ہو گی"۔ ملک سجاول نے کہا۔ "اس کہانی کا جو باب پنجاب میں لکھا جا رہا ہے وہ مغلانی بیگم کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا"۔

"مغلانی بیگم کی قبر کہاں ہے؟" ہاشم نے دیوان میں بیٹھے سب بزرگوں کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ طوفان کے ساتھ اڑتا ہوا خشک پتہ کسی دریا میں جا گرے گا یا پہاڑ کی کھوہ میں کون جانے"۔ بیگم نے کہا تھا ملک سجاول کو سیالکوٹ میں ان سے آخری ملاقات یاد آئی۔ "وقت کے ترازو میں ہم نے اپنا وزن کیا تو خشک پتے سے بھی کم نکلا افق پر اٹھے طوفان کو دیکھتے ہی تو اپنے لئے ندی کی لہر اور پہاڑ کی کھوہ میں کچھ فرق محسوس نہیں کرتے"۔

....ختم شد....

میں نے ظلم و درندگی کی آگ اپنی آنکھوں سے بھڑکتی دیکھی۔ شیطان کا کوئی دین یا مذہب نہیں تھا۔ کھینچنے والے نے نہ دیکھا آنچل اپنا ہے یا پرایا۔ لوٹنے والے نے نہ دیکھا لٹنے والے کی قومیت کیا ہے۔

شاخِ نازک پہ آشیانہ

عالیہ بخاری ہالے

وہ کرتے بھی تو کیسے؟ بی جی نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں مدہوش کھڑے تھے۔ ان کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ غیر آباد اور کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے سٹور کی کھڑکی یکبارگی کھلے گی اور اس میں سے بی جی کا تحیر زدہ چہرہ جھانکنے لگے گا۔ دونوں ہی سانسیں روکے کھڑے تھے۔ ثانیہ کا خیال تھا کہ ابھی ایک قیامت صغریٰ بپا ہوگی۔ شجر، حجر، روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا اور دریا، سمندر، پہاڑ جگہیں بدلنے لگیں گے۔ خاندان کی عزت اور غیرت کا جنازہ ان دونوں کے جنازے کے ساتھ اٹھے گا۔

مگر ایسا کچھ بھی تو نہ ہوا۔ بس دونوں یوں کھڑے رہ گئے جیسے کسی نے بھرے میلے میں عریاں کر دیا ہو۔ کھٹاک سے ٹوٹی ہوئی کھڑکی بند ہوئی اور بی جی کا چہرہ اسی اندھے غار میں گم ہو گیا۔ سفیر ایک جھرجھری لے کر ثانیہ سے الگ ہو گیا اور اسے یوں اجنبی نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی اجنبی سیارے کی مخلوق ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کچھ نا سمجھ انداز میں کندھے اچکائے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا مردانے کی طرف چل دیا۔

ثانیہ سفید چہرہ لئے اپنے تن مردہ کو گھسیٹتی ہوئی اندر آئی تو بی جان تخت پوش پر پڑے اپنے رنگین موڑھے پر بیٹھی آسمان کو گھور رہی تھیں یوں جیسے یہاں سے کبھی اٹھی ہی نہ ہوں۔ وہ ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے پھانسی کے مجرم کی طرح ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا بی جی!'' رسوئی سے نکلتی امل اس صورت حال کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ ''اس نے پھر کوئی شیطانی کر دی؟'' وہ پریشانی سے بولی۔ بی جی کی نگاہیں امل سے ہوتی ہوئی ثانیہ پر آ ٹکیں۔

''چل نی..... جا کے میرے کپڑے استری کر

جب دیکھو کیڑی کا ڈا، آپو نا پو یا جیسے کھیلتی نظر آئے گی''۔ ثانیہ نے آنسو بھری آنکھوں میں حیرانی لئے ان کی کڑک دار آواز سنی اور پاؤں گھسیٹتی اندر کی طرف چل دی۔

''کچھ نہیں احتل... جا رات کے کھانے پر ذرا اہتمام کرلیجیو خشی کے ساتھ کچھ مہمان ہوں گے''۔ احتل کی طرف دیکھ کر انہوں نے ماں جیسی شفقت سے کہا تو اس کی جان میں جان آئی۔

بی جی اٹھارہ سالہ ملک سفیر کی پھوپھی تھیں اور بھائی بھاوج کی ناگہانی موت کے بعد اس کی واحد سرپرست بھی۔ ملک سفیر جو بے شمار زمینوں، مربعوں اور فیکٹریوں کا اکلوتا وارث تھا، تیرہ چودہ سال کی عمر میں جب اس کے والدین ایک ایکسیڈنٹ میں چل بسے تو پچپن چھپن سالہ غیر شادی شدہ بی جی آپ ہی آپ اس کی سرپرست بن گئیں۔ گھر بیٹھے جس طرح انہوں نے کاروبار اور زمینوں کا انتظام سنبھالا تھا ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں اور زیرک نظری کا قائل ہو چکا تھا۔

ملک سفیر منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ دولت اور اختیار اس گھر کی باندی تھا۔ پھر ملک سفیر شروع سے ہی اپنی اکلوتی پھوپھی کی آنکھوں کا تارا تھا لیکن وہ بہت بااصول تھیں۔ سفیر کی زندگی کو بھی انہوں نے ایک سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ تعلیم و تربیت کے معاملے میں اسے ذرا بھر رعایت حاصل نہیں تھی۔ صبح پانچ بجے اٹھنا، نہانا، نماز اور سیپارہ پڑھنا ہے۔ سکول سے آ کر کھانا کھانا اور کچھ دیر آرام کرنا ہے۔ شام کو ٹیوٹر سے ہوم ورک کرنے کے بعد لان یا لاؤنج میں بی جی کے ساتھ چائے ناشتہ کرنا ہے۔ آؤٹنگ پر جانا، یا ٹی وی دیکھنا ہے۔ نو بجے ڈنر کے بعد سو جانا ہے۔ ایک کی بندھی زندگی روز کا معمول۔ کبھی کبھی سفیر بغاوت پر اتر آتا لیکن بی جی نے ہمیشہ اسے ایک کھونٹی میں رکھا تھا۔ وہ اولاد کو سونے کا نوالہ کھلانے مگر شیر کی نگاہ میں رکھنے کی قائل تھیں۔ سفیر سے وہ لاڈ بھی کرتی تھیں، دوستی بھی تھی مگر جہاں وہ پٹڑی سے اترنے کی کوشش کرتا بی جی ایک سخت جیلر بلکہ سفیر کے کہنے کے مطابق جیل کے داروغہ کا روپ دھار لیتیں۔ اکلوتا ہونے کے باوجود اس کی وہی ضدیں مانی جاتی جو جائز ہوتیں۔

جوان ہونے اور خصوصاً شہر جا کر کالج میں داخلہ لینے کے بعد سفیر کے رویوں میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ اپنے بااختیار اور دولت مند ہونے کا احساس آہستہ آہستہ اسے ملکوں کی مخصوص عادات و اطوار اور روش پر لے آیا تھا لیکن بی جی کے سامنے اس نے اسی سعادت مندی اور معصومیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا جو اس کے بچپن کا خاصا تھا۔ سفیر کی زندگی کا جو خاکہ اس کے والد ڈی ایس پی ملک امیر حسین بنا گئے تھے، بی جی اس میں سر مو تبدیلی کی قائل نہیں تھیں۔

امت الرسول کا تعلق ملک امیر حسین کی ذات برادری سے ہی تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ لٹی لٹائی، قدم قدم پر اپنے چھ بچوں اور شوہر کی جان کا نذرانہ پیش کر کے جانے کیسے اپنی جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ثانیہ کی پیدائش پاکستان بننے کے چھ سات ماہ بعد کی تھی۔ یہ اس کی شادی شدہ زندگی اور شوہر کی واحد نشانی تھی جو اس کی کوکھ میں چھپی اس کے ساتھ پاکستان آ گئی تھی۔ ورنہ شاید اس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی بہانہ باقی نہ بچتا۔ احتل کو ریفیوجی کیمپ میں بے یار و مددگار اور پریشان حال دیکھ کر سفیر کے والد اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ وہ ہمیشہ احتل سے بھی اپنی بہن فاطمہ کا سا حسن سلوک اور شفقت برتتے تھے۔ ان کی ماں جی نے احتل کو بھی اولاد کی طرح ہی سینے سے لگا لیا تھا۔ انہوں نے تو گھر کی چابیاں تک احتل کو سونپ رکھی تھیں۔ گھر کا انتظام و انصرام احتل کے ہاتھ میں تھا۔ ماں جی کے بعد امیر حسین کی بیگم، بھابی جی نے بھی وہی طرز عمل برقرار رکھا اور اب بی جان کے راج پاٹھ میں بھی احتل کی

چودھراہٹ اسی طرح قائم تھی۔ وہ ڈائننگ پر اور ہر مشورے میں بی جی کے ساتھ رہتی۔ احمل اور ثانیہ کی حیثیت گھر کے افراد کی سی ہی تھی۔ مگر احمل نے بھی ہمیشہ اپنے خاندانی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اسے ہمیشہ گھر کے ہر فرد کی خوشنودی کا خیال رہتا تھا اور بی جی کے دل کا حال تو وہ ان کی چتون سے معلوم کر لیتی تھی۔ اب بھی وہ پریشان تھی، جانے کیوں اسے لگتا تھا جیسے فضا کسی آنے والے طوفان کے خوف سے بوجھل ہے اور بی جی کے اندر اٹھتے طوفانوں کو بھانپتے اس کی نگاہ اپنی اکلوتی اولاد پر پڑی ہی نہیں جس کا چہرہ کسی زندہ لاش کی غمازی کر رہا تھا۔

سارے گھر پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ پورے دو دن گزر گئے تھے، مارے دہشت کے ثانیہ مرنے کو تھی۔ اسے ہمیشہ ہی بی جی سے ڈر لگتا تھا۔ ان کی خاموش اداس بجھی بجھی آنکھیں پُراسرار لگتیں۔ بچپن سے اس کی ماں نے ظلِ الٰہی کی طرح بی جی کا احترام کرتا ان کی موجودگی میں خاموش رہنا اور باادب ہو کر بیٹھنا، دھیمے دھیمے بولنے اور آہستگی سے چلنے کا سبق پڑھایا تھا۔ شرارتی تو خیر وہ ازل سے تھی مگر یہ شرارتیں اماں اور بی جی سے آنکھ بچا کر ہی ہوتی تھیں۔ اماں دیکھ لیتی تو چلا اٹھتی۔

''مرن جوگیے! بی جی نے دیکھ لیا تو...'' ثانیہ کو ڈرانے کے لئے بیان کا مخصوص جملہ تھا۔ بی جی نے اسے کبھی کچھ کہا ہو یا نہ کہا ہو مگر اتنا سن کر ہی اس کی روح فنا ہو جاتی تھی اور آج بی جی نے وہ راز جان لیا تھا جو شاید اس نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا۔

بچپن میں ثانیہ ایک ایسی بچی تھی جو سامنے ہونے کے باوجود اپنا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ ماں کی سخت نگاہی کی وجہ سے اسے ہمیشہ سفیر اور بی جی کی خوشنودی کا اپنی مرضی، اپنی خواہش اور اپنی ضرورت سے بڑھ کر خیال رہتا۔ عمر کی سیڑھیاں چڑھتے کب ملک جی اس کے دل کے سنگھاسن پر آ براجمان ہوئے اور کب وہ چوری چھپے ان کی پرستش کرنے لگی، اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ جوان ہونے کے بعد جب سفیر کی آنکھوں میں بھی جوانی کے رنگ اتر آئے۔ اس کے اندر جوانی کے جذبات اور جوانی کی احتیاجات انگڑائیاں لینے لگیں تو ثانیہ ہی قدرت کا وہ حسین شہکار نظر آئی جو اسے گھر پر ہی میسر تھی۔ چوری چھپے کی تاکا جھانکی چھپ چھپ کر ملاقاتوں میں بدلی اور دونوں دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

اور اب ثانیہ کا برا حال تھا۔ وہ ملک جی سے ملنا چاہتی تھی۔ انہی کے سہارے تو اس نے اتنی جرأت کی تھی کہ آکاش پر اڑنے کے خواب دیکھ بیٹھی۔ انہی کے بازو تو اس کی پناہ گاہ تھے۔ مگر اُدھر ہنوز خاموشی تھی۔ ملنا تو کجا سفیر سامنا ہونے پر بھی اس سے نظریں چرا جاتا تو ہمیشہ ساتھ نبھانے اور ہر مشکل کا سامان حل کرنے کے وعدے ثانیہ کا کلیجہ نوچنے لگتے۔

''ملک جی! بی جی مجھے ڈانٹتی کیوں نہیں، برا بھلا کیوں نہیں کہتیں، ذلیل کیوں نہیں کرتیں؟ وہ میری جان ہی کیوں نہیں لے لیتیں کہ قصہ ہی ختم ہو۔'' چیختے چلاتے طوفانی سناٹے میں ملک سفیر خود سے بھی نظریں چرائے باہر جا رہا تھا۔ جب ثانیہ ٹوٹے پتے کی طرح اس کے پیروں میں آ گری۔

''آپ کو بھی کچھ خیال نہیں میں جیتی ہوں یا مر گئی؟'' وہ دہائیاں دے رہی تھی۔

شام کے سرمئی اندھیرے میں جب چاند رات کی ہکل سے منہ نکال ہی رہا تھا ملک سفیر بدک کر یوں اچھلا جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے ثانیہ کو اپنے روبرو کھڑا کر لیا۔

''تو صبر کیوں نہیں کرتی، تُو کیوں چاہتی ہے وہ تجھے ڈانٹیں، ذلیل کریں؟ چپکی بیٹھی رہ۔ وہ... میں طوفان آنے سے پہلے ہی کوئی بندوبست کر لوں گا۔ میں پریشان ہوں مگر پیچھے نہیں ہٹا ہوں۔ چپ ہوں مگر سب آنکھیں ہر کر

چکا ہوں۔ بی جی کا رویہ ڈرا دینے والا ہے۔ وہ اتنی چپ ہیں، یوں لگتا ہے جیسے دل میں کوئی خوفناک منصوبہ بنائے بیٹھی ہیں۔ میں تو ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ مگر ڈرتا ہوں وہ تجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ کسی کو غائب کرا دینا ان کے لئے کیا مشکل ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ہمیں کسی صورت ایک نہیں ہونے دیں گی لیکن ثانو! حوصلہ رکھ میں تجھ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ جان دے دوں گا، مر جاؤں گا مگر تجھے نہیں ہاروں گا۔ تیرے ساتھ کئے سب قول قرار نبھاؤں گا میں۔ ملکیت کا تنتنا، جوانی کا جوش اور ولولہ ملک کے لہجے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ثانیہ ڈر گئی، روتے ہوئے بولی۔

"میں آپ پر قربان ملک جی! میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میرے جیسی کئی آپ کی جان کا صدقہ۔ میں آپ سے کہتی تھی ناں...... کہتی تھی ناں کہ ہمارا کوئی میل نہیں۔ بھلے ذات برادری ایک ہی کیوں نہ ہو، بھلے بی جی نے ہمیں ساتھ بیٹھنے کا مان دے رکھا ہو مگر ہیں تو ہم آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والے غریب بے آسرا لوگ۔ یہ خاموشی کی مار مجھ سے سہی نہیں جا رہی ملک جی! آپ خود میرا گلا گھونٹ دیجئے، نہیں تو میں کچھ کھا کے مر جاؤں گی"۔ وہ کرلا رہی تھی۔

"بکواس بند کر...... کمل نہ ہو تو..... فضول بولتی رہتی ہے۔ تو فکر نہ کر بی جی اگر اپنی ہٹ اور اصولوں کی پکی ہیں تو میں بھی ان ہی کا خون ہوں، آرام سے نہیں بیٹھا میں۔ تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا"۔

کہیں کوئی پتہ کھڑکا، پھر قدموں کی چاپ سنائی دی، سفیر نے چونکی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا اور دبے قدموں تیزی سے باہر نکل گیا۔

اگلے دن شام کے گہرے ہوتے سایوں میں ثانیہ جھولے پر اداس بیٹھی تھی۔ جب کنکری پر لپٹا کاغذ اس کی گود میں آ کر گرا اس نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ منڈیر پر سے جھانکتے سفیر کو دیکھ کر اس نے کاغذ اٹھا لیا۔

"رات گیارہ بجے..... چھت پر آنا"۔ کاغذ پر لکھا تھا۔ اس کا جواب اثبات میں پا کر سفیر پیچھے ہٹ گیا۔

رات وہ اوپر جا ہی رہی تھی، جب سفیر نے اسے سیڑھیوں کے بیچ ہی روک لیا۔

"بس آج کی رات..... کل رات بارہ بجے ہم شہر کے لئے نکل رہے ہیں۔ کچھ ساتھ لینے کی ضرورت نہیں تجھے۔ رات بارہ بجے پچھلے گیٹ پر ایک کالی گاڑی کھڑی ہو گی، خاموشی سے اس میں آ کر بیٹھ جانا۔ ہم شہر جا کر میرے دوست کے یہاں ٹھہریں گے جہاں ہمارا نکاح ہو گا۔ نکاح کے بعد ہم دونوں اپنے بنگلے پر آ جائیں گے کیونکہ نکاح کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا۔ بی جی کو میرا فیصلہ ماننا ہی پڑے گا"۔ ثانیہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ملک سفیر اپنی بات سنا کر جا چکا تھا۔ دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ منڈیر کے پاس دو آنکھیں ان کی نگران تھیں اور دو کان ان کے مخبر۔

اس صبح بھی ثانیہ نے حسب معمول اٹھ کر اماں کے ساتھ دن کے کاموں کا آغاز کیا تھا۔ مگر ایک عجیب بے کلی سی تھی۔ ہر چیز، ہر کام، ہر شخص عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر نگاہ کھوجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حد یہ کہ اپنی ماں بھی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہیں جا کر چھپ کر بیٹھ رہے۔ اچاٹ من لئے وہ کام کرتی رہی۔

دوپہر کے کھانے پر مولا داد نے مردانے میں ملک سفیر کے کسی دوست کی آمد کی اطلاع دی۔ ملک سفیر کے دوست آتے جاتے رہتے تھے۔ کئی کئی دن قیام بھی کرتے تھے۔

"اچھا..... اچھا..... کھانا پانی پہنچاؤ، خاطر داری میں کمی نہ ہو"۔ بی جی حسب معمول بولیں۔

"رات بارہ بجے پچھلے گیٹ کے پاس کھڑی کالی گاڑی میں آ کے بیٹھ جانا..... ہم میرے دوست کے گھر ٹھہریں گے جہاں ہمارا نکاح ہوگا"۔ ثانیہ کے کانوں میں

ملک سفیر کی آواز گونجی۔ دل زور سے دھڑ دھڑایا اور اس کے ہاتھ سے برتنوں کی ٹرے چھوٹ گئی۔ شیشے کے برتن ٹوٹ کر دور دور تک پھیل گئے۔

"نی تیرا ستیاناس!" احتل چلائی، ابھی وہ فضیحتا شروع کرنے ہی والی تھی کہ بی جی نے روک دیا۔

"چھوڑ دے احتل! مجھے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ جا بچی تو جا کے آرام کر"۔ بی جی بولیں۔ ثانیہ کے لئے ان کا ہر روپ ہر رویہ حیران کن اور ایک الجھاؤ لئے ہوئے تھا۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ سے بی جی کا تصور ایک سخت حاکم کا تھا۔ اب بھی وہ سہما دل لئے اپنی سزا کی منتظر تھی۔ ہال میں آ کر وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ نوکر چاکر کام کرتے پھر رہے تھے۔ اپنے کمرے سے رسوئی کی طرف بی جی کا بھی ایک آدھ چکر لگا تھا۔

"ثانیہ! بچی ذرا بات سن!" وہ وہیں اداس بیٹی تھی۔ جب اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی بی جی نے اسے آواز دی۔ ان کے کمرے کا ایک دروازہ مردانے کی طرف کھلتا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے نیم تاریک کوریڈور میں وہ دبے قدموں چل رہی تھیں۔ مہمان خانے کی کھڑکی کی ذرا سی کھلی تھی۔ اندر ملک سفیر اور اس کا دوست بیٹھے چائے کافی سے دل بہلا رہے تھے۔

"یار! ابھی بھی سوچ لے، یہ لڑکی تیرے سٹینڈرڈ کی نہیں، ایک بار پھر غور کر لے۔ کہاں مریم، زوہا اور شاہدہ جیسی گلیمرس گرلز اور کہاں یہ..... اگر بی جی منع کر رہی ہیں تو خواہ مخواہ ان سے نکر مت لے۔ مریم تیرے عشق میں پاگل ہو رہی ہے۔ زوہا اور روبی تجھے پھانسنے کے چکر میں ہیں۔ ابھی تو تو عشق میں پاگل ہو رہا ہے مگر خود سوچ وقت گزرنے کے ساتھ ان برقی قمقموں کے سامنے اس اردو میڈیم ماں کی موم بتی کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ سفیر میں تیرا دوست اور خیر خواہ ہوں، تیرا ساتھ تو دے رہا ہوں مگر تجھے سمجھانا بھی میرا فرض ہے"۔ سفیر کا دوست شاید اتمام حجت کے طور پر آخری بار اسے سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"ہو گیا بھاشن ختم؟" سفیر مسکرایا۔

"ملکوں کی زندگی میں یہ حسینائیں، اپسرائیں، آتی جاتی رہتی ہیں، کبھی دل لگی سے، کبھی وقتی محبت کے جوش میں، کبھی ضد اور انا میں اور کبھی صرف سوچ میلے کے لئے۔ یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے اور جو چیز ملک سفیر کو اچھی لگے اسے حاصل کر لینا اس کا حق ہے اور قول دے کر پیچھے نہ ہٹنا ضد اور انا کا مسئلہ"۔ وہ مونچھ مروڑ کر مسکرایا۔

"ویسے..... مجھے بی جی نے منع بھی نہیں کیا اور مجھے پتہ ہے وہ بعد میں بھی کوئی باز پرس نہیں کر سکیں گی۔ ماسی احتل کی وجہ سے میں نکاح بھی تو کر رہا ہوں"۔

"تو تو بی جی سے کہہ کر سیدھے سیدھے نکاح کیوں نہیں کر لیتا؟"

"انہوں نے کبھی میری ہاں سے جواب مانگیں گی۔ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ میری تو عمری نامکمل تعلیم، ادھورا مستقبل جانے کیا کیا خرافات اور مجھے یہ قدم ابھی سے کر رہنا ہے۔ بعد میں جو ہو سو ہو"۔ اس کے لہجے میں بالک ہٹ تھی۔ پیسے کی فراوانی اور اختیار کا زعم تھا۔ ثانیہ کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ شاید وہ چلا پڑتی مگر بی جی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ بازو سے پکڑے قریباً گھسیٹتی ہوئی وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئیں اسے بیڈ پر دھکیل کر وہ خود بھی اس کے روبرو بیٹھ گئیں۔

"اس روز تجھے اور سفیر کو ساتھ دیکھ کر مجھے ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی"۔ چند لمحے اسے گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ کسی سوچ کے سمندر سے ابھر کر بولیں۔

"محبت کرنا اور محبت ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ تیرے جیسی پاگل عمر میں یہ ہو جاتی ہے"۔ دھیمی آواز میں بولتے بولتے وہ رک کر ذرا سا مسکرائیں۔ "مجھے بھی ہو گئی

تھی''۔

''جی...!'' سوکھے گلے کے ساتھ تانیہ ہکلائی۔

''ہاں، مجھے بھی ہوئی تھی تو میں تجھے کیا کہتی؟ وہ تو میری سگی خالہ کا بیٹا تھا۔ مگر میری خالہ ایک غریب خاندان میں بیاہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے نزدیک ہی ان کا سسرالی گاؤں تھا۔ منظور اکثر ماں کو سلام کرنے کے بہانے ہمارے گھر چلا آتا۔ وہ جس مدرسے میں پڑھتا تھا ہمارا گاؤں اس کے راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی کبھار باغ میں، کھیتوں کھلیانوں میں یا پنگھٹ پر بھی ہماری ملاقات ہو جاتی تھی۔ یونہی ملتے ملاتے کب ہم محبت کے خارزار میں اتر گئے، کب ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھالیں، کب ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے کر لئے ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر جب خالہ منظور کے ایماء پر اس کی بات لے کر ہمارے گھر پہنچی تو امی نے صاف جواب دے دیا۔ آپا میری شہزادیوں کی طرح پلی بچی بیاہ کر تیرے چھوٹے سے گھر میں جائے گی یہ تو نے سوچا بھی کیسے؟ اس کے ابا تو اسے بہت اونچی جگہ بیاہنے کا سوچے بیٹھے ہیں۔ خالہ روتی ہوئی لوٹ گئی.....

''خالہ نے میری امی کی بہت بے عزتی کی ہے''۔ اگلے دن میری منظور سے ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھیں غم و غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ''ہم غریب ضرور ہیں مگر میرا مستقبل روشن ہے، اسی برتے پر اماں نے تیرا رشتہ مانگا تھا''۔ وہ بول نہیں رہا تھا، غرا رہا تھا۔

''اماں کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں منظور! میں سچ کہتی ہوں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں جان دے دوں گی، مر جاؤں گی''۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ منظور نے تڑپ کر مجھے گلے سے لگالیا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو، میں تمہیں مرنے دوں گا بھلا۔ اگر تمہیں مجھ سے چھین لیا گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ ہمیں کوئی راستہ نکالنا ہی ہوگا''۔ منظور بولا۔

''اور وہ راستہ اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ہم ان لوگوں سے دور، کہیں چھپ کر اپنی دنیا الگ بسائیں، اس ظالم سماج سے دور بھاگ جائیں''۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی۔ بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ہر شخص جوش اور ولولے سے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا پھرتا۔ انہی دنوں ابا اور بھائی صاحب نے میرا رشتہ اپنے ایک امیر بزنس مین دوست کے بیٹے کے ساتھ کر دیا۔ وہ ایک عزت دار فیملی تھی۔ سیاست میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ مگر مجھ پر منظور کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ میں نے دبے لفظوں میں اماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بھائی کی حمایت حاصل کرنی چاہی مگر وہ لوگ آنکھیں اور کان بند کئے ہوئے اپنے فیصلے میں اٹل تھے۔ منظور غریب ہونے کے باوجود میرے لئے لاکھوں میں ایک تھا۔ مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کی محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔

''سنو!'' ایک دن اس نے مجھے کہا۔ ''حالات ہماری حمایت میں جا رہے ہیں، تمہارے ابا نے اپنی دولت، طاقت اور اختیار کے بل بوتے پر میری بے عزتی کی لیکن آج جس قدر ریل پیل اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ انتظامیہ بے بس ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے میں اگر ہم دونوں کہیں دور جا کر اپنی دنیا آباد کر لیں تو کوئی ہمیں تلاش نہیں کر سکے گا''۔

کوئی راستہ نہ پا کر ایک اندھیری رات میں میں نے منظور کے ساتھ گھر چھوڑ دیا۔ ہم لوگ لاہور آ گئے اور منظور کے ایک دوست کے گھر ٹھہرے۔ جس گھر میں ہمارا قیام تھا وہ آبادی سے باہر تھا۔ چھوٹے سے گھر میں دوست کی بوڑھی ماں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ جو اونچا سنتی تھی اور اسے نظر بھی کم آتا تھا۔ پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور فسادات شروع ہوتے

ہی دوست کی ماں اپنے عزیز واقارب کے پاس کسی گاؤں میں چلی گئی۔ ابھی تک ہمارا نکاح بھی نہیں ہو سکا تھا۔ بقول منظور کے مخدوش حالات کے سبب کسی نکاح خواں کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد ایک رات منظور نے مجھ سے دست درازی کی جتنا میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اتنا ہی وہ بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر اس نے مجھے بے دست وپا کر دیا۔ اس کے بعد میں ہر رات اس کی بن بیاہی دلہن بننے لگی۔ میرا مان ٹوٹ چکا تھا محبت کے، دلہن بننے کے ارمان دم توڑ چکے تھے...... میری بھی لڑکیاں جس کو محبت سمجھتی ہیں۔ وہ مرد کے لئے ایک دل لگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ منظور جسے میں اپنا مجازی خدا مان کر اپنے ماں باپ کی عزت کو بھاڑ میں جھونک کر آنکھیں بند کئے اس کے پیچھے نکل آئی تھی۔ ابلیس نکلا وہ جو مدرسے میں پڑھ رہا تھا۔ عالم کا کورس کر رہا تھا۔ اونچی اونچی باتیں کرتا تھا۔ زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ اب سارا دن اپنے دوست کے ساتھ شہر میں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی املاک لوٹتا پھرتا۔ ایک شام وہ اور اس کا دوست کہیں سے ورغلا کر ایک لاوارث لڑکی ساتھ لے آئے۔ اس لڑکی کی چیخیں ناقابلِ برداشت تھیں مگر اس ویرانے میں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں سہمی ہوئی کمرے میں بیٹھی تھی۔ باہر صحن میں ظلم، درندگی کا کھیل جاری تھا۔

”اوئے جھورے تو یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ تیری رادھیکا تو تیرے انتظار میں پلکیں بچھائے اندر بیٹھی ہے“۔ اس کے دوست نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

”نہیں، آج میں بھی اس کے ساتھ موج مستی کروں گا“۔ منظور بھی پیئے ہوئے تھا۔

”آخر اس بلبل کو ہم نے مل کر پکڑا ہے“۔ وہ بولا۔

”تو پھر اس کو بھی باہر نکال اس میں بھی مجھے میرا حصہ دے“۔ وہ چلایا۔

"دے دوں گا.... دے دوں گا۔ ذرا میرا دل تو بھر جائے دے، آخر وہ میرے بچپن کی پہلی آرزو رہی ہے۔ میری خاندانی محبت"۔ منظور کھڑا ہو کر جھومتے ہوئے بولا۔

"ویسے یار جھورے! میں سوچتا ہوں اگر وہ تیرے خاندان کی ہے، تیرے بچپن کی آرزو ہے تو تُو اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہا ہے؟" اس کے دوست نے پوچھا۔

"ہا.... خاندان.... اس کی ماں نے میری ماں کی بے عزتی کی، اپنی بڑی بہن کو غریب کہا اس کے سسرال کو کمتر کہا۔ مجھے کنگال اور ذلیل کہا تو کون سا خاندان اور کون سے اپنے؟ مجھے اس عورت سے بدلہ لینا تھا۔ اس عورت سے جسے میں ساری عمر خالہ امی کہتا رہا۔ احترام کا درجہ دیتا رہا اور میں نے بدلہ لے لیا"۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔

منظور کا اصل چہرہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں جو یہی سوچ کر کہ منظور مجھ سے محبت کرتا ہے، اس نے جلد بازی میں اپنا حق ناجائز طریقے سے حاصل کیا ہے۔ مگر آخر میں ہوں تو اسی کی نا۔ اس کی تمام زیادتیاں سہتی جا رہی تھی۔ کیسے ان کے نشے میں دھت ہو جانے کے بعد وہاں سے فرار ہوئی۔ کیسے ٹھوکریں کھائی، خود کو انسان نما درندوں سے بچاتی ریفیوجی کیمپ پہنچی۔ یہ رنج والم کی ایک الگ داستان ہے۔ مہینوں بعد ایک بار میرے ڈی ایس پی بھائی کیمپ کے دورے پر تشریف لائے۔ اتفاقاً میرا ان سے سامنا ہوا۔ اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ جو شخصیت دورے پر آئی ہوئی ہے میرا اپنا بھائی ہے تو شاید میں ان کے سامنے ہی نہ آتی اور شاید عام دنوں میں میرا گناہ ناقابل معافی ہی ہوتا۔ بھائی صاحب مجھ سے بات کئے بغیر مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیتے۔ مگر تقسیم ملک کے وقت جس طرح کے حالات پیدا ہوئے تھے انہوں نے دلوں کو نرم کر دیا تھا۔ لوگ پاگلوں کی طرح اپنوں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ بھائی کو میں برے حالوں میں نظر آئی تو ان کا دل بھر آیا۔ میرے سارے گناہ معاف کر کے وہ مجھے گھر واپس لے آئے۔ ملک کی تقسیم کے دوران جہاں غیروں نے گھربار جلائے، عزتیں لوٹیں، خون کی ہولی کھیلی وہاں بدنیت اپنوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ وطن ہم نے بہت قربانیاں دے کر حاصل کیا اور یہ ان لوگوں کا صدقہ ہے جنہوں نے اسے اپنا جنون بنا لیا اور اس کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیا۔ اگر میں اپنی ماں کے آنچل تلے چھپی رہتی، اپنے با اختیار بھائی کی پناہ میں بیٹھی رہتی تو شاید مجھے حالات کا کچھ پتہ نہ چلتا۔ مگر میں نے ظلم و درندگی کی آگ اپنی آنکھوں سے بھڑکتی دیکھی۔ شیطان کا کوئی دین یا مذہب نہیں تھا۔ کھینچنے والے نے نہ دیکھا آنچل اپنا ہے یا پرایا۔ لوٹنے والے نے نہ دیکھا لٹنے والے کی قومیت کیا ہے۔

میری بچی! بڑوں کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، بچے نہیں جان سکتے۔ اگر میں تم پر سختی کرتی یا ڈانٹتی تو تم مجھے غلط سمجھتی۔ ویسے ہی جیسے میں نے اپنی امی کو غلط سمجھا۔ بیٹیاں اپنی اپنی قسمت لے کر آتی ہیں۔ میری امی جانتی تھیں کہ خالہ اپنی قسمت کی وجہ سے ایک اوچھے اور اخلاق باختہ خاندان میں بیاہی گئی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے میرا رشتہ انہیں نہیں دیا۔ مگر میری قسمت کہ مجھے وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑا جو خود میری بغاوت کا نتیجہ تھا۔ وقت نے مجھ پہ ثابت کر دیا کہ اماں کا فیصلہ صحیح تھا۔ سفیر کی رگوں میں خاندانی خون سہی مگر وہ ہے تو ایک لاابالی لڑکا ہی۔ بہر حال تمہارا فیصلہ میں تم پر چھوڑتی ہوں۔ ابھی بارہ بجنے میں تو کافی دیر ہے نا۔

بی جی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ثانیہ نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے بی جی کی طرف دیکھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنا سر ان کی گود میں چھپا لیا۔

☆○☆

حسِ مزاح

زندگی کی علامت ہے اور اصلاح کا بہترین ذریعہ بھی۔

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

ایک دفعہ ایک نوجوان سول انجینئر کی منگنی طے ہو رہی تھی تو لڑکے نے ضد کی کہ میں لڑکی دیکھے بغیر منگنی نہیں کرنا چاہتا لہٰذا اسے رسم و رواج کے مطابق لڑکی دکھانے کا بندوبست کیا گیا۔ لڑکی معمول سے تھوڑی زیادہ صحت مند تھی اور چہرے پر ضرورت سے زیادہ پوڈر لگا کر میک اپ کیا گیا تھا۔ لڑکی دیکھنے کے بعد جب نوجوان انجینئر سے لڑکی کے متعلق رائے لی گئی تو اس نے ان الفاظ میں جواب دیا:

''ماشاءاللہ عمارت بہت مضبوط ہے مگر سمجھ نہیں آتی کہ اتنا زیادہ فالتو سیمنٹ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔'' میرے خیال میں لڑکے نے لڑکی کی ظاہری شکل و صورت کم سے کم اور بہت مناسب انداز میں بیان کر دی تاکہ کسی مزید تفصیل کی ضرورت نہ رہے اور یہی مزاح کی خوبی ہے۔

مزاح کا چپے اور ارد گرد کے ماحول سے گہرا تعلق ہے۔ خوش باش لوگ بھیانک ماحول میں بھی مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں جبکہ پریشان طبیعت کے لوگ پُرلطف لمحات کو بھی پریشانیوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا کی ہے کہ سنجیدہ ماحول کو خوبصورت الفاظ کا روپ دے کر ماحول

کی سنجیدگی کم کر دیتے ہیں۔ تکلیف دہ حالات کو مزاحیہ رنگ میں ڈھال کر محفل کو گل و گلزار بنا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً محفل میں بہت پسند کیے جاتے ہیں اور اکثر زندگی میں کامیاب رہتے ہیں۔ مزاح کا رنگ دے کر انسان اپنے ماحول کو احسن طریقے سے خوشگوار بنا سکتا ہے۔ مزاح زندہ دلی کی علامت ہے جو حالات اور اردگرد کے ماحول سے جنم لیتا ہے۔ زندگی زندہ دلی کے بغیر بے کیف ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات پر غور کریں۔

ہمارے پہلی جماعت کے استاد صاحب مرحوم مولوی محمد اسماعیل (خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ آمین!) بڑے خوش باش قسم کے انسان تھے۔ اچھا پڑھاتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر ایک دو لگا بھی دیتے تھے مگر ان کا سزا کے لئے الفاظ کا انتخاب بڑا دلچسپ تھا۔ مثلاً جب انہیں مرغا بنانے کی ضرورت پیش آتی تو فرماتے تھے "چلو الٹی جیم ج بن جاؤ" اور ہم فوری طور پر مرغا پوزیشن میں چلے جاتے۔ کبھی کبھی صرف کھڑا ہونے کی سزا ملتی تو کہتے "اب سب الف (ا) بن کر دکھا ئیں گے"۔ بعض اوقات اس سزا کو تھوڑا مزید سخت بنانے کے لئے بستہ سر پر رکھ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا تو اس کے لئے 'کاشن تھا' "آ" یعنی بستہ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب ہم میں سے کسی کی رونی صورت نظر آتی تھی تو مرحوم فرمایا کرتے تھے "یہ کیا تم نے چھوٹی 'ی' کی صورت بنا رکھی ہے۔ کبھی کبھی ش کی طرح مسکرایا بھی کرو۔ اس وقت تو ہمیں ان الفاظ کے استعمال کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کے لئے استعمال کرتے تھے یا مولوی صاحب کی نقل اتارنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد جب کبھی ہم جماعت اکٹھے ہوتے ہیں تو مرحوم مولوی صاحب کے ان الفاظ کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے اور ماحول کے مطابق استعمال کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ اب بھی جب بھی کسی پرانے ہم جماعت کو پریشان دیکھتے ہیں تو ہمارا پہلا نعرہ ہوتا ہے "یہ کیا 'ی' کی صورت بنا رکھی ہے کبھی کبھی 'ش' بھی بن جایا کرو"۔

طنز و مزاح اصلاح کا بھی بہترین اور موثر طریقہ ہے آج کل کے دور میں خواتین میں لمبے میک اپ کا رواج آ گیا ہے جس کے لئے مردوں کو بعض حالات میں لمبے انتظار کے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ خواتین اور خصوصاً نئی شادی شدہ خواتین تیاری میں کئی کئی گھنٹے صرف کرتی ہیں جو بیچارے مردوں پر گراں گذرتے ہیں مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو شام کی کسی اہم تقریب میں جانا تھا۔ اپنی بیوی کے لمبے میک اپ کی عادت کو جانتے ہوئے خاوند نے صبح سے یاددہانی شروع کر دی کہ آج وقت پر تیار ہو جانا بہت اہم تقریب ہے۔ باس بڑا وقت کا پابند ہے۔ دیر سے جانے کی صورت میں بڑی شرمندگی ہو گی۔

گرمیوں کا موسم تھا شام کو خاوند تو وقت سے ایک گھنٹہ پہلے تیار ہو گیا لیکن بیوی کی تیاری حسب معمول مختلف مراحل سے گزرتی رہی لیکن لب پر صرف ایک ہی فقرہ رہا "بس ابھی پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤں گی تم تو خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاتے ہو"۔ خاوند نے دیکھا کہ بار بار کہنے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا اور وقت پر تیاری مکمل ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تو اس نے اپنا سردیوں کا سوٹ نکالا۔ گرمیوں کا سوٹ اتار کر وہ پہن لیا۔ بیوی نے پوچھا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے کہ سخت گرمی میں تھری پیس سوٹ؟ خاوند نے تحمل سے جواب دیا "بیگم فکر نہ کرو تم آرام سے میک اپ کرتی رہو جب تک تم تیار ہو گی سردیاں آ جائیں گی"۔

ایک دفعہ ہم چند آفیسرز ٹی روم میں بیٹھے گپ لگا رہے تھے کہ بیویوں سے ڈرنے کی بات چھڑ گئی۔ سب

آفیسرز کی متفقہ رائے تھی کہ بیوی ہمیشہ خاوند سے ایک رینک اوپر ہوتی ہے یعنی میجر کی بیوی کرنل ہوتی ہے اور کرنل کی بیوی بریگیڈیئر اور نتیجہ یہ کہ ہر شریف آرمی بیوی سے ڈرتا ہے تو ایک بنگالی آفیسر نے یہ لطیفہ سنایا۔ سابقہ مشرقی پاکستان میں سندربن کے جنگلات اور ان میں رہنے والے بنگال ٹائیگر بڑے مشہور ہیں۔ اس آفیسر نے بتایا کہ ایک دفعہ جنگل میں ٹائیگر کی شادی ہو رہی تھی جنگل کے تمام جانور اکٹھے تھے۔ ایک چوہا ان تمام جانوروں کے سامنے دوڑتا ہوا کبھی ادھر چلا جاتا اور کبھی اُدھر۔ وہ بہت خوش تھا۔ آخر کچھ جانوروں سے رہا نہ گیا تو انہوں نے چوہے سے پوچھ ہی لیا ”میاں چوہے شادی تو ٹائیگر کی ہو رہی ہے تم اتنے خوش کیوں ہو؟“ چوہے نے جواب دیا ”ٹائیگر میرا چھوٹا بھائی ہے میں اس کی شادی پر کیوں نہ خوش ہوں“۔

”ٹائیگر تمہارا چھوٹا بھائی ہے؟“ سب جانوروں نے حیرانگی سے پوچھا۔ چوہے نے تسلی سے جواب دیا ”ہاں ٹائیگر میرا چھوٹا بھائی ہے کیونکہ شادی سے پہلے میں بھی ٹائیگر ہی تھا۔“

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اتحادی ممالک کے تمام صدور اور وزرائے اعظم اکٹھے تھے۔ روس کی طرف سے صدر خروشیف گئے جو ایک بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے اور کھانے پینے کے شوقین تھے۔ ان کے مقابلے میں برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ایٹلی ایک دبلے پتلے کمزور سے انسان لگتے تھے۔ ایٹلی کو دیکھتے ہی خروشیف نے ان کی صحت کا تمسخر اڑایا۔ ازراہ مذاق کہا ”مسٹر ایٹلی آپ کی اس صحت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی معلوم ہوتا ہے دنیا میں غلے کا قحط ہو گیا ہے“۔ خروشیف چونکہ پیٹو انسان تھے جس سے تمام لیڈر واقف تھے۔ مسٹر ایٹلی نے ان کی طرف دیکھ کر تحمل مزاجی سے اس طنز کا جواب دیا ”ہاں مسٹر خروشیف آپ کی صحت دیکھ کر اس قحط کی وجہ بھی سمجھ آجاتی ہے“۔ ایک قہقہہ لگا اور محفل گلزار بن گئی۔

بعض اوقات بہت سنجیدہ حالات میں بھی مزاح اپنا کام دکھا جاتا ہے۔ عدالتی ماحول بہت سنجیدہ ماحول گنا جاتا ہے لیکن ایسے ماحول میں بھی شستہ مزاح حالات کا رُخ بدل سکتا ہے۔ ایک دفعہ قائداعظم بمبئی کی ایک عدالت میں پیش ہوئے۔ جج ایک چڑچڑا قسم کا انگریز تھا۔ کیس کافی دنوں سے زیر بحث تھا فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ قائداعظم نے اپنی بحث شروع کی ”می لارڈ“ لیکن جج کسی اور طرف متوجہ ہو گیا۔ قائداعظم کو چند منٹوں کے لئے رُکنا پڑا۔ دوبارہ بحث شروع ہوئی تو قائداعظم نے کہا ”می لارڈ!“ چڑچڑے جج نے قائداعظم کو روک کر کہا۔

”مسٹر جناح میرے دو کان ہیں میں سن سکتا ہوں یہ بار بار می لارڈ کیوں کہہ رہے ہو؟“

قائداعظم نے اُسی طرح جواب دیا۔ ”می لارڈ! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے دو کان ہیں جو سن سکتے ہیں لیکن میری پریشانی یہ ہے کہ ان کانوں کے درمیان والا حصہ خالی معلوم ہوتا ہے“۔ چونکہ عدالت کے تقدس کی

ہاتھی قوم

ہاتھی کے بچے کو پاؤں میں زنجیر ڈال کے پالا جاتا ہے۔ شروع شروع میں وہ زنجیر توڑنے کی کافی کوشش کرتا ہے لیکن پھر ہمت ہار کے چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ بڑا اور طاقتور ہو جاتا ہے تو وہی زنجیر ہوتی ہے جو وہ ہلکی سی کوشش سے توڑ سکتا، مگر ہاتھی کے دماغ میں وہی سوچ ہوتی ہے کہ زنجیر نہیں ٹوٹے گی اور وہ ساری زندگی غلام رہتا ہے۔ بالکل ہماری قوم کی طرح!

ذرا سوچیں، کیا ہم ایک ”ہاتھی قوم“ نہیں ہیں!

(شیخ فرید)

وجہ سے وہاں زور سے ہنسا نہیں جا سکتا تھا اس لئے سب سننے والوں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جج بھی اس نقطے سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے قلم اٹھایا اور فیصلہ قائداعظمؒ کے حق میں کر دیا۔

بعض مزاحیہ لطیفے ہوتے تو سچ ہیں لیکن بہت تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ ذرا اس لطیفے پر غور کریں۔ اس لطیفے کا پس منظر یہ ہے کہ مرحوم صدر جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف بنے اور انہوں نے ایک ہائی ٹیک فوجی مشق کرائی جس کا نام 'ضرب مومن' تھا۔ اس مشق کو دیکھنے کے لئے تمام دوست ممالک کے چیف آف سٹاف مدعو تھے۔ مشق کے دوران ایک غیر رسمی گپ میں ایک دوست ملک کے چیف آف سٹاف نے یہ لطیفہ سنایا۔

موجودہ دور کے سائنسدانوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس سے تمام مذاہب اور تمام اقوام کی ترقی، ترقی کی وجوہات اور خصائل کا پتہ لگ سکتا تھا۔ اس آلے کو ٹیسٹ کرنے کے بعد اس کی بین الاقوامی طور پر نمائش کی گئی۔ اس نمائش میں موجودہ دور کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی اقوام کی نمائش تھی۔ اس میں مسلمان، عیسائی، ہندو، یہودی، بدھ اور اشتراکی وغیرہ سب شامل تھے۔ اس میں دیکھا کہ کچھ قومیں بہت آسودہ حال، عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہ تھے یہودی اور عیسائی۔ باقی اقوام متوسط طبقہ میں شمار ہوتی تھیں اور ایک قوم جو بہت زیادہ مفلوک الحال، پھٹے ہوئے کپڑے، بھوکے پیٹ اور تعداد میں بھی بہت زیادہ۔ ان کے اردگرد سونے جواہرات کے ڈھیر ہیں لیکن یہ لوگ ان تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ ان میں کچھ بہت ہی موٹی توندوں والے لوگ ڈنڈے لے کر کھڑے ہیں۔ جونہی کوئی آگے روٹی کے لئے بڑھتا ہے یا ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ لٹھ بردار مضبوط اجسام کے لوگ انہیں مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس قوم کے عالم فاضل لوگوں کو بھی یہ لٹھ بردار نہیں بخشتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اردگرد کی اقوام سے بھی جس کا دل چاہتا ہے وہ آ کر ان لوگوں کی دُرگت بناتا ہے اور جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ لوگ محض شغل کے لئے بھی ان کو چپیڑیں لگا دیتے ہیں۔ ان کی زبوں حالی اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اردگرد کے لوگ انہیں روٹی دکھاتے ہیں تو یہ ایک دوسرے کو مار کر بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں یہ بھی نہیں پروا کرتے کہ ابھی ابھی تو اس شخص نے ہمیں مارا تھا یا ہماری بے عزتی کی تھی۔

سب تماشائیوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ "اتنی کثیر تعداد میں اس قدر مفلوک الحال لوگ جبکہ اردگرد زر و جواہرات کے ڈھیر ہیں اور ان میں اٹھانے کی سکت بھی نہیں تو یہ کون ہیں؟" جواب ملا کہ یہ مسلمان ہیں۔ پھر پوچھا "کہ یہ جو ڈنڈے لے کر کھڑے ہیں یہ کون لوگ ہیں؟" پتہ چلا کہ یہ اس قوم کے جاہل ملاّ ہیں۔ تیسرا سوال پوچھا گیا کہ "کیا یہ علماء دین نہیں جو ان کا ظاہری حلیہ ہے؟" "نہیں ہرگز نہیں" پھر پوچھا "ان کا کیا کام ہے؟" جواب ملا کہ "نہ یہ مسلمانوں کو اکٹھا ہونے دیتے ہیں نہ انہیں ترقی کرنے دیتے ہیں۔ انہوں نے علماء دین کو بھی بدنام کیا ہوا ہے ان کا کام مذہب کے نام پر منافرت اور انتشار پھیلانا ہے اور جب تک یہ لوگ موجود ہیں یہ قوم اسی طرح ہی رہے گی۔ باقی اقوام انہیں اسی طرح بے عزت اور ذلیل کرتی رہیں گی۔

اس لطیفے کو افغانستان اور عراق کے تناظر میں دیکھا جائے تو کتنا سچ معلوم ہوتا ہے اور یہ سچ کتنا تکلیف دہ ہے۔ مسلمانوں کی پستی، نااتفاقی، جدید ٹیکنالوجی سے محرومیت اس سے بہتر انداز میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

+*+

''اشکِ ندامت'' لکھنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ میں اپنی سوچ کو نئی نسل کے ذہن میں ڈال کر کچھ تبدیلی کی کوشش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہماری اگلی نسل کو ان مسائل کا شکار نہ ہونا پڑے۔

جو مسئلہ میں نے اس کہانی ''اشکِ ندامت'' میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ میرے آس پاس ہر چوتھے انسان کا مسئلہ ہے۔ زندگی کی اصلیت کو سمجھانے کے لئے یہ میری ایک کاوش ہے۔ یہ میرے بابا جان کی ایک سوچ ہے جس کو میں نے الفاظ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہی ہے کہ

''کسی کو اس کے چھوٹے سے نقصان کے صرف امکان کی وجہ سے عمر قید کی سزا سنا دینا تاکہ وہ اس متوقع نقصان سے بچ جائے یہ مناسب نہیں۔''

میں کوئی بڑا مفکر نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ خدا کو پانے کا سب سے آسان طریقہ اپنے ہی اندر اپنی گہرائی میں اترنا ہے اور اس کے لئے جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، وہ حاضر ہے۔

اندھیرے سے اُجالے تک

اشکِ ندامت

تخلیق کا سرچشمہ وجدان ہے اور جب یہ وجدانی قوت عشق کا پیرایہ اختیار کرتی ہے تو پھر ایک ہی جست سے زمین و آسمان کی تمام منازل کا قصہ تمام ہو جاتا ہے اور کائنات کی بے کرانی ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔

قسط: 1

☆ رمیز احمد 0331-5178929

تعلق

شام کا وقت تھا۔ شفق کی لالی میں پرندوں کو آشیانوں کی طرف رواں دیکھنے کے علاوہ ہر راستہ تاریک لگ رہا تھا۔ ایک نوعمر لڑکا اپنے گھر کی چھت پر باہر کی طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہوا دائیں طرف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر آتی اور اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتی۔ لڑکے کی نظریں سامنے ایک بہت بڑے قبرستان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہی ویران قبرستان جس میں اس کا آدھا گاؤں جا کر آباد ہو چکا تھا۔ اس کے اپنے خاندان کے کئی سربراہ اسی قبرستان میں دفن تھے۔ اس نے اپنی گود میں پڑے رجسٹر سے پنسل اُٹھائی اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

اس کے چہرے پر موجود اس کی عمر کے متقاضی معصومیت غائب ہونے لگی۔ اس کا قلم تیزی سے اس رجسٹر پر چلنے لگا۔ اس وقت کوئی انسان بھی اس کی عمر کا اندازہ نہ کر سکتا اگر اس کے چہرے پر نکلے چند نرم بال اس کی نوعمری کے شاہد نہ ہوتے۔ اس کا انداز بے باک تھا۔ وہ کسی کسی وقت قلم روک کر آنکھیں بند کرتا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔

کچھ دیر لکھنے کے بعد وہ رکا اور اسے دوبارہ پڑھنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ اس کی تحریر کو سراہ رہی تھی۔ ایک بار مکمل پڑھنے کے بعد وہ اُٹھا، سیڑھیوں کی طرف لپکا اور ایک جست میں تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا صحن میں اپنے باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا جو کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے تھے، اور وہ رجسٹر ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔

''بابا! اگر آپ فری ہیں تو اس رجسٹر میں جو کچھ لکھا ہے، وہ پڑھ کر سنائیں ناں۔ ! میرا جی چاہ رہا ہے، آپ کی آواز میں یہ سننے کو۔''

باپ نے شفقت بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں ! لاؤ، میں تو بالکل فارغ ہوں۔''

اتنا کہتے ہوئے اس کے باپ نے رجسٹر پکڑ لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

''یہ خطا کے پتلے ایک دوسرے کو شک کی تلوار سے قتل کرتے ہیں، جھوٹ کے خون سے غسل دیتے ہیں، بہتانوں کا عطر لگا کر بے رخی کے کفن میں لپیٹتے ہیں، آپ کی خواہشات کا جنازہ نکالتے ہوئے خودغرضی کے قبرستان میں لے جاتے ہیں۔ وہاں مایوسی اور تنہائی کی قبر میں اُتار دیتے ہیں۔ لیکن زیست میں موت کا اصل مزہ اس وقت آتا ہے جب آپ سے سب زیادہ قرابت داری کا دعویٰ کرنے والا انسان قبر کا آخری پتھر لاپرواہی کا رکھتا ہے۔''

اس کے باپ نے نظر اُٹھائی۔ بہت خوب ! مصنف نے زندگی اور موت کے مراحل کو کیا تشبیہ دی ہے۔ اصل میں بھی قبر کا آخری پتھر سب سے قریبی انسان سے ہی رکھوایا جاتا ہے۔

لڑکے کا چہرہ دھنک کے رنگوں سے بھرا محسوس ہو رہا تھا۔

''جی بابا ! آگے پڑھئے، ابھی اصل بات تو باقی ہے۔''

انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

''آخری پتھر لاپرواہی کا رکھتا ہے۔ اس آخری پتھر کے بعد چاہے بے وفائی کی ایک مٹھی مٹی ڈالی جائے یا ایک پہاڑ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن قبر کے اندر پچھتاوے کا ایک سانپ آپ کو اپنی لپیٹ میں لینے لگتا ہے جس کی گرفت سے سانس لینا بھی محال ہو جاتا ہے، اور ظاہرداری کے تمام رشتوں سے آپ کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے اور آپ صرف جینے کی رسم ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ

ہی اصل وقت ہوتا ہے۔ صحیح یا غلط فیصلے اور ''نور'' یا ''ظلمات'' میں سے ایک صورت کے انتخاب کا۔

پہلی صورت میں انسان اگر اس موڑ پر اپنے خالق سے مدد مانگے تو وہ بالکل خالص ہوگی، اور خلوص ہی وہ پھول ہے جو دعاؤں کو اپنی نرم کونپل پر رکھ کر قبولیت کے تمام مدارج طے کروا دیتا ہے، اور انسان اسی خلوص سے توبہ کرتا ہے۔ اس کائنات میں ایک اللہ کی ہی ذات ہے جو معافی قبول کرنے کے بعد پہلے سے زیادہ مہربان ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کا تعلق خدا سے اور مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ سکون کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ سکون ہی وہ دولت ہے جس کو خدا نے اعمال کے حساب سے بانٹا ہے اور انسان نے یقین کے جس بیج کو اخلاص کی مٹی میں بو کر آنسوؤں سے سیراب کیا ہوتا ہے، وہ ایک دن تناور درخت بن جاتا ہے۔ جس کے پھل کھا کر ساری زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ یہی ''تعلق'' اصل کامیابی ہے۔

دوسری صورت میں اگر انسان غلط زاویہ پر نکل جائے تو وہ سب کچھ ضائع کر بیٹھتا ہے۔ دو ہی انسانوں کی دنیاوی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔ ایک جس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو اور دوسرا جس کے لئے حلال اور حرام برابر ہوں۔ اس طرح کے انسان اکثر اسی ناہموار موڑ پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تعلقات کے پنجرے سے نکل کر خواہشات کی زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر پہلی صورت والوں کی نسبت جلد حالت سکون میں آ جاتے ہیں لیکن اتنا ہی جلدی ان کو ہوس کا شیطان جکڑنے لگتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ شیطان کی آنت بنتا جاتا ہے۔ پھر انسان کو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تو وہی سراب ہے جو دور سے ٹھنڈا بہتا ہوا پانی محسوس ہوتا ہے۔ پر قریب آنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ تو وہ تپش تھی جس کو زمین نے بھی اپنے اندر پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور انسان اس کو اپنے اندر اتارے ہوئے تھا۔

یہاں انسان کو رشتوں کی قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ جن جسموں کے سروں کو کچل کر وہ وہاں تک پہنچا ہے، آج انہی جسموں کے کندھے اس کو رونے کے لئے درکار ہیں۔ یہاں سے ایک بار پھر وہی کٹھنائیوں کی مسافتیں شروع ہوتی ہیں اور انسان ایک بار پھر اپنے آپ کو دوراہے پر پاتا ہے۔ اب یا تو وہ پہلا راستہ اختیار کرتا ہے یا اپنے پاس پہلے سے موجود خودغرضی کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ کر اسی شیطان کے تلوے چاٹتے ہوئے خواہشات کے درندے کو پالتے پالتے اپنی دنیا اور آخرت دونوں خراب کر بیٹھتا ہے۔ یہی لاتعلقی اصل ناکامی ہے۔''

اس کا باپ مکمل پڑھتے پڑھتے اکتا چکا تھا۔

''یہ اچھا اقتباس نکالا، وکیمو زندگی کا گر ہے یہ۔ کہاں سے لیا تم نے..... ؟ کسی کتاب کا حصہ لگ رہا ہے۔''

باپ کی آواز سن کر لڑکے کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''بابا..... یہ میں نے ہی لکھا ہے۔''

باپ کے چہرے کی وہ لالی جو شفق لگ رہی تھی، خوفناک کالی رات میں تبدیل ہو گئی۔

لڑکے نے تھوڑی دیر پہلے تک آسمان پر پھیلی ہوئی لالی کو تلاش کرنے کی کوشش کی، پر وہ موجود نہ تھی۔

باپ کی کرخت آواز لڑکے کے کانوں کے پردے کو دہلاتی ہوئی گزری۔

''میں بہت دنوں سے تمہارے امتحانات میں کم نمبر آنے کی وجہ تلاش کر رہا تھا۔ اب میں سمجھا، تمہارا اپنی کتابوں کی طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ یہ تمہاری عمر کے لڑکوں کے کرنے کے کام ہیں..... ؟ اگر تم بائیولوجی کے لیکچر میں بیٹھ کر مابعد الموت کے موضوع پر سوچو گے تو نمبر تو کم آئیں گے ہی۔ یہ سب چیزیں ثانوی ہیں۔ ان سے

کچھ نہیں ملتا۔ دنیا میں جینے کے لئے پڑھنا پڑتا ہے۔ گریڈز لینے پڑتے ہیں، یہ Competetion کا دور ہے۔

تمہارے جیسے 52 فیصد نمبر لینے والے بچے ہمیشہ ماں باپ کے لئے شرمندگی کا باعث بنتے ہیں۔ دیکھو کل مجھے شرمندگی سے بچنے کے لئے اکبر صاحب کو تمہارے 82 فیصد نمبر بتانے پڑے۔ مجھے تمہارے کم نمبروں کی وجہ کا پتا لگ جاتا تو اتنی شرمندگی اور جھوٹ سے بچ جاتا۔ اب دھیان رکھنا، کہیں اکبر صاحب سے بات ہو، تو ان کو اصل نمبر مت بتا دینا۔''

''جی بابا''

اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''اب جاؤ اندر سے مجھے بلڈ پریشر والی گولیاں لا کر دو، بلاوجہ پارہ چڑھا دیتے ہو۔ پتا نہیں کب ان کی طرف سے کوئی اچھا رزلٹ سننے کو ملے گا۔ کتنے خوش نصیب والدین ہوتے ہیں جن کے بچے بورڈ میں پوزیشن لیتے ہیں۔''

وہ اندر سے بلڈ پریشر کی گولیاں لے آیا۔ اس نے پانی کے ساتھ دوا پیش کی۔

''بابا! میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس وہ لکھتا گیا جو مجھے اچھا لگا، تو آپ کو دکھا دیا۔''

اس نے شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ دوا لے کر باپ کا غصہ کچھ کم ہوا۔

''بیٹا! دیکھو اب لکھنے میں تو تمہیں 30 منٹ ہی لگے ہوں گے، پر اس میں ہر ہر بات جس وقت تم نے بیٹھ کر سوچی ہے، وہ وقت تمہاری پڑھائی کا تھا۔ اس سارے وقت میں تم نے اپنی ساری توجہ اپنے مضامین کو دی ہوتی تو تمہارے اچھے نمبر آتے۔ سائنس کے مضمون ٹائم مانگتے ہیں۔ تم جانتے ہو ناں، تمہاری فیس کا کتنی مشکل سے اہتمام کرتا ہوں میں اور اتنی محنت کا یہ صلہ ملتا ہے کہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو تمہارے نمبر بھی جھوٹ بتانے پڑیں۔ اب جاؤ، اندر جا کر پڑھو۔ آئندہ میں کورس کی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب نہ دیکھوں تمہارے ہاتھ میں۔''

جاذب کے ساتھ یہ پہلا معاملہ نہیں تھا جب اس کو اپنی ہر جائز خواہش کو مار کر اچھے نمبر لانے کی تلقین کی گئی تھی۔ ایسا ہر موقع پر ہوتا آیا تھا۔

اس کی سوچ کا ایک طوفان تھمتا تو دوسرا سر اٹھا لیتا۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کیا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے اندر ایک سیلاب روکے ہوئے ہے، پر وہ زیادہ دیر اس میں کامیاب نہ رہ سکا اور وہ سیلاب اس کی پلکوں کے بند کو توڑتا ہوا اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے پر ایسے بہنے لگا جیسے بہت عرصے سے سوکھی بنجر زمین پر کوئی چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ اس کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت تو بچپن سے ہی تھی لیکن اپنے دل کی بات باہر نہ نکال پانے کی وجہ سے یہ عادت طول پکڑتی جا رہی تھی۔

اگر کوئی اس کے کمرے میں اس کو اکیلا دیکھ لیتا تو ضرور اس کو پاگل سمجھتا۔

اب وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑے شیشے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اپنے عکس سے ایسے مخاطب ہوا جیسے وہ عکس نہیں، کوئی دوسرا انسان ہو۔

''کیا مجھے اپنے آپ سے نفرت کرنی چاہئے کہ میں اپنے بابا کے بنائے ہوئے معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔۔؟ کیا مجھے اپنے اندر کے جاذب کو مار دینا چاہئے۔۔؟''

لہجہ بدلتے ہوئے۔

''ہاں شاید۔۔! کیونکہ یہ دونوں ایک جسم میں نہیں رہ سکتے۔ یا تو آگ کو اس پانی نے بجھا دینا ہے یا اس پانی نے اس آگ کی حدت سے بھاپ بن کر اڑ جانا ہے۔

کسی ایک کو تو مرنا ہی ہوگا۔"

"پر کس کو؟"

"بابا کا تم پر تم سے زیادہ حق ہے۔"

"او یہ فیصلہ تو بہت آسان تھا۔"

"فیصلہ تو آسان تھا، پر عمل کرنا آسان نہ ہوگا۔ اپنے وجود کو اپنے وجود سے جدا کرنا ہے۔ روح نکلنے جیسی تکلیف ہوگی اور روح نکلنے کے بعد سب ختم ہو جاتا ہے۔"

"ہاں ... اور تو ہے، پر کوئی بات نہیں، میرے بابا تو مجھ سے خوش ہوں گے ناں ... اویسے بھی انہوں نے ایک عمر گزاری ہے۔ وہ کہتے ہیں تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ شاید یہی اصل زندگی ہو اور میں اپنی کم عقلی کی وجہ سے سمجھ نہ پا رہا ہوں۔"

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جاذب نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا اور دروازہ کھولا۔ باہر کلثوم کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کھانے کا ایک ٹرے اور لب پر ایک دھیمی سی ممتا بھری مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے کھانا میز پر رکھا اور ساتھ بیٹھ گئیں۔ جاذب بھی سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے نوالہ توڑا اور جاذب کے منہ میں ڈالا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں

"بیٹا ... ! تم جانتے ہو تمہارے بابا تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔"

جاذب نے ان کی نظروں سے نظریں بچاتے ہوئے سر جھکا کر جواب دیا۔

"جی امی ... ! مجھے پتا ہے۔"

"ان کو تمہارے فیوچر کی بہت فکر ہے۔"

انہوں نے بتاتے ہوئے کہا۔ جاذب نے تلخی انداز میں سر اٹھایا۔

"پر امی ... ! وہ مجھے پیار سے بھی تو سمجھا سکتے تھے۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں بیٹا ... !"

کلثوم نے فکرمندی سے کہا۔

"ہاں جی ... ! اور اس طبیعت کا ذمہ دار بھی تو میں ہی ہوں۔"

"میں نے ایسا کب کہا ... ؟"

کلثوم نے حیرانی سے پوچھا۔ جاذب کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

"آپ نے نہیں امی ... انہوں نے خود کہا۔"

قبولیت (3 سال بعد)

یہ سردیوں کی ایک خنک رات تھی۔ اس کا اپنے کمرے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کشش اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس کا جی متلا رہا تھا۔ آخر سونے کی بار بار ناکام کوشش سے تنگ آکر اس نے بستر چھوڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں ارتعاش تھا۔ جس طرح ریڈیو کے سگنل کبھی آ رہے ہوں اور کبھی جا رہے ہوں، اسی طرح اس کے دماغ میں آوازیں کبھی بالکل واضح ہو جاتیں، کبھی بالکل غائب ہو جاتیں۔ وہ ان آوازوں کو بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اس کی بڑھی ہوئی شیو اور بے ترتیب کپڑے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کو زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے سر میں بہت درد تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر کیوں آیا ... ؟ اس نے اپنے گرد ایک بڑی سی شال لپیٹ رکھی تھی۔ طرح طرح کے خیالات دماغ کو اور ذہن کو منتشر کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ سرد ٹھنڈ دینے والی ہوا میں بھی اس کا جسم سرد نہیں تھا۔

وہ اپنے آپ کو اپنے ہی قدموں کے پیچھے چلتا ہوا

محسوس کر رہا تھا۔ ایک ویران علاقے میں پہنچ کر دور سامنے اسے ایک مدہم سی روشنی دکھائی دی۔ اس نے وہاں غور کیا تو اس کو لگا کہ اس وہ آواز اسی طرف سے آ رہی ہے۔

حالانکہ وہ روشنی بہت دور تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے ابھی تک اپنے پاؤں نہیں روکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ہپناٹائز (Hipnotise) ہو چکا ہے اور اسی ہپنوسس (Hipnosis) کے اثر میں چلتا جا رہا ہے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد وہ وہاں پہنچا تو دیکھا۔ ایک پرانی درگاہ ہے جس کے گرد کچا سا برآمدہ اور صحن چھوڑ کر چار دیواری بنائی گئی تھی۔ اس نے دروازے سے جھانکا۔ اندر برآمدے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک سفید ریش بزرگ ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان بزرگ کا نورانی چہرہ اندھیرے میں بھی چاند جیسا تھا۔ اس نے اس لکڑی کے دروازے میں قدم رکھا۔ دروازہ شاید کبھی کسی کے لیے بند نہیں ہوا تھا۔

جب وہ قریب پہنچا تو اس کے کانوں میں ان بزرگ کی آواز پڑی۔ وہ حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ سے دو اشکال غائب ہو گئیں۔ کیونکہ یہ وہی آواز تھی جو اسے پورے راستے سنائی دیتی رہی تھی۔ پر اس وقت وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ وہ کبھی آتی اور اس کے تجسس کو بڑھا کر غائب ہو جاتی۔ وہ سب کے جوتوں میں اپنے جوتے اتار کر برآمدے میں داخل ہوا۔ اس کا دل اس کے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ بابا جی نے نظریں اس کی طرف اٹھائیں اور بہت ہی ٹھہراؤ کے ساتھ بولے۔

"جاذب بیٹا...! آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

وہ اس سے منسوب اپنا نام سن کر ششدر ہو گیا۔ رات سے... اور بیابان سے اس موسم میں اس کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔

وہ بہت کچھ بولنا چاہتا تھا، بہت سے سوال تھے، پر سب حلق میں اٹک گئے۔ بابا جی نے اس کی حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا...! تھک گئے ہو گے۔ ہم جو بات پہلے کر رہے تھے، اس کو مکمل کر لیں، پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔"

جاذب کے لب جیسے کسی نے سی دیے تھے۔ وہ چاہ کر بھی انہیں کھول نہ پایا اور برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گیا۔

بابا جی نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ان کی آواز میں بہت مٹھاس تھی۔

"ہاں تو بچو...! میں کہہ رہا تھا کہ ہم جو بھی سوچیں، وہ ہو سکتا ہے۔ بس سوچ کی تکمیل ضروری ہے۔ جب بھی تم کوئی کام کرنا چاہو، اس کے بارے میں خالص عقیدہ رکھو کہ یہ ہو کر رہے گا تو وہ ضرور ہوتا ہے۔ اصل میں روح جو چاہتی ہے وہ ہوتا ہے ضرور ہوتا ہے۔ بس روح کے گرد ہم نے ہوس، خطا اور اس خاکی جسم کی خواہشات کے پردے چڑھا رکھے ہیں۔

جو اس "نور" کے "کن" کو باہر نہیں نکلنے دیتے وہ "فیکون" کے مرحلے تک نہیں پہنچ پاتے۔ تم نے سنا ہی ہوگا کہ جنت میں جو سوچا جائے گا، وہ اسی وقت حاصل ہو جائے گا۔ یہاں بھی وہی قوانین ہیں۔ لیکن وہاں پردے ہٹا دیے جائیں گے، اور سوچو، اگر کوئی اس دنیا میں وہ پردے ہٹا لے تو کیا کیفیت ہو... روح تو اب بھی ہمارے پاس ہے۔

یہی ثابت ہوا بچو...! جس نے یہ نفسانی خواہشات کے پردے ہٹا لیے، جو اپنی روح کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا اس نے "کن فیکون" کو...

[illegible]

تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ ہر طرف وہی تو جلوہ فرما ہے۔

خواہش نکال دو، باقی سب اللہ ہی اللہ۔ خواہش ختم ہونے کے بعد جہاں نظر اٹھے، خدا کا دیدار ہے۔ کیونکہ یہ تماشہ بھی وہی ہے اور وہ خود ہی تماشائی بھی۔ کھیل بھی وہی ہے اور وہی کھلاڑی بھی، ہم بھی وہی ہیں۔ اس سمجھ کی حد ہے نہیں۔ ہم یہ جسم تو نہیں ہیں، ہم تو روح ہیں۔ یہ جسم ہمارے لئے تھا، ہم اس خاک کے پتلے کے لئے کیوں ہو گئے ...''

''یہ ذات پرستی مٹی کے پتلے کو پوجنے کے علاوہ کس اور شے کا نام ہے ... ! ہم روح کے مالک ہیں، جسم کے غلام کیوں ہو گئے ... ؟ آپ لوگ جانتے ہیں، جب آدم علیہ السلام کا جسم بنایا گیا تو وہ کافی عرصہ ایسے ہی پڑا رہا۔ لیکن جب اس کے اندر روح پھونکی گئی تو اسی وقت خدا نے تمام مخلوق کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دے دیا۔ مطلب سجدہ روح کو تھا، جسم کو نہیں، اور شیطان کو بھی وہی نفس لے ڈوبا جو آج ہمیں خدا سے ملنے نہیں دیتا۔

اگر منزل کی طرف سفر کرنا چاہتے ہو تو یقین کے گھوڑے کو بے نیازی کی خوراک دے کر اسے طاقتور بناؤ۔ اس گھوڑے پہ بیٹھ کر سفر کا پتا بھی نہیں چلے گا اور اگر خواہشات کی نیاز مندی کا زہر دے کر گھوڑے کو مار ڈالا تو اپنی عقل کی ناتواں ٹانگوں پہ سفر کرتے کرتے تھک جاؤ گے، پر منزل نہیں ملے گی۔''

جاذب بابا جی کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے راز کھولے جا رہے تھے، بہت سے پردے اٹھائے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھا اور اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

معراج بابا اب لوگوں کے سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہاں زیادہ تر نوجوان لوگ ہی تھے۔ جاذب دنیا کے اس رخ کو دیکھ کر حیرت سے باہر نہیں آ پا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کو بابا جی کی شفیق آواز سنائی دی۔

''آؤ جاذب بیٹا...... ! حجرے میں چلتے ہیں۔''

جاذب نے ابھی تک منہ نہیں کھولا تھا۔ وہ ان کے پیچھے چلتا ہوا ایک کچے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر دو چارپائیاں تھیں، زمین پر صرف تکیے پڑے ہوئے تھے۔ بابا جی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک کونے میں پڑے مٹی کے گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی نکالا اور لاکر اسے دیا۔ اس نے پانی پکڑا اور سینے کے اندر کے جلتے کوئلوں پر پانی ڈالنے لگا۔ پانی پی کر اس کو بہت راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ معراج بابا اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''بیٹا ... ! تمہاری دعا قبول ہوئی ہے۔''

اب کی بار وہ زیادہ حیران نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا۔

''بابا جی ... ! آپ کون ہیں ... ؟ اور اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہیں ... ؟''

انہوں نے مسکرا کر جاذب کی طرف دیکھا اور اوپر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''میں اس کا ایک ادنیٰ غلام ہوں اور کچھ نہیں جانتا۔ بس حکم کے تابع ہوں۔''

اس نے انہیں غور سے دیکھا اور سینے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میں ... مجھ پہ عنایت کیسے ... ؟''

انہوں نے پھر ایک مسکراہٹ دی۔

''خدا تو انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی سچے دل سے اس سے اس کو مانگے اور وہ اس کو اپنی راہ دکھائے۔ پر ہم لوگ اس سے اس کے علاوہ سب کچھ مانگ لیتے ہیں

حالانکہ باقی سب چیزوں تو مانگے بغیر بھی ملتا ہے۔"

اس نے سوچا کہ ان کی باتیں عبدالرحمٰن صاحب سے کتنی ملتی ہیں۔ اس کا ذہن سوالوں سے خالی نہیں ہو رہا تھا۔ بابا جی کچھ سوچ کر بولے۔

"بیٹا... ! تم تو پہلے ہی جاذب احمد ہو، جو احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جاذب نظر ہو، اس کی تو کیا ہی بات ہے۔ چلو اب سو جاؤ۔ بچھ دیر آج سے یہی تمہارا بستر ہے۔ تہجد میں اٹھ کر باتیں کریں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ لیٹ گئے اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ جاذب بھی لیٹ گیا پر نیند اس سے ناراض تھی شاید۔

فیصلہ

اتوار کا دن تھا۔ پہاڑ کے دامن میں بنے ایک گھر میں سے وہ نکلا۔ اس کے کندھے پر کالے رنگ کا شولڈر بیگ تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ عام طور پر اس موسم میں بادل ناراض ہی رہتے تھے، پر آج شاید کسی کے آنسوؤں کو بارش میں ملا کر چھپانا بہت ضروری تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ کبھی وہ کچھ سوچ کر تیز ہو جایا کرتا تھا اور کبھی پھر اس کا دل اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے لگ جاتا۔ یہ دل اور دماغ کی جنگ تو ازل سے ہی حساس لوگوں کا مقدر رہی ہے۔

آج سے پہلے جب بھی اس طرح کی ہوا اس کے کانوں کی لو چھو کر گزرتی تھی تو اس نے دماغ کو تازگی بخشی تھی اور بارش کی بوندوں اور مٹی کے ملنے سے پہلے ان کے ملاپ کی خوشبو اس کو اپنی سانسوں میں محسوس ہوتی تھی لیکن آج ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا کہ بھرے موسم سے تو لگتا ہے اگر انسان اداس ہو تو کھلی ہوئی دھوپ میں بھی اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔

لیکن اگر اندر چہرے سے ہٹ کر جکڑ دیا جائے تو پہلی بارش کی نرم بوندیں بھی شعلوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں اور انگاروں کی طرح اثر کرتی ہیں۔ اب وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ وہ وہاں اتنی بار آ چکا تھا کہ اب پہلی نظر میں پہاڑ کے دامن میں موجود گھروں میں سے اپنا گھر ڈھونڈ لیتا تھا، جو اونچائی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے۔ گھروں کی چھتوں پر بہت سے لوگ موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کسی کو خبر نہیں تھی کہ ساتھ والے پر کیا بیت رہی ہے... اور کسی کو خبر رکھنے کا اشتیاق بھی نہیں تھا۔ ہر انسان اپنی دھن میں مگن اپنی ترقی کا زینہ ڈھونڈ رہا ہے۔ چاہے وہ زینہ کسی کا سینہ ہی کیوں نہ ہو... اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ بس انسانوں کو ترقی سے غرض ہے۔ اس جھوٹی ترقی نے انسانوں میں سے انسانیت نکال لی ہے۔ کم ظرفی عام ہو چکی ہے، اب تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ بس ترقی کرنی ہے چاہے زینے والا سینہ بیٹے کا ہی کیوں نہ ہو۔

اس نے بیگ نیچے رکھا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر اپنے آپ سے ہم کلام ہوا۔

"کیا میں ٹھیک کر رہا ہوں... ؟"

پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"تو یہ تمہارا اپنا ہی تو فیصلہ تھا، اب سوچتے کیا ہو... ؟"

"ہاں... ! فیصلہ تو اپنا ہی تھا، پر... "

پھر جیسے کسی خیال کو جھٹکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر بیگ اٹھایا، اسے کھول کر اس میں سے ڈھیر سارے صفحات نکالے جن پر کافی تحریریں لکھی ہوئی تھیں۔ ان میں بیشتر تحریریں وہ تھیں جو اس نے اسی پتھر پر بیٹھ کر سب کی نظروں سے چھپ کر وقتاً فوقتاً لکھی تھیں۔ بادل مزید کالے ہوتے جا رہے تھے۔ آسمان سے ایک آواز نے

رہی تھیں جیسے بادلوں کو غصہ آرہا ہو۔ اس نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا اور سامنے پڑے صفحات کو کانپتے ہاتھوں سے آگ لگانے لگا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے دل کی آواز آج ساری کائنات میں گونج رہی ہے کہ آج کے بعد صرف میرے بابا کا جاذب زندہ رہے گا۔ آسمان پر زوردار گرج سے بجلی چمکی اور تیز پھوارے نے اس ننھے شعلے کو بجھا دیا جو ان صفحات کو نگل کر بڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا، پر بادلوں کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ وہی پانی جو آگ کو ٹھنڈا کر رہا تھا، اپنے ساتھ تحریر بہا کر لے جانے لگا۔

وہ تحریر صفحات سے تو بہت آسانی سے دھل رہی تھی، پر اس کے دل سے شاید کوئی ناخنوں سے کھرچ کر اتار رہا تھا۔ اس کے دوست بادل جن سے وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا، اس کے دل کو بچانے میں بے شک کامیاب نہ ہوئے ہوں، پر اس کے آنسوؤں کو وہ بخوبی پونچھ رہے تھے۔

جاذب کو خوشی تھی کہ اس کے دوستوں نے کم از کم اس کی مدد کرنے کی کوشش تو کی۔ وہ ان بھیگے ہوئے صفحات کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا اٹھا۔ اس کے لئے انہیں چھوڑ کر جانا بہت مشکل تھا، پر وہ پہلے زیادہ وزنی قدم اٹھا چکا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بارش میں بھیگتے ہوئے راہوں کے گزرنے کی وجہ سے بنے رستوں میں سے گزرتا ہوا پہاڑی سے اترنے لگا۔ اس کا بیگ اور دماغ دونوں خالی تھے، پر بیگ پہلے سے ہلکا اور دماغ پہلے سے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو ہوش میں لاتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا اب مجھے مجھ سے چھٹکارا مل چکا ہے.....؟“

دولت (3 سال بعد)

رات کچھانے کا فی وقت بیت چکا تھا۔ معراج بابا اور باقی دنیا اپنی آدھی نیند بھی پوری کر چکے تھے۔

جاذب درگاہ کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس کا لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ حجرے کو چھوڑ کر باہر آ بیٹھا تھا۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھا رہا پھر چاند پر غور کرنے لگا۔ آج چاند تقریباً مکمل تھا۔ ہلکے ہلکے بادلوں کے پار وہ چاند جیسے شرما رہا ہو، پر چالاک وار بادلوں کے پیچھے چھپ بھی نہ پا رہا ہو۔

وہ جب بھی چاند کو غور سے دیکھتا تو اسے زینب یاد آتی۔ کیونکہ وہ فون پر رات کو جب بات کیا کرتے تھے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سے چاند کو دیکھ کر اس کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ بات شاعری سے ہوتے ہوئے سائنس میں چلی جاتی تھی۔ زینب ہمیشہ کہا کرتی تھی۔

”جاذب..... ادب سے سائنس کا کیا تعلق ہے.....؟ آپ ہمیشہ دونوں کو مکس کیوں کر دیتے ہیں.....؟“

جاذب ہمیشہ کوئی الٹا ہی جواب دیتا تھا۔

”سائنس بھی ایک ادب ہے اور ادب کی بھی ایک سائنس ہے۔ پتا نہیں لوگوں نے یہ الگ کیوں کر ڈالے ہیں.....؟“

زینب کو بے تکی باتیں کر کے تنگ کرنا جاذب کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ پرانی باتیں سوچ کر جاذب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، وہ ابھی جائے اور زینب کو سب کچھ بتا دے، پر وہ مجبور تھا۔

”یا خدا.....! یہ کیسی مجبوری ہے.....؟ یہ کون سا امتحان ہے.....؟ تو ہر چیز چھین کر مجھے سب کچھ دے بھی رہا ہے۔ تیرے بھی عجیب راز ہیں، پر میرا یہ سفر کب مکمل ہوگا.....؟ میں تھکن سے چور ہوں۔ یا خدا.....! اپنی فکر نہیں ہوتی۔ سوچتا ہوں میرے سب جاننے والے کیسے ہوں گے.....؟ پتا نہیں زینب میرے بارے میں یہ سوچتی ہوگی.....؟ اس کو جلد سے جلد مجھ سے آزاد ہونے کی ہمت عطا فرما۔“

قریب سے معراج بابا گزرے۔ انہوں نے اس کے چہرے کو پرانے صحراؤں کی خاک چھانتے ہوئے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اس سے دوبارہ وہ پرانی باتیں نہیں دہرانا چاہتے تھے۔ وہ اس کے قریب آئے تو جاذب فوراً کھڑا ہو گیا۔ معراج بابا نے اس کو گلے لگا لیا۔ جاذب کو ان سے مل کر بہت راحت محسوس ہوئی۔ وہ دھاڑیں مار کر رونا چاہتا تھا۔ پر اب اس نے رونے پر بھی مکمل اختیار سیکھ لیا تھا۔ مشکلات انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہیں۔

معراج بابا کے ذہن میں اس کی سوچوں کو منتشر کرنے کی ترکیب آ چکی تھی۔ انہوں نے جاذب کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"جاذب بیٹا.... ! آج تم درس دو گے۔ میرا آج جی نہیں چاہ رہا۔"

وہ انکار کرنا چاہتا تھا، پر اپنے پیر و مرشد کو انکار کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ بابا جی اتنا کہتے ہوئے حجرے میں چلے گئے۔ برآمدے میں لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ جاذب نے اپنی چادر ٹھیک کی اور پھر ان لوگوں میں بیٹھ گیا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے....؟ آخر اس نے بات کا آغاز کیا۔

"آج معراج بابا نہیں آ پائیں گے۔ انہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔ میں کچھ سوچ کر نہیں آیا کہ کیا بات کروں....؟ کیونکہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آج درس میں دوں گا۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ میں سے کوئی سوال کرے۔ میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

وہ سب لوگ جاذب کو پہلے درگاہ کے مجاور کے اعتبار سے جانتے تھے۔ ان میں سے ہی ایک آدمی کہنے لگا۔

"ہم لوگ یہاں زیادہ تر روح کی پاکیزگی کی بات کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں، روح کا آنکھوں سے کیا تعلق ہے....؟"

جاذب نے غور سے اس کو دیکھا، پھر اپنے دماغ کو کھنگالا، پر اس سے ملتی جلتی کوئی چیز نہ ملی۔ آخر اس نے کچھ سوچوں کو اکٹھا کرتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا اور کلام شروع کیا۔

"دیکھئے، ہر ایکشن (Action) کا ایک Expression ہوتا ہے۔ یعنی ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس کو کرتے وقت ہمارے چہرے پر مخصوص تاثرات ہوتے ہیں اور اگر ہم ایک کام بار بار کرتے ہیں تو اس کام کے لئے مخصوص Expression کروانے والے پٹھے بار بار کھچنے کی وجہ سے کچھ تناؤ میں رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر وقت غصے میں رہنے والا انسان اگر کسی وقت غصے میں نہ بھی ہو تو اس کے چہرے کے غصہ دکھانے والے پٹھے کچھ تناؤ میں رہتے ہیں۔ تھوڑا سا عقل مند انسان اس کو عام حالت میں بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ غصہ کرتا ہے۔

اور آپ جانتے ہیں چہرے کے 80 فیصد تاثرات ہماری آنکھوں میں ہوتے ہیں۔ اب جو کام ہم اکیلے میں کرتے ہیں، وہ ہمارا اصل ہوتے ہیں۔ وہ ہماری روح کی مضبوطی یا کمزوری کے ضامن ہوتے ہیں، اور اکیلے میں کئے ہوئے کام بھی پٹھوں (مسلز) میں تناؤ چھوڑتے ہیں۔ اب وہ تناؤ اچھے Expressions کا بھی ہو سکتا ہے جو کہ روحانی مضبوطی کا ثبوت ہے اور برے Expressions کا بھی ہو سکتا ہے جو کہ روحانی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر آنکھ کو پڑھ لیا جائے تو روح کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہیں۔

اور ہاں....! یہ آنکھیں دوسری آنکھوں کو پڑھنا بھی بخوبی جانتی ہیں۔ چاہے آپ نے اس کی کوشش کی ہو یا نہ کی ہو۔ کئی دفعہ آپ نے غور کیا ہوگا۔ کسی انسان سے

آپ کی پہلی ملاقات ہے، آپ اسے جانتے تک نہیں، پر آپ کو اس سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے یا وہ اچھا لگتا ہے۔ یہ آپ کی آنکھیں ہیں جو اس کی روح تک بھانپ چکی ہیں، پر وہ سارے Expressions کو پڑھ کر Subconcious (نیم شعوری، تحت الشعور) میں بھیجتی ہیں۔ جس کے مطابق ہم محسوس تو کرتے ہیں، پر ہم اس کی وجہ نہیں جان پاتے۔ ہمیں نہیں پتا ہوتا کہ ہم کیوں نفرت کر رہے ہیں۔

اگر کوئی انسان محنت کر کے اپنی آنکھ اور Subconcious کے درمیان میں پہنچ جائے تو کسی انسان کی خوبیاں، خامیاں اور روحانی مضبوطی پہلی نظر میں جان سکتا ہے۔ ہمارے بہت سے بزرگ اور ولی اس کام میں بہت آگے ہوتے ہیں۔ وہ بس ایک نظر کرم ڈالتے ہیں اور سب کچھ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کو تبدیل کرنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔"

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"سبحان اللہ...!"

جاذب کو اپنی بات ختم کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ سائنس میں چلا گیا تھا، پر لوگوں کی توجہ دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہاں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ اور باشعور انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ جاذب نے بولنا بند کیا تو فوراً ہی ایک بجھے ہوئے چہرے والا لڑکا بولا۔

"میں ہر ایک سے بلاوجہ لڑتا ہوں۔ میرا اپنے آپ پر کنٹرول نہیں ہے۔"

جاذب نے مسکرا کر مختصر جواب دیا۔

"جو اپنے آپ سے جنگ جیت لے، وہ کسی سے نہیں لڑتا۔ جو اس دنیا میں اپنا مقام سمجھ جائے، وہ کسی سے نہیں لڑتا، اور سب سے بڑھ کر جو خود احتسابی کی عادت ڈال لے، وہ کسی سے نہیں لڑتا۔"

بات کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک

ڈوب جانے دو

دو دوست کشتی پر سوار تھے، ایک نے کہا۔

"یار کشتی ڈگمگا رہی ہے، ایسا نہ ہو ڈوب جائے"۔

دوسرا دوست۔ "ڈوب جانے دو یار! کمبخت نے کرایہ بھی بہت لیا ہے۔"

آواز آئی۔

"سکون چاہئے مجھے، میں کہاں تلاش کروں اسے...؟"

جاذب نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی مخلوق میں سکون بانٹو، وہ تمہیں سکون دے دے گا۔ لوگوں کی مدد ہی بہترین ذریعہ ہے سکون کا۔

اور ایک بات یاد رکھنا۔ مالی مدد سب سے آسان کام ہے اور پھر بھی اگر مالی مدد ہی کرنا چاہو تو اس مال سے وہ چیز خرید لو جس کی تمہیں سب سے زیادہ خواہش ہے اور اسے وقف کر ڈالو خدا کی راہ میں۔ اصل میں یہ سکون پیدا ہی خواہش کرتی ہے۔"

وہ آدمی دوبارہ بولا۔

"یہ دولت کی اتنی بے ربط تقسیم کیوں ہے... کئی برے لوگوں کو اتنا زیادہ دے دیا ہے اور کئی پارسا بھوکے مر رہے ہیں۔"

جاذب کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ آئی۔

"دنیا ایک امتحان ہے۔ کسی سے لے کر آزمایا جا رہا ہے اور کسی کو دے کر آزمایا جا رہا ہے۔

لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں، دولت کی تقسیم بے ربط نہیں ہے۔ اصل دولت سکون ہے اور ہم ڈائریکٹلی (Directly) یا ان ڈائریکٹلی (In Directly) اسی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور یہ اعمال کے حساب سے

ہی بانٹی گئی ہے۔ یہ تو خدا کی مخلوق کی خدمت میں چھپی ہوئی ہے اور ہم بھی اسے عہدے میں تلاش کرتے ہیں اور کبھی پیسے میں۔

یاد رکھنا، پیسے سے زیادہ سکون کے پیچھے بھاگو گے تو زندگی میں پچھتاوے بہت کم آئیں گے اور پچھتاوے انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔"

جاذب عادی ہو چکا تھا کہ وہ لوگوں کو سوچوں میں چھوڑ کر آگے چلا جائے، پر آج وہ باتیں واضح کرنا چاہتا تھا۔

"اگر کامیابی بادشاہت یا خزانہ ہوتی تو فرعون اور قارون کامیاب ہوتے لیکن بات وہاں ہی آتی ہے۔

سکندر خوش نہیں لوٹ کر دولت زمانے کی
قلندر دونوں ہاتھوں سے لٹا کر رقص کرتا ہے"

جاذب کی باتوں سے محفل جھومنے لگی۔ ایک آدمی نے پھر سوال کیا۔

"چھوٹے پیر صاحب! اپنے آپ کو پہچانا کیسے جائے؟"

جاذب کو یہ سوال تھوڑا عجیب سا لگا، پر وہ جواب کی طرف چلا۔

"اپنے آپ کو وقت دے کر اور وقت کو محسوس کر کے۔"

پھر سوال آیا۔

"وقت کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟"

جاذب کے دماغ کے ماضی والے حصے میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اسے کچھ یاد آیا۔

"میرے پاس آپ کی سب باتوں کا ایک جواب ہے۔ Universal Concentration Management۔ اپنے دھیان کو اپنے قابو میں کر کے اور اپنی توجہ کو اپنی مرضی سے استعمال کر کے دنیا میں کوئی بھی مشکل سے مشکل کام کیا جا سکتا ہے۔

اگر انسان اپنے دھیان کو استعمال کرنا سیکھ جائے اور بھولنے اور یاد رکھنے پر قادر ہو جائے تو دنیا کے بیشتر مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

میں اس بات کی 100 فیصد گارنٹی تو نہیں دے سکتا، پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جس نے جس حد تک توازن رکھا، وہ اس حد تک کامیابی پائے گا۔

ہمارے دین میں توجہ کی یکسوئی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ نماز میں دھیان نہیں ٹوٹنے دینا، حج یکسوئی کا پیغام ہے، اور ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ یہ پیار محبت بنتا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اس کو بھی اس سے سلجھایا جا سکتا ہے۔

جو جو بھی اس بات کو دل سے تسلیم کر چکا ہے، وہ آج فجر کے بعد رکے، ہم تھوڑی سی مشق کریں گے۔ یہ سب یقین کا کھیل ہے۔ جو بھی شک کی نظر سے دیکھتا ہے وہ بے مراد رہتا ہے۔"

آج بات بہت لمبی ہو گئی تھی۔ پھر فجر کی اذان دی گئی۔ نماز کے بعد ابھی مکمل سویرا نہیں ہوا تھا۔ افق کی روشنی میں چھ نوجوان اس کی بات سمجھنے کے لئے رکے۔ وہ سب پڑھے لکھے نوجوان لگ رہے تھے۔ کچھ اس سے بھی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس نے سب کو اکٹھا کیا، صحن میں بیٹھنے کو کہا۔ سب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

جاذب نے سب کو کہا۔

"دیکھو، پہلے ایک بات سمجھ لو۔ جس طرح جادو سیکھنے کی پہلی شرط یقین ہوتی ہے، اس بات پر یقین کہ جادو کا وجود ہے، اسی طرح تمہیں میری باتوں پر یقین ہونا چاہئے کہ تمہیں ملے گا جو تم مانگتے ہو۔"

سب لوگ اس کی تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

جاذب نے سب کو ایک گہرا سانس لینے کو کہا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گہرا سانس لینے سے سب کو تازگی محسوس ہوئی۔

''آنکھیں بند کرلو اور اس وقت تک مجھے سنتے رہو جب تک آپ آسانی سے سن سکو، اور اس وقت تک کی گئی باتوں کو سمجھ کر یہ بھول جاؤ کہ یہاں کوئی بول بھی رہا ہے۔''

''اب ہم اپنے سانس پر فوکس (Focus) کریں گے۔ سانس بہت بورنگ چیز ہے۔ اس لئے دھیان بٹے گا، پر نہیں بٹنے دینا۔ آرام سے اس کو پکڑ کر واپس لے آئیں گے۔ کوئی زبردستی نہیں۔ ذرا سا بھی تناؤ نہیں۔ اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دو۔ اپنی سوچ کو آزاد کر دو۔ اگر تم نے سانس پر دھیان لگانا سیکھ لیا تو تم دُنیا میں کہیں بھی دھیان لگا پا سکتے ہو۔ کیونکہ دُنیا کی ہر چیز اس سانس سے زیادہ ہی انٹرسٹنگ (Interesting) ہوگی۔

ابھی سانس اندر جا رہا ہے۔ ہمارے جسم میں ٹھنڈی ہوا جا رہی ہے اور گرم ہوا باہر آ رہی ہے۔ ہمارے سانس پر دھیان دینے سے اس کی رفتار پر فرق نہیں آنا چاہئے۔ سوچو کہ یہ بس سانس ہی چل رہا ہے۔ اس کائنات میں اس کے علاوہ ہے ہی کچھ نہیں۔

پوری کائنات اس سانس میں سمٹ چکی ہے۔ میرا کوئی ماضی نہیں... مستقبل ابھی آیا نہیں تو میں کیوں فکر مند ہوں؟ ماضی بیت چکا... تو وہ کیا وقعت رکھتا ہے؟

بس یہ حال ہی ہے... جو میرا ہے... یہی پل ہے... جس پر میں محیط ہوں... یہ وقت بہت زیادہ ہے... اس کو غور سے دیکھو... ہاں... وقت رُک سکتا ہے... اگر رُک نہیں سکتا... تو ہم اس کی رفتار کو ضرور کم کر سکتے ہیں... وقت کو تھام لو... غور کرو کہ ایک لمحہ بہت لمبا ہوتا ہے... اور جب اپنے پاس کچھ نہ ہو... تو اور بھی لمبا ہو جاتا ہے... وقت کو بڑھانا ہے... تو سب ضائع کر دو... کوئی تمہارا نہیں... کچھ بھی تمہارا نہیں... بس تم ہو... اور یہ ایک لمحہ... اور اس لمحے میں رینگتا ہوا یہ سانس... یہ چھوڑ گیا... تو سب چھوٹ جائے گا... اس کو دیکھو... یہ کہاں جا رہا ہے؟ اس کو محسوس کرو... وقت کے اندر چلے جاؤ... بظاہر چھوٹا سا لمحہ جسے ہم حال کہہ رہے ہیں... بہت گہرا ہے نہ... اچھا گومت... اُتر جاؤ اس کے اندر...!!

Go deep into it and feel each and every pulse beat of a mili second.

Smell the time, stay focused, feel its depth, forget the past, feel that you are in the present, not in the future.''

معراج بابا دور بیٹھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے جاذب نے یہ کام باقاعدہ کہیں سے سیکھا ہے۔

''غور کرو تو یہ پیمانے ہم نے خود بنائے ہیں۔ ہمیں پیمانوں کے بغیر اُتارا گیا تھا... جو کچھ ہم نے خود بنایا ہے... ہم اس کو توڑنے پر بھی قادر ہیں... توڑ دو وقت کے پیمانوں کو... آج جان جاؤ کہ ایک لمحے میں صدی کو بھی لپیٹا جا سکتا ہے... اور ایک صدی ایک لمحے میں بھی کاٹی جا سکتی ہے... دھیان دو تو یہ کائنات چند لمحات پر مشتمل ہے... اور غور سے دیکھو تو یہ لمحہ بھی اپنے اندر ایک کائنات رکھتا ہے۔

یہ ماضی اور مستقبل کی لکیر اسی حال پر ملتی ہے اس کو چھوڑ دو گے تو دونوں ٹوٹ جائیں گے... ان کو ملا کر رکھو اور ملاتا اس حال نے ہے... جس پر تم موجود ہو اور موجود رہنا ہے... تو اس سانس کو دیکھو... اب اگر مجھے سن سکتے ہو تو غور کرو... اس دل پر جو تمہارے کانوں

میں اونچا اونچا دھڑک رہا ہے۔ وہ بھی یہی کہہ رہا ہے کہ یاد کرو۔ میں تمہارے لئے اتنے سالوں سے دھڑکا اور تم نے مجھے سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔۔۔۔ اس کی آہ و زاری سنو۔ اس کی آواز کا مطلب سمجھو۔ ہر دھڑکن تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پر تم نے آج تک سنا ہی نہیں ہے۔ یہ خود بھی ذکر الٰہی میں مگن ہے۔ اور تم کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے۔"

بابا جی بہت گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"واہ خدا! تیری حکمتیں، ہماری سوچ بہت محدود ہے۔"

کچھ دیر گزرنے کے بعد جاذب معراج بابا کے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"بابا جی! آپ نے آج بہت بڑی ذمہ داری مجھے دے دی۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔"

بابا جی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"بیٹا! قلم سے بڑی ذمہ داری کوئی نہیں ہے اور تم وہ بھی سنبھال رہے ہو۔ یہ ذمہ داری اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ بہر حال مجھے اچھا لگا، بلکہ مجھے بھی کافی سیکھنے کو ملا۔"

وہ شرمندہ ہونے کے انداز میں نظریں جھکا رہا تھا۔

بابا جی نے اس کا چہرہ دیکھا تو بات بدل دی۔

"بیٹا! تم سب کچھ سمجھتے بھی ہو تو یہ بھولنے اور یاد رکھنے والی تھیوری کو Apply کیوں نہیں کرتے۔ یا بھول جاؤ سب کچھ۔"

جاذب نے بابا جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"بھولا تو جیتے کے لئے جاتا ہے، میں تو جی چکا۔"

وہ لاجواب کرنے کا عادی ہو چکا تھا، پر اس کی آنکھوں میں حسرت کے آثار تک نہ تھے۔

(اندھیرے سے اُجالے کا یہ سفر جاری ہے)

وہ سادہ سی لڑکی

ایک سیدھی سادی بے ریا لڑکی کا قصہ، قسمت اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

☆ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

"آپ کو منظور ہو یا نا منظور، میں آپ کے بڑے سے سٹور میں ملازم ہو چکی ہوں۔ آپ بس یہی سمجھیں اور ہاں، عارضی نہیں، پکی ملازم۔" صائمہ نے میگا مارٹ کے سیٹھ سلیم کے حضور عرض کر دیا اور چہرے پر استقلال کی ردا اوڑھ لی۔ اب وہ صوفے پر براجمان ہو چکی تھی۔

"آپ کے اس بڑے احسان کی وجہ؟" سلیم نے حیران ہو کر تو عمر چھوہری سے دریافت کیا جس کی عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو عقلمند بھی سمجھتی تھی اور اپنے تئیں نا قابل فہم دعوے بھی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر سے وہ مسلسل بول رہی تھی۔

"یہاں ملازمت اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ وسیع و عریض سٹور مجھے پسند آیا ہے۔" صائمہ جھٹ سے پھر پھٹ پڑی مگر اس بار اس کا انداز اور لہجہ چغلی کھاتا تھا کہ وہ کسی مایوسی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"لڑکی، نوکریاں یوں نہیں بٹا کرتیں۔ یہ معاملے سنجیدہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یوں طے نہیں ہوا کرتے کہ مان نہ مان، میں تیرا مہمان۔ کئی امیدواروں کے بیچ

شخصی صلاحیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے، پھر بہترین انفرادی قوت کا چناؤ عمل میں آتا ہے"۔ سلیم نے صائمہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا میں آپ کو مناسب یا موزوں دکھائی نہیں دیتی؟" امیدوار لڑکی گویا منتظم منیجر سے الجھ پڑی، جو میگا مارٹ کے نصف کا مالک بھی تھا اور کاروباری حلقوں میں غیر معمولی شخص سمجھا جاتا تھا۔ اب اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش منجمد ہو گئے تھے اور اس کی نگاہیں نوعمر لڑکی کا طواف کر رہی تھیں جو بظاہر چلتر یا چالاک معلوم نہیں ہوتی تھی بلکہ نوکری کا تقاضا محض اپنی سادگی کے باعث کر رہی تھی۔

لڑکی مارکیٹنگ کے لئے موزوں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس میں وہ صلاحیت موجود ہی نہیں تھی جو قوتِ خرید رکھنے والوں کو متوجہ کر سکتی۔ شباہت کے لحاظ سے بمشکل قبول صورت کہی جا سکتی تھی۔ جو ذہانت اس کے حصے آئی تھی، وہ بھی ظاہری تو اس میں عیاں نہیں ہوتی تھی بلکہ پہلی نظر میں وہ پھوہڑ سی نظر آتی تھی، جس کے انداز و ادا میں سلیقے کا فقدان واضح جھلکتا تھا۔ بات چیت کا ڈھب بھی محض واجبی کہا جا سکتا تھا۔ غرضیکہ اس نے شخصی لحاظ سے سلیم کو متاثر نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لئے اب گفتگو میں اکتاہٹ کا پہلو دکھائی دینے لگا تھا۔

"آپ کا قد کتنا ہوگا؟" سلیم نے سوال کر کے گویا پتھر دے مارا۔

"چار فٹ، پورے آٹھ انچ"۔ صائمہ نے بغیر کسی بوکھلاہٹ کے جواب دے دیا۔ "آپ کے پاس سیڑھیاں تو موجود رہتی ہوں گی؟" اس نے جواباً اپنا سوال بھی جڑ دیا۔ سلیم بے اختیار ہنس پڑا۔

"تعلیم تو حاصل کی ہوگی؟" اس نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"جی، میٹرک۔ آپ چاہیں تو انگریزی کے مضمون میں میری مدد کروا دیں، میں ایف اے پاس کر لوں گی"۔ صائمہ نے جواب تھما دیا۔

"اور تجربہ؟ میرا مطلب ہے، بطور سیلز گرل کام کرنے کا تجربہ؟"

صائمہ کی فہم و فراست نے اسے ادراک عطا کر دیا کہ بگ باس اب اسے ملازمت نواز دینے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

"جی، وہ نصف برس بعد پورے چھ ماہ ہو جائے گا"۔ اس نے اپنے متوقع باس کو موزوں جواب سے فیضیاب کر دیا۔ سلیم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس نے سوچا کہ لڑکی سے دوٹوک انداز میں بات کرے، یا پھر ایسا ڈھب اپنائے کہ وہ اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے وہاں سے چلی جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ لڑکی اب آنسو بہا رہی تھی۔ اسی دوران ایک ٹیلی فون کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا جس کا دورانیہ طویل تر ہوتا گیا۔ صائمہ اس بیچ کرسی پر پہلو بدلتی رہی۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ملازمت اس کے لئے حیات و موت کا مسئلہ بن چکی تھی۔ دراصل اس کی ذات سے وابستہ حقائق بہت تلخ تھے۔

وہ ان لوگوں کے بیچ پل رہی تھی جنہیں عرفِ عام میں کمتر کہا جاتا تھا۔ احباب کا بس چلتا تو وہ اس کا ماس بھی نوچ کھاتے۔ زہریلی زبانوں کا استعمال اور لفظی چرکے لگاتے رہنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ صائمہ خصوصاً ان کا تختۂ مشق بنا کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ ان سب سے بہتر تھی۔ اس کی شخصی خوبیاں اس کی دلسوزی کا باعث بنا کرتی تھیں۔ اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ حد درجہ محنت کرے اور اپنا مستقبل خود سنوار لے، پھر گھر چھوڑ دے۔

وہ متوقع نوکری کے لئے نکلی تو اس دم بھی گھر میں اس پر آوازے کسے گئے۔ اسے زہریلے لفظوں سے سنگسار کر دیا گیا۔

"مستقبل کی بزنس ٹائیکون پاکیزہ ماحول سے نجات کی خاطر پہلا قدم اٹھا رہی ہیں"۔ ایک غرّاتی صدا ابھری۔

"آج تو یہ اپنے تھوبڑے پر سنگھار کی دلدل سے رونق سجالیتی"۔ کوئی دوسری جانب سے بول پڑا۔ اس کے بعد زہریلے ماحول میں لگاتار قہقہے گونجنے لگے۔

"یار! چہرہ ہونق ضرور ہے مگر اتنا بھدا بھی نہیں، ذرا بیضوی ہے تو کیا؟ انڈے پر بھی انسانی اعضا نما تاثے جا سکتے ہیں"۔ ذرا فاصلے پر بیٹھے ایک بدہیئت کزن کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔

"کیا انڈے سیاہ کالے بھی ہوتے ہیں؟" چھوٹا چچا بھی گفتگو میں ٹپک پڑا۔

پے در پے حملوں کے باعث صائمہ حسب معمول ہراساں دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے مڑ کر جتنے کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے اقربا کی صورت پر دھنائی کندہ نظر آئی۔ بولتی بھی تو اس کی نوا نقار خانے میں توتی کی صدا کہلاتی۔ وہ اپنی خفگی دل میں سمیٹے چپ چاپ گھر سے باہر نکل آئی۔ اس دم لاشعوری طور پر اس نے اپنا وجود بھاری چادر میں سمیٹ لیا۔ اسے اپنے شخصی کوتاہ پہلوؤں کا احساس تھا، مگر پھر بھی اپنی اکائی کے ڈھب سے بہت نالاں نہیں تھی۔ وہ یقین رکھتی تھی کہ شخصی اجزائے ترکیبی میں تغیر برپا کر کے وہ خوش نمائیاں اجاگر کر سکتی تھی۔ اسے بناوٹ اور تصنع سے مبرہ اپنا روپ اچھا لگتا تھا۔ ایک خوبی پر ہمیشہ فخر کرتی کہ وہ ایماندار تھی، نہ تو کبھی جھوٹ بولتی تھی اور نہ کسی دروغ گو کا ساتھ دیتی تھی۔

"آپ ملازمت کیوں کرنا چاہتی ہیں؟" سلیم نے سوچ میں غلطاں لڑکی کو چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی، مگر فوراً ہی سنبھل کر بول پڑی۔

"سر! دراصل میں اپنی شادی کے لئے جہیز تیار کرنا چاہتی ہوں"۔ اس نے کہا۔ سلیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"جہیز تو دلہن کے لواحقین تیار کیا کرتے ہیں؟" وہ قدرے تذبذب کے بعد بولا۔ ہمدردی اور تاسف کا ملا جلا تاثر اس کے چہرے پر عیاں ہو گیا تھا۔

"جی"۔ صائمہ بس اتنا کہہ سکی۔ اب وہ نگاہیں نیچی کیے اپنی انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔ سلیم اس کے دل میں جنم لیتا الم محسوس کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، صائمہ! میں آپ کے سلسلے میں ہمدردی سے سوچوں گا، فی الحال مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ جا سکتی ہیں"۔ سلیم نے بظاہر انٹرویو ختم کرنے کا اعلان کر دیا، وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

"آپ نے مجھ سے ایسا کچھ نہیں پوچھا جسے میں بامعنی کہہ سکتی۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ مجھے ملازمت مل پائے گی یا نہیں، پھر میں کیسے چلی جاؤں؟" صائمہ کی موٹی موٹی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ پڑیں۔ ان میں اشک بھی تیرنے لگے تھے۔

"مجھے آپ سے مزید کیا دریافت کرنا چاہیے تھا، بتا دیں؟" سلیم نے جھٹ سے سوال کر دیا۔ صائمہ گھبرا گئی۔

"کوئی شعر ہی سن لیجیے"۔ اس نے بظاہر یاوہ گوئی کی لیکن یقین رکھتی تھی کہ اس نے سلیم کو مشاعرے میں دیکھا تھا۔ لمحے اب اس پر بھاری دکھنے لگے تھے۔

"شاید آپ درست کہتی ہیں، مارکیٹنگ کا شاعری سے گہرا تعلق بنتا ہے۔ آپ چاہیں تو غالب کی کوئی غزل گنگنا سکتی ہیں"۔ سلیم نے کہا۔ صائمہ کو اپنی پڑ گئی، اب سلیم اس کی حرکات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"گاؤں گی تو مارٹ خالی ہو جائے گی"۔ صائمہ سنبھل کر خوشدلی سے بولی۔ اس پر سلیم نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"میں اپنے لہجے میں تسلسل اور روانی سے پڑھ دیتی ہوں۔ شعر اچھا لگے تو براہ کرم مجھے ملازمت دے دیں"۔

صائمہ نے سپاٹ لہجے میں بات مکمل کی۔

"پڑھیں۔" سلیم کے لہجے میں سنجیدگی کا عنصر نہیں تھا مگر وہ لڑکی کے چہرے پر بار بار ابھرتی یاس و بیم کی کیفیات سے آشنا ہو چکا تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ امیدوار لڑکی اس کا وقت ضائع کر رہی تھی۔ وہ صائمہ کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کر چکا تھا اور اب اس کی شخصیت میں موجود بنیادی خوبیاں پرکھ رہا تھا۔ "لڑکی نے غیر ارادتاً اپنا انٹرویو ایسی سمت میں موڑ دیا تھا جو اس کے حق میں جا سکتی تھی۔ سلیم کا ذہن کہہ رہا تھا۔

"شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا"

صائمہ نے اپنی پسند کا شعر سنا دیا۔ سلیم چونک سا گیا۔ لمحہ بھر اسے احساس ہوا کہ لڑکی کے دل میں موجزن درد اس کی صدا میں سمٹ آیا تھا اور شعر اس کی بے چارگی کی غمازی کر رہا تھا۔

"اس عمر میں اس قدر اداسی کی وجہ؟" اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"اے عدم احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں"

صائمہ نے اگلے شعر میں وضاحت کر دی۔

"آپ کے ذوق میں طنز کی کاٹ نظر آتی ہے"۔ سلیم سر کھجاتے ہوئے گویا ہوا۔ شعروں نے اس پر اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ "گرد و پیش میں منافقت کے علاوہ ہے کیا؟ پھر آج کے دور کا بشر تو اپنے ساتھ بھی منافق ہے"۔ صائمہ نے کہا، پھر ہنستے ہوئے یہ شعر پڑھ دیا۔

"ایک بیوی ہے، چار بچے ہیں
عشق جھوٹا ہے، لوگ سچے ہیں"

سادہ لوح لڑکی کے اسرار و رموز سلیم پر کھل رہے تھے۔ اسے لگا کہ وہ گہری سوچ کرنے کی عادی تھی اور مطالعہ بھی کرتی ہوگی۔ اس کے نزدیک لڑکی کی شخصیت میں صرف تربیت کی کمی تھی۔ اب وہ اسے یقیناً ملازمت دے دینا چاہتا تھا، صائمہ جان چکی تھی۔

"ایک آخری شعر جو اتنا دلکش ہو کہ میں آپ کو فوراً ملازمت دے دوں"۔ اس نے گویا صائمہ کو خوشخبری سنا دی۔ صائمہ کے چہرے پر پھول کھل اٹھے اور کامرانی کی آس روئیں روئیں سے چھلکنے لگی۔ اس نے اپنی دانست میں اچھوتے شعر کا انتخاب کیا اور اسے بہتر لہجے میں ادا کر دیا۔

"دور جب چاند افق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی"

شعر نے سلیم کے لہجے کی عکاسی بھی کر دی۔ بے ساختہ تحسین "واہ" یہ بتاتی تھی کہ شعر سلیم کے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ سنبھل کر ہنس پڑا۔

"آپ نے یہ شعر کیسے ازبر کیے؟" اس نے پوچھ لیا۔

"سکول میں بیت بازی کے شوق نے میرے ذوق کو ہوا دی تھی اور اب تو شاعری رٹنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ پرانے اخبار اور رسائل جمع کرتی رہتی ہوں اور اسی ناطے مطالعے کی عادت بھی پڑ گئی ہے"۔ صائمہ نے جواب دیا۔ "آپ اس شغل کو کٹھن حالات سے میرا فرار بھی کہہ سکتے ہیں"۔ اس نے گفتگو مکمل کر دی۔

***

صائمہ کے نزدیک اس کی اپنی حیات بھی کسی بے معنی اور الجھے ہوئے شعر کی تشریح تھی۔

اس کی ماں اسے جنم دیتے وقت انتقال کر گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بھرے گھر میں پالنے کی کوشش کی مگر اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا دکھائی دیا۔ اس کا گھر بھی عجائب خانے سے کم نہیں تھا۔ پانچ مرلے کے مکان میں چھ خاندان رہتے تھے۔ ہر بھائی کے پاس ایک کمرہ تھا۔ اور پانچ گھرانوں کی کفالت کر رہے تھے۔ ان

حالات میں بھائیوں کے بیچ کس نوع کا اتحاد قائم رہ سکتا تھا؟ بڑے باہم لڑتے تو چھوٹے ہر قسم کی تربیت سے مالامال ہو جاتے۔ اڑوس پڑوس کے افراد بھی اس مردم پیشہ خاندان سے نالاں ہو چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمیشہ بڑھتی ہوئی بھڑوں کے اس چھتے میں ہاتھ ڈالنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ ہمسائیگی کی تکالیف میں مبتلا ہو کر چند شرفاء محلہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ گھر میں جھگڑا حدوں سے بڑھ جاتا تو بڑے ابا جان یعنی دادا اوپر والی منزل سے نیچے اترا کرتے تھے، جن کے ہاتھ تھاما ہوا سونٹا بڑے چھوٹے کی تمیز کم ہی کر پاتا تھا۔ اس کا یہ اختیار چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ مکان اور اس میں بھرے گھر کے خالق تھے اور امن و امان کی واحد آس بھی۔ ان کی یا باقی گھر والوں کی مقدور بھر مدد ان کی لاڈلی بیوی کیا کرتی تھی، جو اکثر حالات کے تابع ہوا کرتی۔

عاصم کا رنڈوا باپ کچھ ہی عرصہ بعد بیٹی اپنی ماں کے حوالے کر کے خود دور بڑے شہر چلا گیا تھا، کبھی کبھار گھر کی یاد ستاتی تو وہ اپنی ماں اور بیٹی سے ملنے چلا آتا، ورنہ اس کا رابطہ بیٹی سے مفقود رہتا۔ صائمہ کی تربیت اس کی دادی نے کی مگر انوکھا پہلو یہ رہا کہ وہ کم چاہی لڑکی باقی تمام گھرانے سے مختلف دکھائی دیتی تھی۔ اس میں سادگی، سچائی اور دیانت کیسے وارد ہوئی؟ اس کا فیصلہ کرنا کار دشوار تھا، جو جاننے والوں کو حیران کرتا۔ علاوہ ازیں اس لڑکی کے دوسرے خصائص بھی عمدہ اور دیگر گھرانے کے لئے قابل تقلید رکھتے تھے۔

نوکری کے آغاز پر یہی خوبیاں خود صائمہ اور میگا مارٹ کی انتظامیہ، دونوں کے لئے وبال جان بن گئیں۔ کاروبار میں سچائی اور ایمانداری اعلیٰ قسم کی صفات ہیں، مگر انہیں استعمال کرنے سے حتی الوسع اجتناب برتنا چاہئے۔ صائمہ یہ نہ سمجھ سکی وہ صرف سچ بیان کیا کرتی تھی جو انتظامیہ کو منظور نہ تھی۔ نتیجتاً اس کا تبادلہ فٹ ویئر یعنی جوتوں والے سیکشن میں کر دیا گیا، جہاں اتفاق پڑتا تھا کہ فالتو بات چیت کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔

وہاں صائمہ کا اعتماد کچھ بڑھا تو اس میں خوش خلقی عود کر آئی، جو اس کی سادگی کے باعث دوبارہ گھاٹے کا سودا ہو گئی اور ایک انوکھا سا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔

اس نے ایک خاتون کو جوتوں کے ڈھیر سارے جوڑے دکھائے مگر محترمہ کا پاؤں ہاتھیوں کی کسی قبیل سے تعلق رکھتا تھا، جسے ہر جوتا تکلیف پہنچانے پر آمادہ نظر آتا۔ صائمہ تھک گئی تو خاتون بھی دلبرداشتہ ہو گئی۔ ایسے میں صائمہ کی خوش خلقی اس کے اپنے گلے پڑ گئی۔ بات انتظامیہ تک جا پہنچی۔

"آپ کی سیلز گرل نے بجائے جوتوں کے، ان کا ڈبہ میرے پاؤں میں پہنا دیا تھا۔ اس نے میرا مذاق اڑایا ہے۔" غصے میں بھری ہوئی خاتون سلیم ہی کے دفتر میں اس پر حملہ آور ہو گئی۔

"کس نے؟" سلیم نے فوراً تشویش کا اظہار کیا۔

"وہ، جس کی آواز پھٹے ہوئے بانس کی طرح ہے۔" خاتون نے اپنی اخلاقی ہیبت کا اظہار کر دیا۔

تھوڑی دیر میں صائمہ سلیم کے سامنے پیش ہو چکی تھی۔ اس نے آتے ہی نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کر لیا بلکہ سلیم کو یہ بھی بتایا کہ اس نے خاتون کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ جب بھی کوئی مردہ بھینس الوارث پائی گئی، تو اس کی کھال سے خاتون کو جوتوں کا جوڑا بنوا دیا جائے گا۔

اسی شام صائمہ کو ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ اسے تنخواہ دے کر سپروائزر نے متعلقہ رسومات بھی انجام دے دیں۔ اسے چائے کا الوداعی کپ بھی پیش کر دیا گیا۔ مگر اگلے روز وہ واپس اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھی۔

سلیم جوتوں کے شعبے میں گیا تو اسے وہاں پا کر دم بخود رہ گیا بلکہ اس کی جرأت پر حیران بھی ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سلیم کے دفتر میں موجود تھی، انتہائی پریشان۔

"کل شام میں نے آپ کا حساب بے باق کر دیا تھا مگر آج پھر آپ یہاں کیسے؟" سلیم نے اس سے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنی ملازمت نہیں چھوڑ سکتی"۔ صائمہ نے جواب صادر کر دیا۔

سلیم نے اس کی طرف دیکھا تو پایا کہ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں گہری سرخی تھی۔ اسے لگا کہ وہ لڑکی شب بھر روتی رہی تھی۔

"مگر میگا مارٹ کا اصول ہے کہ یہاں برطرف شدہ ملازموں کو بحال نہیں کیا جاتا"۔ سلیم نے اسے سمجھایا۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی"۔ صائمہ نے گویا ہٹ دھرمی سے جواب دیا، ساتھ ہی اپنا پاؤں بھی فرش پر دے مارا۔ یہ غیر ارادی حرکت اس کے پختہ ارادوں کی غمازی کرتی تھی۔ وہ رحم طلب تھی۔

"میں آپ کی ہتک نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ خود ہی یہاں سے چلی جائیں"۔ سلیم نے لفظ چباتے ہوئے کہا، اس کے لہجے میں سختی بدستور موجود تھی۔

"سر! کچھ بھی ہو جائے، چاہے آسمان گر پڑے، میں ملازمت چھوڑ کر نہیں جاؤں گی"۔ صائمہ نے دوبارہ اپنا پاؤں فرش پر مار دیا۔

اب سلیم کی خواہش تھی کہ وہ اپنے دفتر سے باہر نکل جائے، مگر صائمہ نے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا اور زور زور سے رونے لگی۔ اس بیچ مارکیٹنگ شعبے کا سپروائزر بھی وہاں پہنچ گیا جس نے صائمہ کے بارے میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔

"میرے خیال میں یہ لڑکی سیلز کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی اور ظاہر ہے کہ مناسب تربیت کے بغیر مطلوبہ نتائج پر پورا نہیں اتر سکے گی"۔ اس نے کہا۔ پھر اپنی رائے کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی۔ کہا کہ "جب یہ میک اپ اور بناؤ سنگھار سامان کے شعبے میں کام کر رہی تھی تو وہاں بھی اس نے دو گاہکوں کے ساتھ ناروا جملوں کا تبادلہ کیا تھا۔ ایک کالی سی لڑکی کو مشورہ دیا کہ سفید ترین ٹیلکم پاؤڈر بھی اس کے چہرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ایک دوسرے شخص نے جب اس سے باڈی سپرے کے بارے میں رہنمائی حاصل کی تو اس نے اسے فینائل کا ڈبہ پکڑا دیا کہا کہ آپ کے بدن سے بدبو کے بھبھوکے دور کرنا عام پرفیوم کے بس میں نہیں ہوگا۔ طنزیہ گفتگو کا وطیرہ دیکھ کر گاہک نے شرمندگی سے سر پکڑ لیا۔"

سپروائزر نے تلخ لہجے میں سلیم کو بتایا مگر اس دوران سلیم پر ہنسی کا دورہ پڑ چکا تھا پھر نجانے کیا ہوا ہنستے ہنستے سپروائزر بھی ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اسے سلیم کی ہنسی لے ڈوبی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر صائمہ کی جان میں جان آئی۔ وہ "شکریہ" کہہ کر آفس سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوٹی سپروائزر کے سامنے کھڑی تھی۔

"سر! چاہے آپ مجھے ترکاری یا گوشت والے شعبے میں متعین کر دیں، میں احتجاج نہیں کروں گی بلکہ شوق سے اپنا کام سیکھوں گی اور آئندہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی"۔ اس نے مضبوط لہجے میں تمنا کا اظہار کیا۔

سلیم نے صائمہ کو معاف کر دیا تھا۔ ویسے بھی کسی غریب پر ظلم کرنا اس کی خصلت میں شامل نہیں تھا۔ صائمہ کی جانب وہ نرم گوشہ بھی رکھتا تھا، پھر اس کی اپنی زندگی میں بھی کئی تلخیاں موجود تھیں، جنہوں نے اس کی کائنات میں الم بھر دیے تھے۔ اس کی شادی بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ اپنی بیوی، سلمیٰ کو وہ طلاق دے چکا تھا۔ بعد میں بیٹی بھی اس نے سلمیٰ کو دے دی تھی مگر اس خاتون نے دوسری شادی کر لی تو بیٹی واپس باپ کے پاس آ گئی۔ اب وہ اسی کے گھر میں پل رہی تھی۔ گھریلو ماحول میں یاس کا عنصر غالب تھا۔ سلیم نے سلمیٰ سے شادی

سے کی تھی مگر بعد ازاں ثابت ہوا کہ دونوں کی سوچ اور رویوں میں بعد المشرقین تھا۔ سلمٰی اپنے گھرانے کی ثروت اور امارت کے زعم میں مبتلا تھی، کبھی بھی سلیم کے طرز زندگی سے سمجھوتہ نہ کر سکی۔ سلیم سیلف میڈ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیوی گھرداری سے آشنائی حاصل کر لے مگر سلمٰی گھر کے معمولات بھی بوجھ جاننے لگی تھی اور اسی چڑچڑے پن کا شکار ہو گئی۔ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی بڑھتی گئی۔ سلیم اس کے رت جگوں اور دوپہر تک سوئے رہنے پر اعتراض کیا کرتا تھا، جبکہ سلمٰی اپنی مادر پدر آزادی کے معمولات نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور تلخیاں حدوں سے بڑھ گئیں، پھر نوبت حتمی فیصلوں تک جا پہنچی۔ سلیم کا گھر اب خادماؤں کے سہارے چل رہا تھا۔ اس کا واحد مددگار، نعیم اس کا بڑا بھائی تھا۔ آبائی جائیداد انہیں ترکے کی صورت میں وافر ملی تھی۔ نعیم ذہنی طور پر زیادہ قوی اور معاملہ فہم تھا، اسے کسی حد تک شاطر بھی کہا جا سکتا تھا جبکہ سلیم امور حیات میں سادہ لوحی کا شکار تھا۔ کئی برسوں سے مسلط ذہنی تناؤ نے اسے اور بھی کمزور بنا دیا تھا۔

صائمہ کو بھی سلیم کے خاندانی حالات کی پیچیدگی میں انا اور ہٹ دھرمی کے عناصر دکھائی دینے لگتے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ جینے کا ڈھنگ سیکھنے لگی تھی۔ مانتی تھی کہ زمانہ بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ تربیت کے سوتے لاشعوری طور پر بھی کارفرما رہتے ہیں۔ صائمہ جانتی تھی کہ اس کی شخصی کایا میں نسوانی اٹھک جاگا پاتے لگے تھے اور اکائی کے اجزا میں نمو پاتی دلکشی کے رنگ عیاں نظر آنے لگے تھے۔ نتیجتاً اس کے شخصی ارتقا میں شعوری پہلو بھی شامل ہوتا رہا۔ اس کی اساس میں جو انسانی خوبصورتیاں کندہ تھیں وہ اپنی جگہ پھولی پھلیں، دیگر کو صائمہ نے اپنا کر اپنے نسوانی رویوں میں نکھار لیا۔

ایک روز وہ سلیم کے دفتر پہنچی تو قدرے بدحواس دکھائی دی۔

''سر! میں یہ بیگ اسی طرح سالم آپ کے حوالے کر رہی ہوں جس طرح خاتون میرے سیکشن میں چھوڑ گئی تھی''۔ اس نے چرمی بیگ بڑی سی میز کے کونے پر رکھ دیا اور توجہ سلیم کے ردعمل پر مرکوز کر دی جو بیگ کھول کر دیکھنے پر حیرت کی تصویر بن چکا تھا۔

''یہ تو سونے کے زیورات سے بھرا ہوا ہے''۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی، ایسا ہی دکھائی دیتا ہے''۔ سلمٰی نے اطمینان سے جواب دیا۔ اب وہ اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی۔ بولی۔ ''خاتون اپنے فون پر کال سنتے ہی پریشان ہو گئی تھی۔ اسے غالباً کسی ٹریفک حادثے کی خبر ملی تھی۔ اس دم وہ بری طرح بدحواس دکھی۔ چند لمحوں کے لئے سمجھ بوجھ سے بھی عاری نظر آئی، پھر اس نے خرید کردہ سامان کاؤنٹر پر چھوڑا اور معذرت کرتے ہوئے تیز قدموں سے اخراجی دروازوں کی طرف ہو گئی۔ جاتے ہوئے بیگ بھی کاؤنٹر پر بھول گئی''۔ سلمٰی نے بات مکمل کی اور سلیم کی طرف متوجہ رہی، جس نے بیگ احتیاط کے ساتھ اپنے لاکر میں مقفل کر دیا تھا۔

اگلے روز، صبح سلیم نے صائمہ کو اپنے دفتر بلایا تو وہاں وہ خاتون بھی موجود تھی، جو کاؤنٹر پر اپنا بیگ چھوڑ گئی تھی۔ اب وہ بیگ میں رکھی گئی اشیاء کی پڑتال کر رہی تھی۔ سلمٰی کو دیکھ کر خاتون کرسی سے کھڑی ہوئی اور پیار سے ایک سنہری لاکٹ اس کے گلے میں پہنانا چاہا مگر صائمہ نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے آپ کا بیگ لوٹا کر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فریضہ انجام دیا ہے۔

خاتون کے رخصت ہونے پر صائمہ سلیم سے مخاطب ہوئی اور درخواست کی کہ سٹور میں چند ڈنر، واٹر اور ٹی سیٹ ایسے موجود ہیں جن کے اکا دکا اجزا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں اور پالیسی کے مطابق انھیں

فروخت کے لیے پیش نہیں کیے جائیں گے۔ کیا ہی اچھا ہو، جو اسے دو ایک سیٹ رعایتی قیمت پر دے دیئے جائیں تاکہ وہ انہیں اپنے جہیز میں استعمال کر سکے۔ اس ضمن میں ہر ماہ اپنی آدھی تنخواہ گنوانے پر تیار تھی۔ سلیم نے اس کی التجا منظور کر لی اور کہا کہ وہ مناسب برتنوں کا انتخاب کر لے۔

اگلے روز صائمہ پھر سلیم کے سامنے کھڑی تھی۔

"سر! میں ناقابل فروخت برتنوں میں سے انتخاب کر کے ایک ڈنر سیٹ گھر لے گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ سیٹ کے تمام برتن صحیح سالم موجود تھے، ٹوٹا کچھ بھی نہیں تھا۔ آج مجھے یہ ڈنر سیٹ واپس لانا پڑا۔ اندازہ نہیں کہ یہ قیمتی سیٹ ناکارہ برتنوں میں کیسے شمار ہوا؟ آپ چیک کرائیں، مجھے تو شک ہے کہ چند مزید سالم سیٹ وہاں سٹور کیے گئے ہوں گے"۔

معاملہ جان کر سلیم متحیر کھڑا رہ گیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد صائمہ کا پروموشن ہو گیا اور اسے سیلز گرلز سٹاف کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس کی تنخواہ بھی تقریباً دگنی ہو گئی۔ صائمہ نئی ذمہ داریوں کے ساتھ آگے بڑھی تو رکھ رکھاؤ اور ڈھب میں بھی برتر نظر آئی۔

اس روز موسم اچھا نہیں تھا۔ مارٹ میں رونق ماند نظر آتی تھی۔ ان دنوں مارٹ میں نئی اشیاء متعارف کرانے پر بھی سٹڈی ہو رہی تھی۔ سلیم زیورات کے شعبے میں مشغول تھا۔ اس نے مارٹ کی چند لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ تمام افراد اِدگرد درآمد شدہ زیورات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یکایک دیکھتے ہوئے یاقوتی پتھروں سے آراستہ ایک منفرد ہار متحیر آنکھوں کا محور بن گیا۔ اس زیور کی دمک نے ہر من میں کھلبلی مچا دی تھی، بلکہ فوراً یہ دلوں کی سیپ میں خوابوں کی صورت سج گیا تھا۔

"جان لیں کہ یہ میرے نوادرات میں شامل ہو چکا"۔ سلیم نے ہار بے ساختہ اچک لیا۔ لڑکیوں کی نظریں ایک دوسرے پر جم گئیں۔

"سر! کیا ہی اچھا ہو جو یہ کسی صراحی دار گردن کی مالا بن جائے"۔ ایک سیلز آفیسر بول پڑی۔ "نوادرات تو الماریوں کی نذر ہو جاتے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"استعمال میں آیا تو پھر وہ گردن تو انمول ہو جائے گی"۔ ایک دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

"مول، پتھروں کا نہیں، جذبوں کا ہوتا ہے"۔ صائمہ نے بول کر سب کو حیران کر دیا۔

"میں بغیر جذبوں کے بھی، اسے اپنا سکتی ہوں مگر خریدنے کے لیے رقم موجود نہیں"۔ وہ لڑکی برجستہ بولی، جس نے ہار کلائیوں میں اٹکا رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ لوگ پیسے جمع کر لیں، اس وقت تک یہ زیور میرے پاس محفوظ رہے گا"۔ سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کے نوادرات کا مول قارون کے پاس بھی نہیں ہوگا"۔ صائمہ پھر بول پڑی۔

اس بار سلیم نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے دفتر جانے کے لیے مڑا تو لڑکیوں نے اسے روک لیا۔

"سر! آپ نے کھوجا نہیں، ایک ہار صائمہ کے گلے میں بھی جھول رہا ہے"۔ ایک لڑکی رازدارانہ لہجے میں بولی۔ صائمہ اس متوقع وار پر شرما گئی۔ سلیم نے دیکھا۔ ایک سادہ سا ہار صائمہ کے گلے میں جھلک رہا تھا، جس کا یاقوتی رنگ صائمہ کے چہرے پر بکھری ہوئی حیا میں بکھر گیا تھا۔ لمحہ بھر سلیم کا دھڑکتا دل غیر متوازن سا ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے احساسات کی دنیا میں سے قیمتی اثاثہ کسی نے چرا لیا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ اس نے سنبھل کر لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ اسے پوری طرح بامراد دکھائی دی، جیسے معاشرتی جنگل میں کوئی فتح پا چکی ہو۔

سلیم کو اس کا چہرہ کم حسین اجزا کا خوشنما مجموعہ

دکھائی دیا جس کے سادہ رنگوں میں بھرپور سچائی تھی، جو تصنع اور مصنوعی پن سے قطعی بے بہرہ تھی۔

"جوانی بھرپور ہو تو نکھر کر وجود کی اکائی میں سجاوٹ بن جاتی ہے"۔ اسے احساس ہوا مگر وہ اندازہ نہ کرسکا کہ کون سا جذبہ تھا جس پر وہ پریشان ہوا تھا۔

"صائمہ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس کے دستِ شوق نے یہ ہار تمہارے زیبِ گلو کیا ہے؟" اس نے سب کے سامنے بے تکلفی سے پوچھ لیا۔

"میرا خالہ زاد ہے سر!..... عباس"۔ صائمہ نے جواب دیا، پھر بولی۔ "بیوٹی ہوم میں بطور میک اپ مین کام کرتا ہے"۔

"اس انتخاب میں تمہاری رائے بھی شامل ہو گی"۔ سلیم نے ایک سوال اور جڑ دیا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

"جی!" صائمہ نے لجاتے ہوئے جواب دیا اور شرماتے ہوئے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"سر! اس کا منگیتر شادی کے روز اسے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنائے گا"۔ ایک شوخ سرشت لڑکی نے بجا طور پر تبصرہ کیا اور صائمہ کے "ہاں" کہنے پر محفل زعفران بن گئی۔

"یہ زلفوں کی گھنی چھاؤں ہے میری خاطر
یہ ہونٹ اور یہ بانہیں میری امانت ہیں"

خاتون سیلز آفیسر نے ترنم نوا میں صائمہ کو تحفہ دیا۔

خوبصورت شعر نے سلیم کے دل میں پھر ہلچل مچا دی۔ لمحہ بھر کے لئے صائمہ اسے پھر انتہائی دلکش دکھائی دی۔ غیر مانوس سوچوں کے تانے بانے پر وہ ابھی تک پریشان تھا، کچھ نادم ہو کر اپنی ملامت بھی کرنے لگا۔

"کبھی وہ ناری بھی من میں بسیرا کر لیتی ہے، جو بظاہر خوبصورت دکھائی نہیں دیتی"۔ سلیم جاتے ہوئے چلتا تو اسے دھیمی سی آواز سنائی دی۔ لڑکیاں شوخی سے صائمہ کی باتوں پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

"سانولی لڑکیوں میں اپنے ڈھب کی کوئی کشش ہوتی ہے جو کچھ بڑھ کر ستم ڈھا سکتی ہے"۔ کوئی لڑکی دوسروں کو پُر اعتماد انداز میں درس دے رہی تھی۔ "ہر لڑکی ایک مکمل پیکیج ہوتی ہے، جو بحیثیت مجموعی اپنی اکائی میں جچنے لگتی ہے۔ ایک دوسری لڑکی بولی۔ "لڑکی کی کوئی اچھوتی ادا بھی مرد کو شکار کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مرد جتنا ہوشیار بنتا ہے بعض اوقات اتنا ہی کم عقل ثابت ہوتا ہے"۔ صائمہ نے اپنا تجزیہ بھی پیش کر دیا۔ پھر کیا تھا، لڑکیوں نے اس کے خالہ زاد پر تبصرے شروع کر دیئے۔ اسے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

"مانو یا نہ مانو، سانولی مُیار کا ڈسا ہوا پانی تک نہیں مانگتا"۔ ایک سانولی لڑکی نے زور دے کر کہا۔ اس انکشاف پر سہیلیوں نے صائمہ کو گلے لگا لیا، دیر تک اسے مبارکباد دیتی رہیں۔

چند لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار رہی تھیں۔ دو تین رقص کے انداز میں تھرکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

شام ڈھل چکی تھی۔ صائمہ گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کراکری کا ایک بڑا سا ڈبہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ "یہ سلیم صاحب نے تحفتاً بھیجا ہے"۔ ڈبہ ٹرالی پر لانے والے نے سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے پیکیج کا جائزہ لیا تو اس میں وہی گولڈن ڈنر سیٹ پڑا ہوا تھا، جو صائمہ ایک بار گھر لے جا کر واپس لا چکی تھی۔ اس وقت یہ سیٹ غلطی سے شکستہ برتنوں میں موجود پایا گیا تھا۔ پیکیج کے اوپر ایک کاغذ آویزاں تھا جس پر درج ذیل دعا تحریر کی گئی تھی۔

"مولا تجھ سے آج کی شب
بس ایک دعا ہے، ایک دعا
بے شک میری آنکھوں کی تندیلیں نہ قائم رکھنا

لیکن اس کے خواب کا روشن دیا سلامت رکھنا"
(سلیم)

تحریر سے صائمہ کے لئے اتھاہ پیار جھلکتا تھا۔

چند روز معمول کی سرگرمیوں میں گزر گئے۔ پھر ایک سرد شام صائمہ انتہائی پریشان دکھائی دی۔ اس کا دھیان مارٹ کی ذمے داریوں سے بھی ہٹ گیا تھا۔ سلیم کی نظر اس کے رویوں پر مرکوز ہو گئی تھی۔ بالآخر صائمہ مارٹ کے ایک کونے کی طرف چل پڑی اور تنہائی میں کھڑی ہو کر رونے لگی۔ سلیم اس کی طرف چلا گیا۔

"کیا بات ہے صائمہ؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ صائمہ نے جواب دیا اور اپنے اشک پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"میرے دفتر آ ئیں"۔ سلیم نے اسے حکماً کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیم نے اسے پانی کا گلاس دیا۔ صائمہ اپنے اشک پلو میں سموتی رہی۔

"کیا بات ہے، جو آپ اس قدر پریشان ہیں؟" سلیم نے اپنا سوال دہرایا۔

"گھریلو معاملہ ہے سر! مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو دکھی کر دیا ہے"۔ صائمہ نے بظاہر مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپ مارٹ میں ڈیوٹی کی جگہ رو رہی تھیں، لہٰذا آپ کو مجھے ہمراز کرنا پڑے گا"۔ انجانے اندیشے سلیم کو گھیر رہے تھے۔

"معاملے کا تعلق مارٹ سے نہیں بنتا"۔ صائمہ نے بظاہر صورت حال سنبھالتے ہوئے کہا، پھر اپنی بپتا سلیم کو سنائی کہا۔ "سر! غربت روزانہ نت نئے مسائل جنم دیتی ہے، پھر ہمارا گھرانہ تو ان پڑھ لوگوں کا مجموعہ بھی ہے۔ پانچ مرلے کے مکان میں تیس افراد مقیم ہیں۔ ہر عمر و عادات کے نفوس وہاں موجود ہیں۔ ان تعصبوں اور افراد پر رویوں کا بوجھ نہیں پڑتا بلکہ ہر کوئی اپنی تلخیوں کا مداوا دوسرے کو دکھ پہنچا کر کرتا ہے۔ بچے شعور پاتے ہیں تو اس ماحول میں رنگ جاتے ہیں"۔ صائمہ نے کہا۔

"ہاں، واقعی یہ تو دکھ اور افسوس کا مقام ہے"۔ سلیم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"سر! جھگڑا محض ایک کمرے کا ہے جو ہمارے مخصوص گھریلو حالات میں بڑھ گیا ہے۔ کمرہ دادا نے اوپر والی منزل پر مجھے دے رکھا ہے۔ میرے ایک جھگڑالو چچا کا خاندان بہت بڑا ہے، جو مجھ سے کمرہ ہتھیانا چاہتا ہے۔ اسی جھگڑے میں وہ اپنے باپ کو دھمکیاں بھی دے چکا ہے۔ کوئی نہ کوئی چچا مجھے مارٹ سے چھٹی کے بعد گھر لے جایا کرتا تھا۔ اب انہوں نے اتحاد کر لیا ہے اور دادا کو بتا دیا ہے کہ وہ میری کبھی بھی کوئی مدد نہیں کریں گے"۔

صائمہ کی آنکھوں میں آنسو پھر چھلکنے لگے۔

"تو یہ بات ہے"۔ سلیم نے معاملہ سمجھتے ہوئے کہا، آہ سی بھری۔

"آج موسم بہت خراب ہے، بارش بھی برس رہی ہے۔ بتائیں کہ میں تنہا اتنی دور گھر کیسے جاؤں گی؟ زمانے کا بھی اعتبار نہیں"۔ صائمہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"صائمہ! آپ دل چھوٹا نہ کریں، یوں تو میرا ڈرائیور بھی آپ کو گھر پہنچا سکتا ہے مگر آج میں خود آپ کو گھر چھوڑ آؤں گا۔ کل سے مارٹ کی گاڑی آپ کی مدد کرے گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ ہم دوسری لڑکیوں کی بھی مختلف امور میں دیکھ بھال کرتے ہیں"۔

سلیم نے کہا۔ بات سن کر صائمہ کا چہرہ کھل اٹھا اور آنکھیں خوشی کے مارے ٹمٹمانے لگیں۔ وہ سلیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی، مگر لفظوں کا انتخاب لہجے میں سجانا اس کے بس میں نہ رہا۔

سلیم صائمہ کے گھر پہنچا تو بارش اور ژالہ باری زوروں پر تھی۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر اینٹوں والی گلی میں ڈالی تو پریشان ہوا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا، جو گلی تنگ نہیں تھی۔ گلی نے تین چار بل کھائے تو صائمہ نے گاڑی رکوا لی۔ سامنے اس کا گھر تھا، جس کے بیرونی در پر طغرا ''آشیانہ'' کندہ نظر آتا تھا۔ سلیم گھر میں داخل ہوا تو وہاں اسے کسی چڑیا گھر کا احساس ہوا۔ زندگی سرد کمروں میں مقید تھی۔ دو تین اوپن کچن چھتری کے سایوں میں آباد تھے۔ وہ آگے بڑھا تو ناگوار سی مہک اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی، پھر طرح طرح کی آوازوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ صائمہ کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ اس کے دادا وہاں سلیم کو تپاک سے ملے۔ اس نے تھوڑی دیر گھر میں قیام کیا، پھر موسمی خرابی کا عذر کرتے ہوئے اجازت کا طلبگار ہوا۔

صائمہ اس شب بہت خوش نظر آئی۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ سلیم خود اسے نہ صرف گھر پہنچائے گا بلکہ اس کے کمرے تک پہنچ جائے گا۔

''بیٹا! تم نے لگن سے کام کیا اور دیانت کو اپنا شعار بنائے رکھا، انہی خوبیوں کا انعام آج تمہیں ملا ہے''۔ دادا نے اسے باور کرایا۔

اگلے روز صائمہ کی ہفتہ وار تعطیل تھی۔ دیر تک بیرونی دروازے پر دستک ہوتی رہی تھی۔ بالآخر صائمہ نیچے پہنچی تو پیش منظر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے میگا مارٹ کا ٹرک کھڑا تھا۔ ''سلیم صاحب نے امداد اور صلہ کلب سے آپ کے لئے سامان بھجوایا ہے''۔ ٹرک پر سوار کارندے نے اسے بتایا۔ مارٹ کی یوں مدد لینا کوئی بھی لڑکی عار نہیں سمجھتی تھی کیونکہ وہاں وہ کام کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد صائمہ کا کمرہ قالین اور نئے فرنیچر سے سج چکا تھا''۔ یہ ساز و سامان آئندہ زندگی میں میرے بہت کام آئے گا''۔ اس نے خوشی سے دادا کو بتایا۔

مارٹ کا سالانہ میلہ بھی منعقد ہونے والا تھا۔ اس موقع پر بھی سٹاف کو کارکردگی کے مطابق انعامات ملنے والے تھے۔ میلے میں صائمہ نے رقص کے پروگرام میں حصہ لیا اور خوب داد سمیٹی۔ سلیم بھی اس پست قد لڑکی کی مہارت دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ ملازمت کے آغاز پر بظاہر پھوہڑ نظر آنے والی لڑکی وقت کے ساتھ اپنی صلاحیتوں میں اس قدر نکھار پیدا کر لے گی۔

رقص و موسیقی میں حصہ لینا صائمہ کے احباب کو پسند نہ آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اپنے گھر میں اس کے خلاف محاذ کھڑا ہو گیا، بعد ازاں جس میں شدت آ گئی ان دنوں ایک دوسرا مسئلہ بھی جنم لے رہا تھا۔ صائمہ کا منگیتر عباس اپنی ایک کولیگ سے متاثر دکھائی دیتا تھا، اپنی نئی محبت کا اظہار وہ صائمہ سے بھی کر چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس محاذ میں سرگرم نظر آنے لگا تھا جو صائمہ کو دکھ پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اس کے رویوں میں تبدیلیوں کی اور وجوہات بھی تھیں۔ وہ بیوی کے ذریعے کمائی میں خاصا لالچی واقع ہوا تھا۔

انہی دنوں صائمہ نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ سالانہ میٹنگ میں اس کی کرسی سب سے پچھلی لائن میں تھی مگر کارروائی کے دوران ایک اہم موقع پر اسے رائے دینا پڑی۔ وہ الیکٹرانک آئٹمز والے شعبے کی جانب سے بول رہی تھی۔

''اپنے شعبے کے لحاظ سے عرض کروں تو میرے خیال میں میگا مارٹ کی شہرت مسلسل داغدار ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میگا مارٹ نے ایک ایل سی ڈی بنانے والی کمپنی سے معاہدہ کیا تھا جس نے بعد ازاں ہماری سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور وہ ٹی وی، جو آؤٹ آف ڈیٹ ہو رہے تھے، ہمارے پاس رکھ کر بظاہر رعایتی قیمت پر فروخت کر دیئے۔ لوگوں نے قیمت میں رعایت دیکھتے

ہوئے تمام سٹاک دنوں میں خرید لیا، مگر بعد میں پچھتاتے رہے کیونکہ فوراً ہی کمپنی نے اسی ایل ای ڈی کے نئے ماڈل جاری کر دیئے جو ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بہت بہتر تھے۔ مارٹ کو اس سودے کا زیادہ فائدہ نہیں ہوا تھا جبکہ کمپنی نے عوام کو رعایتی سیل کے نام پر لوٹ لیا۔ چونکہ ہمارا سیلز لورز سٹاف کا گاہکوں کے ساتھ مضبوط رابطہ رہتا ہے اس لئے میں یہ رائے دیتی ہوں کہ میگا مارٹ آئندہ اس قسم کے سودے اور معاہدے کرتے ہوئے اپنی نیک نامی کا بھی خیال رکھے۔“ صائمہ کی بات سن کر میٹنگ میں یکسر خاموشی چھا گئی۔ نعیم نے چند ذمہ داروں سے معاملے کی سرسری چھان بین کی، پھر فوراً ہی ایک کمیٹی تشکیل دے دی اور مکمل رپورٹ بنانے کا حکم صادر کیا۔ صائمہ کی رائے غالباً معاہدے کی کسی شق پر انتظامیہ کی رہنمائی کر رہی تھی۔

چند روز بعد الیکٹرانک آئٹمز کا شعبہ ازسرِنو تشکیل دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صائمہ کا تبادلہ بھی میک اپ اور سنگھار کے سامان والے شعبے میں کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اسے ترقی بھی مل گئی۔ اب وہ اپنے شعبے میں سیلز سپروائزر تھی اور میگا مارٹ کے اہم سٹاف میں شمار ہونے لگی تھی۔ وہ دنیا کے اطوار کھلے ذہن سے سمجھ رہی تھی، پھر اب اسے سلیم کی براہ راست توجہ بھی حاصل تھی۔

باس سے قریبی رابطہ صائمہ کے لئے بڑی آزمائش بنتا گیا۔ معاملہ مارٹ تک محدود رہتا تو دفتری ضرورت شمار ہوتا مگر سلیم صائمہ پر اس قدر بھروسہ کرتا تھا کہ مشکل پڑی تو اس نے اپنا گھر بھی صائمہ کے حوالے کر دیا۔

دل کا دورہ سلیم پر زیادہ کام اور مسلسل ذہنی تناؤ کی وجہ سے پڑا تھا۔ مارٹ ہی میں اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ ہسپتال پہنچایا گیا تو اس کی صحت مخدوش ہو چکی تھی اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔ کئی روز وہ ہسپتال ہی میں زیرِ علاج رہا، بعدازاں اسے گھر منتقل کر دیا گیا۔ صائمہ کو مجبوراً اس کے گھر کا انتظام سنبھالنا پڑا۔ وہ صبح سویرے سلیم کے گھر چلی جاتی اور رات گئے تک وہیں رہتی۔ یہ عبوری دور اس کے لئے کڑا امتحان ثابت ہوا۔ تمام وقت وہ نت نئے مسائل میں الجھی رہتی تھی، پھر کڑوی کسیلی باتیں بھی برداشت کرتی۔

ایک شام سلیم کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ دیگر احباب کی طرح صائمہ کی رات بھی ہسپتال میں کٹی۔ صبح دم سلیم کو افاقہ ہوا تو صائمہ اپنے گھر گئی مگر اس کے لئے اس دم وہاں ایک فساد تیار تھا۔ اس کا منگیتر خصوصاً اس کا منتظر تھا۔ اس روز گھر میں وہ ہنگامہ مچا کہ الاماں۔ احباب یہ بات طے کر چکے تھے کہ صائمہ ایک بدکردار لڑکی تھی اور اس پر کرم کرتا گویا برائی کو ہوا دیتا تھا۔

کئی روزہ کٹھن ڈیوٹی کے بعد صائمہ کو چھٹی ملی تھی، وہ بھی ساری اکارت ہو گئی۔ سلیم نے مارٹ سے اسے خطیر رقم بھی دلائی تھی تاکہ تھکاوٹ دور کرنے کے لئے وہ مناسب سیر و تفریح کر سکے مگر سیر و سیاحت تو دور کی بات تھی، اس کا اپنے گھر میں بسیرا بھی دشوار ہو گیا۔ وہ اپنے حالات پر کڑھتی اور نتائج پر روتی رہتی تھی۔ چھٹی ختم ہو جانے کے باوجود مارٹ نہ جا سکی۔ آخرکار اس نے اپنے آپ کو ذاتی کمرے میں قید کر لیا۔

صحت یابی پر سلیم اپنے دفتر پہنچا تو صائمہ کو ڈیوٹی پر نہ پا کر متفکر ہوا۔ اندیشے اس کے دل میں گھر کرنے لگے۔ اسے احساس جرم بھی ہوا۔ وہ پچھتانے لگا کہ نہ صرف اس نے غریب لڑکی کو اپنے گھریلو معاملات میں رگیدا تھا بلکہ اس کا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ سب کچھ اس لئے سرزد ہوا تھا کہ وہ اپنے ملازمین پر اختیار رکھتا تھا اور ان مجبوروں کو اپنی نوکریاں بچانے کے لئے اس کے تابع رہنا پڑتا تھا۔ حکم عدولی ان کے لئے قہر کا باعث بن سکتی تھی۔

سلیم کی پریشانی بڑھی تو ایک روز کسی بہانے سے وہ

بیوٹی ہوم چلا گیا۔ وہاں اس نے بناؤ سنگھار سے متعلقہ سامان کی فروخت پر بات چیت کی اور انتظامیہ سے ملا۔ عباس بھی وہاں موجود تھا۔ سلیم خصوصاً اس سے بے تکلف ہو گیا اور اسے میک اپ کرتے ہوئے دیکھا۔ بظاہر متاثر ہو کر اس نے مارٹ سے خرید کرنے کے لئے پیش قیمت فری دو چیزیں دیئے اور رابطہ رکھنے کی استدعا کی۔ اس نے عباس کا خصوصی شکریہ ادا کیا کہا کہ صائمہ کے گھرانے نے انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا اور صائمہ کو اجازت مرحمت کی تھی کہ وہ اپنے باس کی تیمارداری کر سکے۔ اس نے لڑکی کی عادات، شرافت اور ہمدردی کی تعریف کی اور اسے بہترین رفیقہ کے انتخاب پر مبارک باد دی۔

صائمہ دوبارہ مارٹ نہیں آنا چاہتی تھی مگر مستقلاً رخصت سے پہلے اسے رسمی کلیئرنس حاصل کرنا تھی۔ وہ اس مرحلے کی اہمیت سے آگاہ تھی۔ ایک روز ہمت جمع کر کے مارٹ پہنچ گئی۔ ارادتاً وہ سلیم سے پہلوتہی کرنا چاہتی تھی۔ صائمہ کو یوں اچانک دیکھ کر لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ سلیم اس طرف آیا تو ٹھٹک سا گیا۔ صائمہ پر نظر پڑی تو وہ اسے یاس و حسرت کی تصویر دکھائی دی۔ وہ انبوہ میں کھڑی آنسو بہا رہی تھی اور سہیلیاں اس کی دلجوئی کر رہی تھیں۔ ''تمہارا قصور نہیں بنتا، وہی وفا ناشناس نکلا''۔ ایک لڑکی اسے تسلی دے رہی تھی۔ سلیم بے چین ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔ لمحوں پر خاموشی چھا گئی۔

''کچھ اہم نہیں''۔ صائمہ نے چونک کر جواباً کہا۔ پھر اسی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی آنکھیں وجود میں درد کی گہرائی آشکار کر رہی تھیں۔ اذیت کا وہ لمحہ سلیم کی روح میں اتر گیا۔

''معاملہ کیا ہے؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ''آپ نے مارٹ کیوں چھوڑ دیا؟'' اس نے وضاحت مانگ لی۔

''زندگی درد کی کہانی بن جائے تو پھر نوکری کے کیا معنی؟'' سسکی ابھری پھر صائمہ کا لہجہ بھرا گیا۔

''سر! اس کی گردن ہار سے محروم ہو چکی''۔ اس لڑکی نے سلیم کی توجہ معاملے کی طرف مبذول کرائی۔ سلیم کو دھچکا لگا مگر اس نے اپنے جذبوں میں اعتدال رکھا اور دھیرے سے اپنا ہاتھ صائمہ کے سر پر رکھ دیا۔ ہمدردی کے نقش اس کے چہرے پر ابھر آئے۔ کچھ کہنے سے گریزاں وہ وہاں سے کھسک گیا مگر تھوڑی دیر بعد اس نے لڑکی کو اپنے دفتر بلوا لیا۔

صائمہ جانتی تھی کہ سلیم نے اسے تسلی کے چند کلمات سنانے کے لئے بلایا تھا اور اسے اب ہر صورت اس رسمی کارروائی سے گزرنا تھا۔ کرسی پر بیٹھی تو وہ ہمہ تن گوش ہو گئی مگر اس کے اندازوں کے برعکس سلیم اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ صائمہ سہم گئی، پریشان بھی ہوئی۔ وہ کرسی پر سے اٹھ جانا چاہتی تھی مگر سلیم کا اشارہ پا کر وہیں رک گئی۔ لحہ بھر دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، پھر سلیم نے اسے آنکھیں موند لینے کو کہا۔ صائمہ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا مگر سلیم کے اصرار پر آخر اس نے پلکیں جھکا دیں۔ سلیم نے آہستگی سے موتیوں سے مرصع نادر ہار اس کے گلے کی زینت بنا دیا، پھر حسب معمول اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ صائمہ چند لمحے ادراک اور معاملہ فہمی سے قاصر رہی۔ صورتِ حال اس کے لئے ناقابل یقین تھی۔ وہ ایسی غلط فہمی سے بھی گریزاں تھی جو تصور کی صورت ابھرے اور حقائق سے ٹکرا کر اسے فلک سے زمین پر پٹخ دے۔ لمحوں کے اس ابہام کی اس کی پُرتجسس نظروں نے سلیم کو چھو لیا، جو اس دم یقین کی دولت سے مالامال تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتھاہ گہرائی تھی، اعتماد تھا اور وہ پیغام تھا جو بالآخر صائمہ کے قلبی بحر میں بلاواسطہ اتر گیا۔

گھبراہٹ کے رنگ اس کے چہرے پر منقش ہوئے اور دل ابھرتے جذبوں کے ہیجان میں شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ غیر یقینی سے یقین کی طرف بڑھ آئی، مگر فوراً ہی اندیشوں تلے اس کی خردصورت حال میں کارفرما ہو گئی۔ خوف اور وسوسوں سے اس کا دماغ اٹھنے لگا۔

''سر! آپ خسارے کا سودا نہ کریں''۔ وہ بدحواسی کے عالم میں صرف اتنا کہہ سکی۔ دلوں کی بدلتی کیفیات میں وقت سرعت سے گزرتے لگا۔ لمحوں کے الجھاؤ میں اسے احساس ہوا کہ اس کے وجود کی گہرائیوں میں امید کی تازہ کونپل کھل اٹھی تھی، جو تمناؤں کے رچاؤ میں نمو پا کر تومند شجر کا روپ دھار رہی تھی۔ موہوم سی امید میں اسے زندگی کا انمول حسن نظر آنے لگا جو اس کا مقدر بن سکتا تھا۔ گفتگو کے سفر میں اب وہ اپنے گرد تخیلی حصاروں کے در کھولنا چاہتی تھی۔ سلیم کو صائمہ کے جذبوں میں وہ روپ دکھائی دے رہا تھا جو بڑھتے ہوئے باہمی قرب کے باعث پہلی بار آشکار ہوا تھا۔

''سر! اس ہار نے میرے وجود پر بوجھ ڈال دیا ہے''۔ وہ بولی۔

''کیوں؟''

''بلاشبہ یہ سجاوٹ میں یکتا ہے مگر ناچیز دنا تواں خوبیوں میں عرف نہیں''۔

''اس پہلو تمہیں بھانپ لینا میرا بھی معاملہ ہے''۔

''میں کمتر خاندان کی معمولی، سانولی اور پستہ قد لڑکی ہوں، کم تعلیم یافتہ''۔

''صائمہ! آپ ذمہ دار، بالغ نظر اور ہمدرد ہیں۔ آپ کا باطن بہت خوبصورت ہے۔ رہا معاملہ ظاہری وجاہت کا تو مخفی خوبیاں نکھارنے کی سعی عمر بھر جاری رہتی ہے''۔

''کیا آپ کے احباب مخمل میں ٹاٹ کا پیوند پسند کر لیں گے؟''

''ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، کبھی سونا انڈے میں زردی کے طور پر بھی پنہاں ہوتا ہے''۔

''کیا میں آپ کی قدآور شخصیت کے ساتھ نبھاؤ کر سکوں گی؟ سر! ذہن آہستہ کام کر رہا ہے، واقعات کی رفتار بہت تیز ہے''۔

سلیم نے صائمہ کا بازو تھام لیا۔ صائمہ چاہ کر بھی اس کی آنکھوں میں نہ جھانک سکی۔ وہ اپنا بازو بھی نہ چھڑا سکی۔ اس نے اپنے آپ کو سلیم کے سپرد کر دیا۔ لمحے طویل ہوئے تو اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

''صائمہ! سوچ لیں، آپ کے پاس وقت موجود ہے۔ یہ ہار اب آپ کا ہے، میں یہ واپس نہیں لوں گا لیکن اگر آپ میری تمنا مجھے لوٹانا چاہیں تو میں وہ ضرور واپس لے لوں گا۔ یہ نہ بھولیں کہ میری کائنات اور زندگی میں چھوٹی سی بیٹی بھی شامل ہے''۔

''سر! میں آج جہاں کھڑی ہوں، آپ ہی کے دم سے ہوں۔ ایک لاوارث لڑکی کو یوں پناہ مل جائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر خوش بختی اور کیا ہو گی؟ میں شام اپنے دادا سے ضرور بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ آرزو رد نہیں کریں گے''۔

صائمہ نے وعدہ کیا۔ اسے لگا کہ وہ کائنات فتح کر چکی تھی۔ اب وہ کہکشاں میں محوسفر تھی۔ زندگی میں اس سے بڑھ کر خوش وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس دم گلے میں مچلتا ہوا انمول ہار اسے اپنے تحفظ کا احساس دلا رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے پُراذیت دن معدوم ہو گئے تھے۔

''سر! معلوم نہیں کب سے آپ مجھے ان نگاہوں سے دیکھ رہے تھے؟'' وہ بول پڑی۔

''کون سی نظروں سے؟'' بات سن کر سلیم نے زوردار قہقہہ لگایا جبکہ صائمہ جھینپ کر رہ گئی۔

***

غزل

☆ شازیہ محسن
ایم اے انگلش

کھلی آنکھوں میں خوابوں کی ملاوٹ بھی ضروری ہے
فریبِ زندگی سے لگاوٹ بھی ضروری ہے

بہت اچھا نہیں ہوتا بہت ہی سہل ہو جانا
کبھی طرز و ادا میں بناوٹ بھی ضروری ہے

زباں سے جیت لینا خلق کو کچھ بھی نہیں مشکل
مگر اس کے لئے دل میں گھلاوٹ بھی ضروری ہے

یہ سچ ہے آہ و زاری سے بڑی تسکین ہوتی ہے
مگر اس طرزِ غم پر رکاوٹ بھی ضروری ہے

فلک پر جس طرح تاروں کے موتی جگمگاتے ہیں
زمیں پر کچھ ایسی ہی سجاوٹ بھی ضروری ہے

ستائشِ حُسن کی جب ہو کہ ہو دل بھی تر و تازہ
کہ اس سوکھی زمیں میں تراوٹ بھی ضروری ہے

خصوصی تحریر

پاکستان میں انتظامیہ بمقابلہ سیاستدان

ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

ملکی انتظام و انصرام ایک بہت مشکل، محنت طلب اور پیچیدہ کام ہے جس کے لئے بہت زیرک، صاحب کردار، دور دل کے حامل اور انتھک شخص کی ضرورت ہے جو سیاستدانوں کے بس کی بات نہیں۔

سید ریاض الحسن سکواڈرن لیڈر (ر)
0300-4533250

کار مرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است
(مولانا رومؒ)

تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی مختلف اداروں میں اختلافات شروع ہو گئے جو بتدریج بڑھتے بڑھتے تصادم کی صورت اختیار کر گئے۔ کئی حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن یہ طے نہیں ہو سکا کہ اصل اقتدار کا مالک کون ہے۔ کئی آئین بھی بنائے گئے، ان میں رنگا رنگ تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ جس کسی کو موقع ملا اس نے قانون کو اپنے اختیارات بڑھانے کے لئے استعمال کیا اور آئین کو اپنے حق میں جھکا لیا۔ ماہرین قوانین وکلاء کا خیال ہے کہ پاکستان کا تصور دینے والا بھی ایک وکیل تھا۔ تخلیق ملک بھی ایک وکیل کا کارنامہ ہے۔ ملک کو توڑنے میں بھی ایک وکیل کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا ملک کو ملت کو بازیچۂ اطفال بنانا وکلاء کا بنیادی حق ہے اور وہ اس حق کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ایک مشہور، نامور، ماہر علوم اسلامیہ کے دعویدار نہایت ہی کامیاب اور بلند مقام کے حامل اور قابل وکیل جناب اے کے بروہی سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ وہ کبھی مارشل لاء کے خلاف دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں اور کبھی مارشل لاء کے حق میں قانونی گوہر افشانی کرتے ہیں تو انہوں نے برملا فرمایا کہ جو ہمیں مناسب رقم ادا کرے ہم اس کے حق میں دلائل گڑھ لیتے ہیں۔ واہ! کیا جذبہ حب الوطنی اور اخلاقی معیار ہے جو زر کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح جج صاحبان بھی جو اکثر وکلاء ہوتے ہیں، کبھی نظریہ ضرورت، کبھی چمک کے زیر اثر اور کبھی غیر مرئی دباؤ کے تحت کئی ایسے فیصلے صادر فرماتے ہیں جس سے ملک کی تقدیر بدل جاتی ہے اور بعد میں وہ خود بھی مسکرا کر شرمندگی کا اظہار کر کے سرخرو ہو جاتے

ہیں۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پاکستان کے ایک ہر دلعزیز، عوام کے دل کی دھڑکن، جوڑ توڑ کے ماہر، ملک توڑ اور سازش جوڑ قسم کے وزیراعظم کو سات میں سے چار عظیم ججوں نے پھانسی کا حکم سنایا اور تین عظیم الشان منصفوں نے انہیں بے گناہ قرار دیا۔ اگر چار میں سے ایک بھی چوں چرک کے قائل ہوتے تو مرحوم آج بھی ہمارے سر کے سردار ہوتے کیونکہ سیاستدان زیادہ تر عوام کے پیارے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ذرا اوپر سے ہی پیارے ہوتے ہیں۔ ان کو خدا کے قریب کرنے کے لئے شہادت کے رتبے پر فائز کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور نامور راہنما جو تختہ دار کے قریب سے گزر گئے تھے ملک پر تیسری دفعہ مسلط ہیں اور وہ اس وقت تک ملک کی جان نہیں چھوڑیں گے جب تک ان کے منشور کے مطابق لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ نہیں ہوتا چاہے اس میں نصف صدی لگ جائے۔ عدالت عظمیٰ بھی ان کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے سے اجتناب کرتی ہے کیونکہ وہ عدالتوں پر حملہ کرانے کے بھی ماہر ہیں۔ جج صاحبان کے پاس تو بے نظیر قسم کی نظیریں موجود ہیں کہ حکومت اپنے فیصلے بذریعہ قوت بازو کراتی ہے۔

شہید وزیراعظم کو بے گناہ قرار دینے والے ایک محترم جج جناب جسٹس صفدر شاہ صاحب اسی قوت کا اشارہ پا کر ملک سے پیدل ہی افغانستان فرار ہو گئے اور برف باری کی نذر ہو گئے حالانکہ ان کے فرار کی بنیادی وجہ ان کی جعلی ڈگری کا شاخسانہ تھا مارشل لاء حکومت کی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہ تھا۔ ان کے ایک ساتھی جنہوں نے ملزم کو بری کرنے کے متعلق فیصلہ تحریر کیا وہ جناب جسٹس محمد حلیم تھے جو فیصلے کے بعد طویل عرصہ تک چیف جسٹس رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اسلامی مشاورتی کونسل کے سربراہ بنا دیئے۔۔۔ یہ سب کام صدر ضیاء الحق کے دور میں ہوئے اور صدر صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسی لئے وہ مارشل لاء کے دوران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فوج سیاستدانوں سے زبردستی حکومت چھین لیتی ہے اور عدلیہ سے اپنی مرضی کے فیصلے کراتی ہے بالکل خلاف واقع اور خلاف حقیقت ہے۔ فوج اس وقت حکومت پر قبضہ کرتی ہے جب سیاستدان خود اس کو دعوت دیتے ہیں اور پھر اکثر سیاستدان فوج سے بھرپور تعاون کرتے ہیں لیکن اپنی عادت ثانیہ اور ضرورت کے تحت بہت زیادہ بدعنوانیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں اور فوج کو بھی بدنام کر کے ان کے کچھ ساتھی جمہوریت، عوامی حقوق، حریت فکر اور آزادی اظہار جیسے خوشنما نعروں کی آڑ میں ملک کے اندر افراتفری پیدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال بنانے اور اقتدار حاصل کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ فوجی حکمران بھی ان کے چکر میں آ کر الیکشن کروا کر اس امید پر ان کو اقتدار دیتے ہیں کہ شاید ماضی سے سبق حاصل کر کے کچھ اچھے کام کرنے لگ جائیں لیکن یہ لوگ پیدائشی مجرم اور بہت شاطر کھلاڑی ہوتے ہیں لہٰذا اقتدار کے لئے خرچ کردہ دولت کو کئی گنا کر کے واپس حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور ان کے دل خوش کن وعدے اور دعوے بس صرف نعرے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی اندرونی و بیرونی لوٹ مار سے یہ بے تحاشا دولت اور ناقابل یقین مراعات حاصل کرتے رہتے ہیں چاہے ان کو عوام کا خون کیوں نہ نچوڑنا پڑے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کچھ ساتھی پھر فوج کو دعوت دیتے ہیں اور وہ اقتدار پر قبضہ کر کے حالات کو سنوارتی ہے۔ یہ چکر عرصہ دراز سے اسی طرح چل رہا ہے۔ اب حالات پھر اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ فوجی حکومت کے

علاوہ اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔

فوج سول حکومت کے ساتھ مل کر ملک و ملت کو بدعنوانی اور دہشت گردی کے گرداب سے نکالنے کے لئے بھرپور کوشش کر رہی ہے اور کئی سیاست دان فوج کے خلاف بیان دے کر اپنے خبث باطن کا اظہار کر رہے ہیں۔ وزیراعظم صاحب ہر کسی کو تھپکی بھی دیتے ہیں اور ان کے خلاف نیم دلی سے کارروائی بھی کرتے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں پولیس گردی کے سلسلہ میں رانا ثناء اللہ کو ذمہ دار قرار دے کر وزارت سے برطرف کر دیا اور کچھ عرصہ بعد وہ پھر وزارت پر براجمان ہو گئے کہ لوگ اب اس سانحہ کو بھول چکے ہوں گے۔ یہی صورت حال وزیر ماحولیات کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے۔ قوم کو بے وقوف بناتے بناتے ایک دن یہ لوگ پھر شکنجے میں آ جائیں گے۔

اب کے جو بچھڑے تو پھر خوابوں میں ملیں گے

پاکستان میں پہلا مارشل لاء جزوی طور پر قیام ملک کے چھ سال بعد لگا تھا جسے جنرل اعظم خاں کا مارشل لاء کہتے ہیں۔ یہ مسلم لیگ کا دور حکومت تھا اور وزیر اعلیٰ، وزیراعظم کو بدنام کرنا چاہتے تھے اس لئے قادیانی مسئلے کے سلسلہ میں فسادات کرائے گئے حالانکہ یہ مسئلہ افہام و تفہیم کے ذریعے آسانی سے قومی اسمبلی میں حل ہو سکتا تھا جیسا کہ بیس سال بعد کر لیا گیا۔

آنچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار!

انہی جیسے حالات کو بنیاد بنا کر نوکر شاہی کے نمائندہ گورنر جنرل غلام محمد ملک صاحب نے وزیراعظم کو برطرف کر دیا۔ جناب ملک صاحب قائداعظمؒ کے خصوصی معتمد، ایماندار اور سخت گیر حاکم تھے۔ محترم قائدؒ نے ان کو کرپٹ اور کھوٹے سکے ٹائپ سیاستدانوں پر مسلط کیا تھا۔ بعدازاں وہ خود ہی گورنر جنرل بن گئے۔

جناب چوہدری صاحب کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ انہوں نے ملک و ملت کو سمجھوتوں سے بھرپور ایک اسلامی آئین بھی عطا کیا۔ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دیا۔ ون یونٹ کا تحفہ بھی انہی کا عنایت کردہ ہے۔ ملک دشمن قرار دیے جانے والے سرخپوش راہنما ڈاکٹر خان صاحب کو ون یونٹ حکومت کا سربراہ بنایا اور ایک نئی ملغوبہ ٹائپ ریپبلکن پارٹی کی تشکیل کو بھی انہوں نے آسان بنایا جس میں مسلم لیگی لیڈروں نے راتوں رات شامل ہو کر اپنے تئیں قابل فخر کارنامہ کروانا۔

اس موقع پر جناب قائد عوام بھی سٹیج پر نمودار ہوئے۔ جناب سکندر مرزا ان کے والد گرامی کے دوست تھے، اس لئے یہ جدید تعلیمیافتہ نوجوان بے دھڑک ایوان صدر میں آتا رہتا تھا اور صدر صاحب کا ہم پیالہ و نوالہ بن گیا۔ صدر صاحب نے ان کا نام اقوام متحدہ کے وفد کے لئے شامل کرنا چاہا۔ وزیراعظم چوہدری محمد علی نے قائد عوام کا انٹرویو کر کے ان کے متعلق ریمارکس دیے کہ یہ نوجوان ناپختہ ذہن کا حامل، شوباز اور اپنے علم، تجربہ اور ذہانت سے زیادہ ہوشیار ہے لہٰذا اسے وفد میں شامل کرنا ملک کے لئے بدنامی کا باعث ہو گا۔ اگلے سال جناب سکندر مرزا نئے آئین کے تحت منتخب صدر مملکت بن چکے تھے اس لئے انہوں نے وزیراعظم کی سخت مخالفت کے باوجود قائد عوام کو بہ اصرار وفد میں شامل کرایا تو چوہدری محمد علی مستعفی ہو گئے اور جناب سہروردی وزیراعظم بن گئے۔ وہ قائد عوام کی طرح شراب و کباب و شباب کے دلدادہ تھے لہٰذا ان دونوں کی خوب بن آئی اور قائد عوام بہت جلد بہ اور قدر و منزلت کے ساتھ میدان سیاست میں وارد ہو گئے۔ پرانے دوست اور باہمی تعاون کے حامل جناب سکندر مرزا اور چوہدری محمد علی کے خلاف یہ قائد عوام کی سازش کا پہلا شاخسانہ تھا۔ اس کے بعد چل سو چل۔ قائد عوام صدر صاحب کے منظور نظر بن گئے۔ انہی کے

ایما پر صدر صاحب نے تین وزرائے اعظم کو چلتا کیا اور مسلم لیگی سیاستدانوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ کچھ سیاستدانوں نے جلسے، جلوس اور طویل مارچ شروع کیے تو صدر صاحب نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور قائد عوام ملک کے سب سے کم عمر وزیر بن گئے۔ پھر انہوں نے صدر مملکت اور آرمی چیف کے درمیان رنجش پیدا کی اور جناب سکندر مرزا اپنی تمام تر سیاسی، فوجی اور سول مہارت اور طویل تجربہ کے باوجود صدارت سے محروم ہوئے اور ملک بدر کردیئے گئے۔ اپنی مالی ایمانداری کی وجہ سے لندن میں کسمپرسی کی زندگی بسر کی اور نہایت گمنامی کے عالم میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

جناب مرزا صاحب سے سیاسی و اقتصادی مفادات حاصل کرنے والے ان کے بے شمار ابن الوقت دوستوں میں سے کسی کو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ کسمپرسی میں ان کی دادرسی کرتا۔ بیماری میں ان کی تیمارداری کرتا یا وصال کے موقع پر ان کی مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھاتا اور انہیں خاموشی سے ایران میں دفن کردیا گیا۔

کتنا بدنصیب ہے ظفر کہ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

پاکستان کے ابتدائی گیارہ سالوں میں سیاستدانوں نے انتہائی لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا۔ مسلم لیگ میں اکثر لیڈر جاگیردار اور سرمایہ دار تھے جو اپنی دولت اور اثر و رسوخ کی بنا پر پارلیمنٹ میں اکثریت تو لے گئے لیکن انہیں ملک و ملت کی فلاح و بہبود کا نہ احساس تھا اور نہ ہی ضرورت۔ ان کی خواہش مال و اقتدار تھا جس سے وہ آج تک نسل در نسل مستفید ہو رہے ہیں۔ نوکر شاہی میں افسران اعلیٰ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور تربیت یافتہ تھے۔ لیکن وہ فرنگی ماحول کے پروردہ اور دلدادہ تھے جنہوں نے انگریزوں کی برائیاں تو اختیار کرلیں اور ان کو خوب ترقی دی لیکن ان کی خوبیاں مثلاً وقت کی پابندی، عدل و انصاف اور خوش انتظامی وغیرہ کو بری طرح نظر انداز کیا۔

1980ء کی دہائی میں میں نے تقریباً پورے پنجاب کا دورہ کیا اور چیف سیکرٹری پنجاب کو خط لکھا کہ پنجاب کا کوئی ڈی سی اور کمشنر وقت کی پابندی نہیں کرتا اور عوام سے ملاقات کی بجائے سیاستدانوں سے میل جول میں مصروف رہتا ہے لیکن چیف سیکرٹری صاحب نے کوئی احساس نہیں کیا کیونکہ وہ خود اور ان کے ساتھی سول سیکرٹریٹ میں بھی وطیرہ اپنائے ہوئے تھے۔

تشکیل پاکستان کے سلسلہ میں اور نقل آبادی کے بارہ میں راہنماؤں نے جس بے نیازی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کیا وہ بقول قائداعظم ان کے کھوٹے سکے ہونے کا بہت واضح اور تاریخی ثبوت ہے۔ عوام جن کو بعض نام نہاد مؤرخ انصار مدینہ کے مثل قرار دیتے ہیں انہوں نے لوٹ مار، قتل و غارت اور فتنہ و فساد کے ریکارڈ قائم کیے۔ متروکہ املاک پر جس طرح قبضہ کیا گیا اور مختلف عمارتوں میں لوٹ مار کرکے ان کے دروازے اور کھڑکیاں بھی اتار کر لے گئے اور مہاجرین کو کیمپوں میں رکھ کر ان کی خدمت سے ثواب دارین حاصل کرتے رہے۔ یہ ان کی عجیب قسم کی دوغلی پالیسی ہے کہ مہاجرین کے حق پہ تو قبضہ کرلیا اور ان کو خود بے یار و مددگار بنا کر ان میں صدقہ و خیرات تقسیم کرتے رہے۔ بعض مسلم لوگ اتنے لاابالی قسم کے تھے کہ غیر مسلموں سے لٹ لٹا کر آنے والے مظلوم خاندانوں کی معصوم بچیوں کی سودے بازی میں ملوث پائے گئے۔

ہمارے ایک چھوٹے سے شہر کے ایک لیڈر جو برطانوی دور کے دوران کسی معمولی ملازمت سے فارغ کیے گئے تھے انہوں نے مشرقی پنجاب میں ایک ادنیٰ سا کاروبار شروع کردیا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ مغربی پنجاب

میں مہاجر بن کے اپنے ہی آبائی شہر میں وارد ہوئے اور اپنے اثر ورسوخ اور چالاکی سے کافی متروکہ جائیداد پر قبضہ کرلیا اور کالے کاروبار کے ذریعے اتنی دولت حاصل کر لی کہ چند سالوں میں وہ کروڑ پتی بن گئے۔ بعد ازاں سیاست میں حصہ لیا۔ بہت زیادہ مال و دولت خرچ کر کے وفاقی وزیر تک کا مقام حاصل کیا۔ کسی کی غلطی سے وہ شہید ہو گئے اور ان کی آل اولاد ابھی تک اعلیٰ مقامات پر فائز چلی آ رہی ہے۔ ان کا پورا خاندان خواتین سمیت قرضے معاف کرانے والے بارسوخ لوگوں میں شامل چلا آ رہا ہے لیکن انہوں نے مہاجرین کی خدمت بہت کی اور ابھی تک لاکھوں روپے ماہوار کے وظائف غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں وغیرہ میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ ان کے ایک نوخیز عزیز برخوردار نے اوائل سیاسی کیریئر میں ایک سرکاری محکمے کو تقریباً اسی کروڑ روپے کا ٹیکا لگایا۔ گرفتار بھی ہوا اور پولیس کے زیر حساب بھی رہا لیکن اس کے والد صاحب نے گرتی ہوئی عوامی حکومت کے ساتھ تعاون کر کے برخوردار کو رہا کرا لیا۔ اب وہ پھر وہ میدان سیاست کا شہسوار ہے اور آئندہ انتخابات کے بعد اس کے خادم اعلیٰ بننے کے روشن امکانات ہیں۔

مسلم لیگ کے اتنے عالیشان اور ترقی پسند دماغوں کے ہوتے ہوئے کسی شخص نے انتقال آبادی کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی اور سوا کروڑ افراد کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ جانی و مالی قربانی دینے والوں اور خاندان کی عزت اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں لٹانے والوں کو ابھی تک پناہ گیر خیال کیا جاتا ہے اور مقامی لوگ ان کے حصہ پر قبضہ کر کے اپنی کئی آئندہ نسلوں کو سنوار چکے ہیں۔ اب سندھ میں انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کئی شہری علاقوں میں اپنا سیاسی مقام بنایا تو ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔

بے شک ملک میں امن و امان عنقا رہا ہے اور دہشتگردی کی انتہا رہی ہے لیکن فوج نے کافی حد تک حالات پر قابو پا لیا ہے لیکن یہ ایک عارضی اور وقتی حل ہے۔ لاقانونیت کا مستقل طور پر خاتمہ اور حسن انتظام کا دور دورہ اسی وقت ممکن ہے اگر ذمہ داروں کا کڑا احتساب کیا جائے اور ان کو عبرتناک سزائیں دی جائیں۔ ملٹری کارروائی کے دوران واویلا کرنے والوں اور فوج پر الزام تراشی کرنے والوں کی گرفت نہایت ضروری ہے۔ یہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں انتہائی مشکل دور میں ایک ایسا آرمی چیف میسر آ گیا ہے جو انتہائی قابل، معاملہ فہم، دور اندیش، جرأت مند اور ہر دلعزیز شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے قلیل مدت میں قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ تقریباً ساٹھ سال بعد ہمیں ایک راہنما ملا ہے جو ملکی مسائل کو سمجھتا ہے اور ان کے حل میں بہ دل و جان تگ و دو اور جدوجہد کر رہا ہے۔ اگر مسائل کو وقتی طور پر حل کر کے پھر ملک سیاستدانوں کے سپرد کر دیا گیا تو وہ سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیں گے۔ کیونکہ

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
(علامہ اقبال)

ملکی انتظام و انصرام ایک بہت مشکل، محنت طلب اور پیچیدہ کام ہے جس میں کامیابی کے لئے بہت زیرک، صاحب کردار، درد دل کے حامل، سادگی کے خوگر، مثالی عمل کے دلدادہ اور انتھک شخصیت کی ضرورت ہے جو سیاستدانوں کے بس کی بات نہیں۔ سیاست میں زیادہ تر جاگیردار اور سرمایہ دار شامل ہوتے ہیں جو بغیر محنت سے حاصل شدہ وسائل سے عیش و عشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذہنی عیاشی کی خاطر پہلے مرغ، کتے اور بیل لڑا کر تماشا دیکھتے تھے اور اب الیکشن وغیرہ میں انسانوں کو لڑا کر محظوظ ہوتے ہیں۔ ہر سیاستدان نے سینکڑوں کے حساب سے جیالے متوالے پالے ہوئے ہیں جو اچھے

آقاؤں کے ایما پر ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہتے ہیں اور حکومت ان پر گرفت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ حکومتی ارکان کے متوالے اور دل پسند لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے آقا ان کو مختلف سرکاری اور نیم سرکاری شعبوں میں بھرتی بھی کرا دیتے ہیں لہٰذا مختلف محکموں میں بدعنوانی سیاستدانوں کے زیر نگرانی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ایماندار افسر غلط کاروں کو روکنے کی کوشش کرے تو اسے رولنگ سٹون بنا دیا جاتا ہے۔ بعض اچھی شہرت اور اعلیٰ قابلیت کے حامل افسران زیادہ ملازمت بطور کار خصوصی طور پر گزارتے ہیں یا ان کو ایسے شعبوں میں لگا دیا جاتا ہے جسے عرف عام میں کھڈے لائن لگانا کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک مشہور صوبائی سیکرٹری یزدانی ملک ہوا کرتے تھے جو کچھ عرصہ بہاولپور میں کمشنر بھی تعینات رہے تھے۔ وہاں کے ایم پی اے قریشی صاحب سے ان کے تعلقات کچھ خراب چلے آ رہے تھے۔ اسمبلی ہال گیلری میں ان دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہو گئی تو حکومت نے سیکرٹری صاحب کو معطل کر دیا۔ عدالت عظمیٰ نے ان کو انیس سال بعد بمع تمام مراعات بحال کر دیا لیکن حکومت نے ایسا قانون بنا دیا کہ وہاں وہ تمام مراعات سے محروم رہے اور بہت کسمپرسی کی حالت میں مرحوم ہو گئے۔

پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کا دور مثالی قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے دو گورنرز سخت گیر نواب آف کالاباغ اور ہر دلعزیز گورنر جنرل اعظم خاں کے ذریعے بہت شاندار طریقہ سے حکومت کی۔ ہر شعبہ میں عظیم الشان ترقی ہوئی۔ امن و امان کی حالت بہت اعلیٰ تھی۔ صنعتی اور زرعی ترقی قابل رشک تھی۔ عوام خوشحال، ملازمین مطمئن، گرانی ناپید اور ضروریات زندگی کی فراوانی تھی لیکن قائد عوام کی رفاقت ان کو لے ڈوبی۔ قائد عوام نے صدر صاحب اور گورنرز کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کیں۔ ملک میں آرمی چیف کی سرکشی کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکائے پھر اپنی سوشلزم کی آڑ میں صدر صاحب کو تاشقند لے گئے اور اعلانیہ معاہدہ کرایا۔ خود کابینہ سے علیحدہ ہو کر تاشقند معاہدے میں خفیہ شقوں کا حوالہ دے کے ملک میں افراتفری اور فساد برپا کر دیا۔ چند شہروں کے جاہل اور جذباتی جیالوں نے وہ طوفان بدتمیزی مچایا کہ صدر صاحب ملک میں مارشل لاء لگا کر خود گوشہ نشین ہو گئے۔

اگر ملک میں دستور کے مطابق 1970ء میں صدارتی انتخابات ہو جاتے تو اس وقت ہمارے ہاں تین ایسے محب وطن، قابل، ہر دلعزیز اور اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے راہنما موجود تھے جو ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھتے۔ وہ تھے جناب ائر مارشل اصغر خاں، جنرل اعظم خاں اور جسٹس محبوب مرشد۔ اگر وہ باری باری دو دو ٹرمز کے لئے صدر منتخب ہو جاتے تو گزشتہ صدی کے اختتام تک پاکستان واقعی ایشین ٹائیگر بن جاتا۔ اس مقصد کے لئے قائد عوام کو بروقت درجہ شہادت پر فائز کرنا ضروری تھا اور بگٹی بندھو کا بھی مناسب بندوبست کرنا لازمی تھا لیکن برا ہو سیاستدانوں کا کہ انہوں نے ان دو طالع آزماؤں کو ملک تباہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس طرح اچھے راہنماؤں سے ملک محروم ہو گیا اور مسائل کی آماجگاہ بن گیا۔

اس وقت ملک فوجی کارروائیوں اور ملٹری کورٹس کی وجہ سے امن و امان کا گہوارہ بنتا جا رہا ہے لیکن سیاستدانوں کو ایسی صورت حال وارے میں نہیں۔ وہ گاہے بگاہے شر انگیز اور فتنہ پرداز بیان دیتے رہتے ہیں۔

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند

ملک کو ہر قسم کی دہشتگردی سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے سیاستدانوں کو پابند سلاسل یا ملک بدر کرنا ضروری ہے اور یہ عرصہ بقول پیر پگاڑا مرحوم کم از کم

پچاس برس پر محیط ہونا چاہئے تاکہ ان شرپسندوں کی آئندہ نسلیں بھی توبہ کر کے کوئی کام کرنے کے عادی بن جائیں۔ ملک کے اندر حسن انتظام کے لئے سول اور ملٹری افسران کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہئے یہ لوگ ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ، مناسب تربیت کے حامل اور ہر سطح کے تجربات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی راہنمائی کرنا ان کی زندگی اور سروس کا حصہ ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کی طرح ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے اور باہمی دشنام طرازی کے عادی نہیں ہوتے۔ میڈیا میں ان رہنے کے لئے الزام تراشی اور بے پرکی ہانکنے کے عادی نہیں۔ یہ نظم و نسق کے پابند، سینئرز کی عزت کرنے والے اور جونیئرز سے شفقت سے پیش آنے کا وطیرہ اختیار کر کے کامیاب و کامران اور باعزت زندگی بسر کرتے ہیں۔ سیاستدانوں کی طرح نہیں کہ ایک صوبے کا وزیر اعلیٰ صدر مملکت کو زر بابا اور چالیس چور قرار دے کر اسے گریبان سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹنے کا اعلان کرے اور اقتدار کو خطرہ ہو تو اس کی چاپلوسی شروع کر دے۔ سول اور ملٹری افسران کو بلند ترین عہدہ پر پہنچنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا زیادہ تر تعلق عام لوگوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ ان کے مسائل کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اپنی قابلیت کی بناء پر آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ اگر سول اور ملٹری اکیڈیمیز میں قرآن و سنت اور اسلامی فقہ کی تعلیم کا مناسب بندوبست ہو تو تربیت یافتہ افسران خلفائے راشدین کا سا حسن انتظام رائج کر سکتے ہیں۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے
(علامہ اقبال)

او جبار قہار کہاوے

کرنل صاحب کو اپنے علم پر بڑا تکبر تھا۔ وہ اکثر مذہب کے بارے میں ا
یسی ایسی باتیں کر جاتے تھے کہ سننے والا ایک دفعہ کانپ جاتا تھا۔

☆ حبیب اشرف صبوحی

غالباً حضرت باہو کا ہی کلام ہے کہ

پڑھے دا توں مان کریں نہ

آکھیں تے میں پڑھیا

او جبار قہار کہاوے

ستاں روزہ نیلے دُدھ کڑھیا

یعنی کبھی بھی اپنی قابلیت اور تعلیم کا زعم نہ کرنا۔ سروری اور قہاری اسی کی ذات کو زیبا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارا رہا سہا بھی ضائع کر دے۔ جگہ جگہ تعلیمات میں یہ بات بھی آئی ہے کہ شرک کے بعد اگر خداوند تعالیٰ کو کوئی بات ناپسند ہے تو وہ "میں" ہے۔ "میں" نے یہ کر دیا۔ "میں" یہ کر سکتا ہوں۔ "میں" یہ نہیں کروں گا۔ غرض یہ "میں" قبر کے گڑھے تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اُسے کن تہرے پانیوں اور پستیوں کے حوالے کر دیتی ہے اور وہ اس کا احساس نہیں کر پاتا۔

ایک شخص بظاہر بہت متقی ہوتا ہے، ہمدرد اور غریب پرور ہوتا ہے لیکن عمداً یا غیر دانستگی میں چھوٹا سا ... رہتا ہے کہ اس کی اگلی پچھلی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کو لنگر لٹانے والا خود دانے دانے کو محتاج ہو جاتا ہے۔ درج ذیل چند واقعات سے جو کہ میرے ذاتی مشاہدے میں ہیں، قارئین میری بات کی صداقت کا بخوبی اندازہ کر سکیں گے۔

☆... میرے ایک عزیز محکمہ خوراک میں ایک آفیسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ گھر میں خاصی خوشحالی تھی۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا اور وہ بہت مہمان نواز تھے۔ ہر کسی کے دُکھ درد میں کام آتے تھے۔ معاشرے میں اُن کا ایک مقام تھا۔ ریٹائرمنٹ سے چند سال قبل اُن پر ایک دفتری مقدمہ بن گیا۔ کئی سال مقدمہ چلا اور اُس کے بعد اُن کو جبری ریٹائر کر دیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے موقع پر اُن کے تمام واجبات ضبط ہو گئے اور پنشن بھی بند ہو گئی۔ اپنے واجبات کی بحالی کے لئے عدالت میں مقدمہ کر دیا گیا۔ کئی سال مقدمہ چلا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سرکاری رہائش گاہ بھی خالی کرنی پڑی۔ کوئی ذاتی مکان بھی نہیں بنوایا تھا۔ کرایہ کا مکان لینا پڑا۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے بچوں نے تعلیم کو خیرباد کہا اور ملازمت شروع کر دی۔ وہ گھرانا جس میں ہر وقت دوستوں، رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا سب نے منہ موڑ لیا اور بیگانہ ہو گئے۔

ابھی مالی حالات اور گھریلو پریشانیاں کم نہیں ہوئی تھیں کہ گھر کے سربراہ پر فالج کا اٹیک ہو گیا۔ جوں جوں ان کا علاج ہوتا اُن کا مرض طول پکڑتا جاتا۔ اُن کے بچے دن رات اُن کی خدمت کرتے۔ دوست اور رشتہ دار جہاں تک ہو سکتا تھا اُن کی مالی مدد کرتے۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل میں کراچی گیا، اُن سے ملاقات کی، نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ یہ وہی شخص تھے جن کے ہاتھ سے لوگوں کو فیض پہنچتا تھا۔ جن کے گھر خوشحالی کا ڈیرہ تھا، آج وہ لوگوں سے زکوٰۃ اور خیرات کا مطالبہ کرتا ہے۔

بڑے دکھ اور درد بھرے الفاظ میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے کبھی ایسے حالات کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ جب تک میں صحت مند تھا اور اقتدار میں تھا، میرا خیال ہے کہ میں نے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ ہی آمدنی کے لئے کوئی ناجائز ذریعہ استعمال کیا۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ شاید مجھ سے انجانے میں کوئی ایسی غلطی ہوگئی ہے کہ جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے گناہوں کو معاف کرے اور مجھے آزمائش میں نہ ڈالے اور اگر آزمائش میں ڈالے تو مجھے توفیق دے کہ میں ثابت قدم رہوں۔

میں نے ان کے خیالات کی تائید کی اور ان کی جلد صحت یابی کی دعائیں کر کے آ گیا۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی مغفرت کی دعا کی، اُن کی کسمپرسی کی موت کا بہت افسوس ہوا۔

☆......میرے چچا کے داماد بہت قابل آدمی تھے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی اُس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے جدید اسلحہ سازی میں انجینئرنگ کی، وہاں کچھ عرصہ ایک ادارے میں ملازمت کی اور اُس کے بعد پاکستان آ گئے۔ یہاں پاکستان آرمی میں نوکری کی درخواست دی۔ اُن کی قابلیت اور تجربے کو دیکھتے ہوئے انہیں کرنل کے عہدے پر فائز کیا گیا اور اس کے علاوہ دیگر سہولتیں دی گئیں۔ کچھ عرصہ ملازمت کی۔ ملازمت کے دوران کچھ دماغی حالت ایسی خراب ہوئی کہ استعفیٰ دے دیا۔ دفتر کے لوگوں نے بہت کہا کہ میڈیکل گراؤنڈ پر چھٹی لے لیں اور علاج کرانے کے بعد آ جائیں لیکن انہوں نے کہا کہ میں نے نوکری نہیں کرنی۔

نوکری چھوڑنے کے بعد کراچی آ گئے۔ بیوی پڑھی لکھی تھی، اس کو ایک اچھے اسکول میں نوکری مل گئی۔ کرایہ کا مکان لے کر گزارا کرنا شروع کر دیا۔ ایک بیٹا تھا جو بہت قابل تھا، انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھا کہ ایک دم سے اُس کا دماغ بھی خراب ہو گیا اور پڑھائی چھوڑ دی۔ سارا دن گھر میں لیٹا رہتا اور عجیب عجیب حرکتیں کرتا۔ باپ کی بیماری اُس کو بھی لگ گئی۔ بیوی نے کرنل صاحب کو بڑی مشکل سے راضی کیا کہ میں اپنے اسکول کے مالک سے کہہ کر اسکول میں نوکری دلوا دیتی ہوں۔ ایک مصروفیت بھی رہے گی اور گھر کا خرچہ بھی چلتا رہے گا۔ بڑی مشکلوں سے اسکول میں اکاؤنٹینٹ کی نوکری مل گئی۔ چند ماہ صحیح طریقے سے کام کیا اس کے بعد ایک ٹیچر کو غیر اخلاقی خط لکھ دیا جس کی بناء پر اسکول کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ سارا دن گھر پر چائے اور سگریٹ پیتے رہتے اور اوٹ پٹانگ لکھتے رہتے۔ بیوی بہت ہمت والی تھی، صبح ملازمت کرتی اور گھر آنے کے بعد دو ذہنی مریضوں کو سنبھالتی۔

کرنل صاحب کو اپنے علم پر بڑا تکبر تھا۔ وہ اکثر مذہب کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کر جاتے تھے کہ سننے والا ایک دفعہ کانپ جاتا تھا۔ اُن کو کئی دفعہ سمجھایا لیکن وہ کسی کی نہیں مانتے تھے۔

بہر حال انہی حالات میں اُن کا انتقال ہو گیا اور

کسمپرسی کی حالت میں اس دنیا سے گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔ زیادہ علم حاصل کرنا بہادری نہیں بلکہ اس علم کو ہضم کرنا بہادری ہے۔

☆ میرے ایک سسرالی عزیز پی آئی اے میں سٹیشن منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ پاکستان میں بھی اور پاکستان کے باہر بھی تعیناتی رہی۔ بہت بااخلاق اور خوش طبع انسان تھے۔ دن عید اور رات شب برأت کی طرح گزر رہے تھے۔ بہت خوشحالی تھی کبھی بُرے حالات کا سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک بچپن کے دوست نے انہیں کاروبار کا مشورہ دیا۔ شروع میں تھوڑا بہت فائدہ ہوا، دوست نے اُن کو بہت سبز باغ دکھائے، انہوں نے اس کے کہنے پر آ کر نوکری چھوڑ دی اور اس کے ساتھ پارٹنرشپ میں کاروبار شروع کر دیا۔ کاروبار میں نشیب و فراز آتے رہے اور کچھ عرصے کے بعد کاروبار کا ایسا دیوالیہ ہوا کہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے۔ کرایہ کا بڑا شاندار گھر تھا، جب کاروبار ختم ہو گیا تو بڑا گھر چھوڑ کر چھوٹے سے گھر میں آ گئے۔ اتنے سال ملازمت کے دوران نہ کوئی گھر بنایا اور نہ کسی بچے بچی کی شادی کی۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ خاندان والوں سے کہا کہ مجھے زکوٰۃ خیرات دو۔ آخری عمر میں ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے۔ انتقال سے ایک ماہ قبل میں کافی مدت بعد ملنے گیا۔ پہلے تو پہچانے نہیں، جب کچھ پہچانے تو کہنے لگے۔ میرے مالی حالات خراب ہیں، میری مدد کریں۔ میرے پاس جو کچھ تھا دے دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بعض دفعہ بہکی بہکی باتیں بھی کرتے تھے۔ انہی حالات میں اُن کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ پناہ مانگنی چاہئے بُرے وقت سے اور آزمائش سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

حالات حاضرہ

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی 3600 کلو میٹر لمبی سرحد ہے اور بیک وقت تین خوفناک جنگی ڈاکٹرائن کی زد میں ہے۔

کولڈ سٹارٹ ڈاکٹرائن

☆ گلزار اختر کاشمیری

بھارت نے ماہ جولائی اور اگست 2015ء میں بڑے پیمانے پر سرحدی حملے شروع کر دیئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف اگست میں تیس سے زیادہ سویلین افراد شہید ہو چکے ہیں اور چھ سو سے زیادہ لوگ زخمی ہو چکے ہیں آزاد کشمیر میں کوٹلی، نکیال، پونچھ اور حویلی میں جنگ بندی لائن کے قریب کے تمام سکول بند کر دیئے گئے ہیں۔ جنگ بندی لائن کی دوسری طرف سے بھی اطلاعات ہیں کہ بھارت آبادی کا انخلاء کر رہا ہے۔

وادی نیلم میں کرن سیکٹر میں ایک گاؤں بگنہ ہے یہ کبھی آزاد کشمیر میں رہا۔ 1971ء میں مقبوضہ علاقے میں چلا گیا تھا۔ بعد میں پھر تقسیم ہو گیا۔ آدھا مقبوضہ کشمیر میں اور آدھا آزاد کشمیر میں آ گیا۔ درمیان میں ایک نالہ ہے جو کنٹرول لائن بن گئی اور یہ مقبوضہ کشمیر کا بھی آخری گاؤں ہے جہاں آبادی ہے۔ یہ بستی اجڑ چکی ہے۔ 1990ء میں بھی یہ گاؤں بھارتی گولہ باری کا نشانہ بنا۔ آج بھی جب گولہ باری شروع ہوئی تو یہاں کے لوگ راتوں رات اپنا گھر بار چھوڑ کر اونچے مقام کی طرف بھاگ نکلے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھی بگنہ گاؤں کے لوگوں کو نوٹس ملا کہ یہ آبادی خالی کر کے پیچھے چلے جائیں۔ آج اس گاؤں کے مکان تو کھڑے ہیں مگر مکین کوئی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح کیرنی منڈہار ضلع حویلی کا آخری گاؤں جہاں دونوں طرف آبادیوں کا انخلاء ہو چکا ہے۔ نیزہ پیر، چاند ٹیکری کی آبادیاں بھی خالی ہو گئی ہیں۔

بھارتی میڈیا کے مطابق بھارتی افواج جنگ بندی لائن کے قریب قریب اکٹھی ہو رہی ہیں۔ اس طرح توپ خانہ بھی نصب ہو رہا ہے۔ بھارتی فوجیوں کی چھٹیاں منسوخ ہو گئی ہیں۔ جنگ بندی لائن پر جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ آبادی کا انخلاء ہو رہا ہے۔ وادی کشمیر کے اندر کشمیری عوام پر جارحیت خطے کے لئے خطرہ بنتی جا رہی ہے۔ پاکستان L.O.C پر بلا اشتعال بھارتی فائرنگ کی طرف عالمی ممالک کی توجہ مبذول کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ

کے مصر مشن نے بھی دو تین مرتبہ ایل او سی کا دورہ کیا۔ امریکی وفد نے بھی ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کیا۔ اس وفد کو بھی سویلین شہادتوں اور نقصانات سے آگاہ کیا گیا۔ حال ہی میں بھارتی آرمی چیف نے بھی بھارتی فوج کو پاکستان کے خلاف جارحیت کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی عزائم ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ مقبوضہ وادی میں آئے دن آبادیوں میں کریک ڈاؤن ہو رہے ہیں، انسانیت کی تذلیل ہو رہی ہے۔ عزت مآب خواتین کی توہین ہو رہی ہے اور بھارتی فوج کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

انسانی حقوق کی تنظیموں کو وادی میں نہیں جانے دیا جا رہا۔ عدالتیں بھی بے بس ہو چکی اور بعض تعصب کا شکار ہیں۔ وہاں کا "نافذ" قانون فوجیوں کو اختیار دے رہا ہے جو مرضی کر، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ بھارتی حکومت کا یہ مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے لانا ضروری ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ بھارت سرحدی خلاف ورزیوں کے ذریعے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟ بعض عسکری تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ پاک فوج نے جو "ضرب عضب" کے ذریعے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ اس میں "را" اور اس کے بہت سارے تربیت یافتہ ایجنٹ مارے گئے اور جو تھوڑے بہت بچے ہوئے ہیں ان کو دوبارہ منظم ہونے کے لئے موقع چاہئے۔ پاکستانی تقریباً ایک لاکھ فوجی "ضرب عضب" میں مصروف ہیں ایل او سی پر سرحدی خلاف ورزیوں کے ذریعے پاکستانی فوج کو تقسیم کر کے دہشت گردوں کو منظم ہونے کے لئے وقت چاہئے۔ فوج کا کچھ حصہ جب مشرقی بارڈر کی طرف متوجہ ہو گا تو "را" کے تخریب کاروں کو موقع مل جائے گا۔

کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ بھارت نے "کولڈ سٹارٹ ڈاکٹرائن" پر کام شروع کر دیا ہے جس کے تین پلان ہیں۔ مودی حکومت نے پہلے خارجہ سیکرٹریوں کی بات چیت منسوخ کی اور کشمیریوں سے ملاقات کا بہانہ بنایا۔ اب اسی بہانے قومی سلامتی کے مشیروں کی بات چیت ختم کی اس کشیدگی کے ماحول میں بعض بھارتی تھنک ٹینک مودی کو جنگ کے آپشن پر غور کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر راجیش راجہ گوپالن دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اور ایک ریسرچ ادارے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ بھارت آزاد کشمیر پر حملہ کر دے کیونکہ یہ بھارت کا اپنا علاقہ ہے۔ جس پر پاکستان کا قبضہ ہے۔ اسی طرح بھارتی قومی سلامتی کا مشیر بھی آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

بھارتی قومی سلامتی کے مشیر نے کہا ہے کہ اگر جنگ ہوئی تو یہ روایتی جنگ ہو گی اس میں ایٹمی ہتھیار استعمال ہونے کا امکان نہیں۔ یعنی بھارت فیصلہ کن جنگ اور کسی فوجی کارروائی کے آپشن کو آزمائے تو پاکستان بھی روایتی جنگ ہی لڑے گا۔ یہ کہا جاتا ہے بھارت آزاد کشمیر پر چھاتا بردار کمانڈو ایکشن اس وجہ سے آزمانا چاہتا ہے کہ افغانستان کے راستے امریکہ نے ایبٹ آباد آپریشن کیا تو پاکستان کوئی کارروائی نہیں کر سکا۔ اسے پاکستان کی کمزوری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بھارتی ریسرچ ادارے کہہ رہے ہیں کہ بارڈر فائرنگ دہشت گردی اور حریت رہنماؤں سے بات چیت پر اصرار نے مودی حکومت کا ناک میں دم کر رکھا ہے اس لئے وہ کچھ کرے۔ مگر اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ جنگ ہوئی تو بھارت کا نقصان زیادہ ہو گا۔ یہی بات نیویارک ٹائم نے حالیہ اشاعت میں اداریے میں لکھی ہے۔ مودی حکومت کے ایک ترجمان نے کہا بھارت میں مذاکرات کی حمایت کرنے والے پاکستان کے حمایت کرنے والے ہیں۔ اس نے کہا کہ مصالحت اور حمایت کرنے والے مبصرین اور دانشوروں کو اگر قوم دشمن نہیں تو

کم از کم ان کو تو مودوست بھی نہیں سمجھا جا رہا۔

اس نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ جوہری ہتھیاروں کی صلاحیت کے باوجود جنگ کی صورت میں جوہری ہتھیار استعمال نہیں ہوں گے۔ ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ بھارت کو اب جنگ اور فوجی کارروائی کے آپشن پر غور کرنا چاہئے۔ بھارت کے بعض تجزیہ نگاروں کا خیال کہ پاکستان اقتصادی اور فوجی اعتبار سے ان دنوں کافی کمزور ہو چکا ہے جبکہ اس کے برعکس بھارت کی اقتصادی طاقت کے ساتھ اس کی فوجی قوت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ نریندر مودی کا اپنا خیال بھی یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر کشمیر کے سلسلے میں فضا بھارت کے حق میں ہے۔ بھارت مضبوط حالت میں ہے اور بھارت اپنا موقف تسلیم کرانے کے لئے پاکستان کو مجبور کر سکتا ہے۔

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی 3600 کلو میٹر لمبی سرحد ہے اور پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو بیک وقت تین خوفناک جنگی ڈاکٹرائن کی زد میں ہے۔ اس میں نمبر 1 آزاد کشمیر کے حوالے سے بھارت کی منصوبہ بندی ہے جس پر اوپر سطور میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ وادی کشمیر میں آئے روز ہنگامے، پاکستانی پرچم لہرانا، مجاہدین کی کارروائیاں، حریت کانفرنس کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا مطالبہ مودی حکومت کے لئے یہ بڑی پریشانی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آزاد کشمیر پر قبضہ ہونے کی صورت میں مسئلہ کشمیر سے جان چھوٹ جائے گی۔ مقبوضہ وادی میں بھی لوگ بددل ہو کر خاموش ہو جائیں گے۔ بین الاقوامی برادری بھی اس پر زیادہ مداخلت نہیں کرے گی چونکہ پہلے ہی "کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ" کا نعرہ موجود ہے۔ بھارت کہہ بھی سکتا ہے کہ بھارت نے بین الاقوامی سرحد کراس نہیں کی بلکہ کشمیر کی لائن آف کنٹرول کو کراس کیا ہے۔

دوسری جنگی ڈاکٹرائن میں بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس میں گوادر کی بندرگاہ کی اہمیت بلوچستان میں سونے، تانبے، لوہے، کوئلے اور تیل کے بے پناہ ذخائر موجود ہیں۔ امریکہ، بھارت اور اسرائیل تینوں کی نظریں بلوچستان پر ہیں۔ گوادر کی بندگارہ سے وسط ایشیا کی طرف تجارت، چین اور روس کی طرف اقتصادی راہداری اور افغانستان کی طرف آسان راستہ اور اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ چین کے ساتھ پاکستان کی اقتصادی راہداری، صنعتی یونٹس کا قیام، اس کی تکمیل کی صورت میں خالی بندرگاہ سے دوسرے ممالک کے سامان کے آنے جانے سے پاکستان اتنا کمائے گا کہ سال کے بجٹ سے زیادہ رقم اس اقتصادی شاہرات سے حاصل ہو گی۔ یہ بھارت اور امریکہ دونوں کو گوارا نہیں ہے۔ بھارت ایران میں چاہ بہار بندرگاہ پر بڑی انوسٹمنٹ کر چکا۔ گوادر کی بندرگاہ چاہ بہار بندرگاہ چاہ بہار بندرگاہ کے لئے موت ہے۔ امریکہ نے بھی اپنے جانی دشمن ایران سے سمجھوتہ اسی خاطر کیا۔ یہ سارے معاملات دشمن برداشت نہیں کر پا رہا۔

براہمداغ بگٹی، خان آف قلات یہ مہرے تھے جن کو بھارت پرورش کر رہا تھا مگر "ضرب عضب" نے اس کا بیڑا غرق کر دیا۔ بلوچستان میں لوگ اب ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ براہمداغ بگٹی اور خان آف قلات اب حکومت سے ملاقات کے لئے تیار ہو چکے ہیں جو بھارت کے لئے سیاسی موت ہے۔ بھارت کی تیسری ڈاکٹرائن "کولڈ سٹار ڈاکٹرائن" ہے۔ اس کے لئے بھارت گزشتہ دس سال سے تیاری کر رہا تھا۔ بھارتی فوج کی آٹھ میں سے 6 کمانڈو بٹالین پاکستانی سرحد پر ڈپلائے ہیں۔ اس ڈاکٹرائن کے لئے انڈین فوج کی مشقیں اور فوجی حکمت عملی کے لئے سڑکوں، پلوں اور ریلوے لائنوں کی تعمیر اور اسلحے کے بڑے بڑے ذخائر جمع کئے گئے ہیں۔ اس ڈاکٹرائن کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ بھارتی افواج

جنھیں سندھ میں جغرافیائی گہرائی حاصل ہے۔ بڑے حملے کے ساتھ داخل ہوں گی۔ سندھ کو پاکستان سے کاٹتے ہوئے گوادر بلوچستان کی طرف بڑھیں گی۔ اس حکمت عملی کا انحصار ان علاقوں میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے پروردہ دہشت گرد گروہوں کی کارکردگی پر منحصر ہے۔

انٹیلی جنس کے باخبر ذرائع بتاتے ہیں کہ اس ڈاکٹرائن میں سندھ کے علیحدگی پسند گروپ (جسقم) اور بلوچستان کے دہشت گرد گروپ اور کراچی کے جاوید لنگڑا والا گروپ مرکزی کردار ادا کریں گے۔ ان کے ذریعے مقامی نقل و حرکت اور ذرائع مواصلات کو نشانہ بنا کر پاکستانی افواج کے جوابی حملے کی طاقت کو محدود اور منتشر کیا جائے گا۔ بھارتی برق رفتار دستے تیزی سے اپنی مورچہ بندیاں کر کے علاقے پر کنٹرول حاصل کریں گے۔

پاکستان آرمی نے اس کی جوابی حکمت عملی طے کر لی تھی۔ گزشتہ عرصہ میں ''عزم نو'' کے نام سے جو جنگی مشقیں کی گئیں وہ اسی ڈاکٹرائن کے تدارک کے لئے کی گئی تھیں۔ اب کراچی، حیدرآباد، سندھ اور بلوچستان میں بھارتی ایجنسی ''را'' کا نیٹ ورک بہت حد تک توڑ دیا گیا ہے۔ بلوچستان کی صورت حال کافی تبدیل ہو گئی ہے۔ بلوچستان میں بڑی تعداد میں دہشت گرد مارے گئے ہیں۔ 14 اگست 2015ء کو 400 لوگوں نے ہتھیار جمع کرا کر معافی مانگ لی مزید لوگ بھی اس راستے پر آنے لگے ہیں۔ اب پاک آرمی اس پوزیشن میں ہے کہ بھارت نے اگر یہ غلطی کی تو ماضی کی ''براس ٹیک آپریشن'' کی طرح اس کا ملیامیٹ ان شاء اللہ ہو گا۔ بھارت نے چونکہ اس پر بڑے وسائل صرف کیے ہیں اب یہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ بھارت کے ایجنٹوں کا نیٹ ورک بھی بڑی حد تک توڑ دیا گیا مگر اب بھی اس کے کچھ ایجنٹ کراچی اور سندھ میں روپوش ہیں۔ کراچی کے میٹروپولیٹن ایریا میں ''را'' کو بعض لسانی گروپوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ یہی دراصل ''را'' کے سلیپنگ سیلز تھے جس کے ذریعے اس علاقے میں ''را'' کا متحرک رہنے کا راز تھا۔ ان لسانی گروپوں میں اردو بولنے والے ہی نہیں بلکہ سندھی بولنے والے اور بلوچی شدت پسند بھی شامل ہیں ''ضرب عضب'' کی وجہ سے ''را'' کے ایجنٹوں پر بڑا کڑا وقت آیا ہوا ہے۔ مورخہ 3 ستمبر 2015ء کے بھارت کے اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' میں ایک ایسی ہی رپورٹ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اخبار انٹرنیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ خبر لگی ہے۔

1974ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا، 1978ء میں انہیں اطلاع ہوئی کہ پاکستان بھی ایٹم بم بنا رہا ہے۔ 1981ء میں بھارتی نیوکلیئر کمیشن کے چیئرمین راجہ رامن نے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو مشورہ دیا کہ جس طرح اسرائیل نے بغداد کے نواح میں عراق کے ایٹمی مرکز ''اسیراک'' کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی طرح اس سے پیشتر کہ پاکستان ایٹم بم بنائے بھارت کو حملہ کر کے پاکستانی ایٹمی مرکز کو تباہ کر دینا چاہئے۔ راجا رامن نے اسرائیل سے تعاون لینے کا مشورہ دیا۔ اندرا گاندھی نے اس مشورہ پر سنجیدگی سے سوچنے کا وعدہ کیا۔ آرمی اور ائیرفورس سے مشورے کے بعد متعدد جنگجو اور بمبار طیاروں نے دو ہزار پاؤنڈ کے بموں کے ساتھ حملہ کرنا تھا۔

اسی دوران ویانا میں ایٹمی توانائی کے معاملات کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں بھارتی ایٹمی کمیشن کے چیئرمین راجہ رامن اور پاکستانی ایٹمی کمیشن کے چیئرمین منیر احمد خان بھی شریک ہوئے۔ وہاں موجود آسٹریا میں پاکستانی سفیر عبدالستار نے چیئرمین منیر احمد کو بھارت کے اس منصوبے کے بارے میں بتایا۔ منیر احمد نے اسی شام بھارتی چیئرمین راجہ رامن کو کھانے پر اپنے ہوٹل امپیریل میں دعوت دی۔ انہوں

نے رابعہ رامن کو پُرتکلف کھانا کھلایا۔ اٹھنے سے پہلے راجہ رامن سے کہا۔

''مسٹر چیئرمین آپ نے پاکستان کے ایٹمی مرکز پر حملے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ ہم تک پہنچ چکا ہے۔ میں بس یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ ایسی کوئی حرکت ہوئی تو بمبئی میں ''ٹرامبے'' ایٹمی مرکز کو پوری طرح تباہ کر دیا جائے گا اور یہ محض ابتدا ہوگی''۔

''ٹائمز آف انڈیا'' کے مطابق راجہ رامن اپنے منصوبے کے افشا ہونے کے بعد منیر احمد کی دھمکی سے بوکھلا گیا۔ کانفرنس ختم ہونے پر دہلی میں پہنچتے ہی وہ وزیراعظم اندرا گاندھی کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ منصوبہ فاش ہوگیا ہے۔ اس پر عمل روک دیا جائے۔ اسی دوران امریکی سی آئی اے کو بھی اطلاع ہوگئی۔ امریکہ نے بھارت کو فوری پیغام دیا کہ وہ اس خطرناک حرکت سے باز آئے۔ اس کے ساتھ ہی چین کی طرف سے بھی وارننگ دی گئی کہ اس طرح کی حرکت کا انجام بہت سخت ہوگا۔ اس پر اندرا گاندھی نے منصوبہ ترک کر دیا۔

پاکستانی اور بھارتی جنگی قوت کا تجزیہ

اس حقیقت کا ادراک بھارتی حکومت کو ہو چکا ہے کہ پاکستان کو بھارتی فوج کی عددی برتری کے باوجود بعض معاملات میں پاک فوج کو ایڈوانٹیج حاصل ہے۔ پاکستان کے آرمڈ ڈویژن بھارتی علاقوں میں دور تک جا کر کارروائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بھارت اگر سمجھتا ہے کہ روایتی جنگ میں میدان مار سکتا ہے تو اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جنگ کسی ایک شعبے میں نہیں ہوتی۔ پاکستان کی دفاعی صلاحیتوں کا پورا میکنزم سمجھنا ہوگا۔ بلیسٹک اور کروز میزائلوں کے شعبے میں پاکستان بھارت سے بہت آگے ہے۔ پاکستان بھارت کے تمام علاقوں تک مار کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پاکستان کے تیار کردہ میزائل روایتی اور جوہری دونوں طرح کے ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تازہ تجربات نے یہ برتری ثابت کر دی ہے۔

پچھلے ایک مضمون میں میزائل کے شعبے اور پاکستانی تیار کردہ ڈرون اور برق میزائل کا تفصیل سے تجزیہ شائع ہو چکا ہے۔ بھارت اس شعبے میں ہزیمت سے دوچار ہے۔ 1990ء میں ریگستانی علاقوں میں دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے سینٹرل کور آف ریزروز بنائی گئی تھی۔ یہ کور مکمل طور پر میکنائزڈ ہے جس کا کام ایک طرف تو دشمن کو روکنا ہے دوسری طرف آگے بڑھنا بھی ہیں نئی تشکیل پانے والی سٹریٹجک کور سمیت پاکستان کی دس کورز ہیں۔ بھارت کے پاس 34 ڈویژن فوج ہے۔ پاکستان کے پاس پہلے 26 ڈویژن فوج تھی اب 28 ڈویژن ہے۔ پاکستان کے پاس 2 آرمڈ ڈویژن اور دس خودمختار آرمڈ بریگیڈ ہیں۔ اس وقت افغان سرحد سے ملحق علاقے میں دہشت گردوں کی بیخ کنی کے لئے ایک لاکھ پاکستانی فوج تعینات ہے۔ سپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) 2 بریگیڈ اور 2 ائربورن بریگیڈ (2 بٹالین) پر مشتمل ہے۔ پاکستانی فوج کے پاس 360 ہیلی کاپٹر دو ہزار سے زائد ہیوی گنز اور تین ہزار آرمڈ گاڑیاں ہیں۔ پاکستان کے پاس اہم اینٹی ٹینک ہتھیاروں میں ٹوتو میک تو بکتر شکن اور ایف جی ایم A.T.GM148 شامل ہیں۔ آرمی ایئر ڈیفنس کے لئے S.A.7 گریل جنرل ڈائنامکس F.I.M92 سنگر G.D.F.I.M.Z.I کئی طرح کے سرفیس ٹو ایئر میزائل ہیں۔ ریڈار سے کنٹرول اور لیکون بھی ہے۔ جو سینڈرز A.C.K-A.CK ویپن سسٹم ہے۔ پاکستان کے پاس بلیسٹک میزائل انوینٹری بھی کافی تعداد میں موجود ہے۔ جو درمیانے فاصلے تک مار کرتے ہیں۔ درمیانے فاصلے تک غوری میزائل اول، دوم، شاہین دوم مختصر فاصلے تک مار کرنے والے حتف، ابدالی،

غزنوی، نصر، شاہین اوّل اور ایم دان دان نمایاں ہیں۔
پاکستان کے پاس تمام بالاسٹک میزائل جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض میزائل کئی طرح کے ہتھیار لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ روایتی اور جوہری ہتھیار لے جانے والا بابر بلاسٹک میزائل پاکستان کی سٹریٹجک دفاعی انونٹری میں تازہ ترین اضافہ ہے۔ اس میزائل میں راڈار کو دھوکہ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ میزائل دکھائی دیئے بغیر کلکتے تک مار کر سکتا ہے۔ بلیسٹک میزائل کی صنعت میں پاکستان بھارت سے آگے ہے۔

پاکستان نے اپنی میزائل انونٹری میں حال ہی میں ایسے ٹیکٹیکل میزائل کا اضافہ کیا ہے جو تھوڑے فاصلے پر فوجیوں کے اجتماع کو تباہ کر سکتا ہے اور یہ جوہری ہتھیار بھی لے جا سکتا ہے۔ پاکستانی فضائیہ کے پاس نو سو ائرکرافٹ ہیں جبکہ بھارت کے پاس 1800 کرافٹ ہیں۔ مگر بھارت کے پاس زیادہ ٹرانسپورٹ طیارے ہیں۔ پاکستان کے پاس 230 جبکہ بھارت کے پاس 700 ٹرانسپورٹ طیارے ہیں۔ پاکستان کے پاس 9 ائربورن راڈار ہیں جبکہ بھارت کے پاس ایسے صرف تین راڈار ہیں۔ پاکستان کے پاس 48 اٹیک ہیلی کاپٹر ہیں جبکہ بھارت کے پاس 120 اٹیک ہیلی کاپٹر ہیں۔ پاکستانی فضائیہ کے پاس 100 اپ گریڈ ایف سولہ طیارے اور 200 ری بلٹ میراج طیارے ہیں جو رات اور دن یکساں دیکھنے والے نظام سے لیس ہیں۔ یہ طیارے جوہری ہتھیار لے جانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان تمام طیاروں کو نئے دفاعی سسٹم ایویانکس سسٹم سے آراستہ کیا گیا ہے۔ پاکستان ایروناٹیکل کمپلیکس کامرہ میں جدید ترین طیارے بنانے کا عمل جاری ہے۔ J.F تھنڈر فورتھ جنریشن فائٹر ائرکرافٹ کے 8 طیارے فضائیہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ چین کو J-F-19 36 طیاروں کا آرڈر دیا ہوا ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔

بحری قوت میں بھارت کو برتری حاصل ہے۔
بھارت کے پاس مختلف اقسام کے 184 جہاز ہیں جبکہ پاکستان کے پاس صرف 84 ہیں۔ بھارتی بحریہ کے پاس 28 جہاز ہیں جبکہ پاکستان کے پاس 10 آبدوزیں ہیں۔ اس عدم مساوات کے باوجود پاکستانی بحریہ بھارتی پانیوں میں دور تک داخل ہو کر نشانہ لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے پاس پہلے ایک ہی بندرگاہ تھی کراچی کی، اب دو اور گہری بندرگاہ تیار ہو گئی ہیں۔ گوادر اور ماڑہ ان دونوں بندرگاہوں کو سڑک کے ساتھ ملک کے کونے کونے سے جوڑا جا رہا ہے تاکہ محاصرے کی صورت میں یا کسی بھی مشکل صورت حال میں بندرگاہوں سے مال ملک کے ہر حصے میں پہنچ سکے اور بین الاقوامی تجارت متاثر نہ ہو۔ شاید یہی وہ نکتہ ہے جس نے بھارتیوں کی نیند حرام کر رکھی ہے اس لئے وہ گوادر بندرگاہ کی تعمیر اور اسے ایکٹو کرنے کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔

اس سارے تجزیے کے باوجود اگر بھارت اب بھی پاکستان سے روایتی جنگ جیتنے کے خواب دیکھ رہا ہے تو اس کی اس کو بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ پاکستان سے جنگ کے نتیجے میں اسے صنعتی، تجارتی اور اس کے بنیادی ڈھانچے کو شدید تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر نوبت جوہری ہتھیاروں تک پہنچی تو پاکستان کے پاس 120 اور بھارت کے پاس 100 ایٹم بم ہیں۔ پاکستان آخری حربے کے طور پر ایٹم بم استعمال کر سکتا ہے۔ اتنا بڑا ملک بھارت صرف سات ایٹم بم کے ساتھ نیست و نابود ہو جائے گا۔ پاکستان اگر خدانخواستہ ختم ہو گیا تو دنیا میں 49 اور مسلمان ملک میں اسلام اور مسلمان موجود رہیں گے۔ مگر ہندو دنیا میں ایک ہی ملک ہے وہ ختم ہو گیا تو دنیا کو ہندوؤں سے نجات مل جائے گی۔

***

خصوصی کہانی

لفظ لفظ وطن کی محبت میں ڈوبی داستان

زخم خوردہ

☆ اختر حسین شیخ

آخری قسط

فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ کاغذات پر وہ سڑک پکی بھی تھی اور کشادہ بھی لیکن تابو کے لئے جیپ کا سٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں نے سیاہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ شب تاریک میں وہ رات کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ تابو آتشیں اسلحے کے علاوہ خنجر زنی میں بھی مہارت حاصل کر چکی تھی۔ جیپ میں دشمن کی تباہی کا سارا سامان موجود تھا۔ ڈیبی نے ان کے ہمراہ آنے کی ضد کی تھی لیکن راجو نے سختی سے اس کی مخالفت کی تھی۔

"عزیزم! شگون کا ایک زاویہ آزاد اور کھلا رہنا چاہئے۔ موبائل فون پر ہم تمہیں اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں گے"۔ ڈیبی اپنے راہبر کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ راجو بے لگام ہونا اور رہنا چاہتا ہے۔ جب وہ دشمن کو نیست و نابود کرنے کی خاطر کسی خصوصی مہم کا آغاز کرتا تو اس کا یہی انداز ہوا کرتا تھا۔

"تابو رانی! دوست نما دشمن نقصان کی آخری حد ہوا کرتا ہے"۔ راجو نے اس کی ذہنی تربیت کی خاطر کہا۔ "کافر کے مقابلے میں منافق زیادہ زہریلا اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ منافق اپنوں کے روپ میں وار کرتا ہے اور انسان اس کے وار کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ اتنا یاد رہے کہ شخص جس سے ہمارا سامنا ہونے والا ہے دوست نما دشمن ہے لیکن آج ہم اس کی خباثت اسی پر لوٹانے جا رہے ہیں"۔

"میں سمجھتی ہوں جی، بس ان کا "کلیجہ" ہے جیسے میں نے اپنے شاہ بہرام کو چیرنے پھاڑنے والی اس نامراد کتیا کے ٹکڑے کر ڈالے تھے"۔

تابو کی گرفت سٹیئرنگ پر مزید مضبوط ہو گئی پھر اس نے اچانک ہنگامی انداز میں بریک لگا دیئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ عین سامنے سڑک کے بیچ چار آدمی ہتھیاروں سے مسلح راستہ روکے کھڑے تھے۔ فوجی جیپ دیکھ کر ایک پل کے لئے وہ تردد کا شکار ہوئے لیکن پھر ان کا سرغنہ معتدل قدموں سے چلتا ہوا جیپ کی طرف آنے لگا۔ ساری بات پل بھر میں جیپ سواروں کی سمجھ میں آ گئی۔

"تابو رانی! کوئی زور رعایت نہیں ہو گی۔ یہ لوگ ڈکیت اور دہشت گرد ہیں اور ان کے دلوں میں فوج کا احترام بھی اٹھ چکا ہے۔ ان ہوس پرستوں کو نیک و بد سمجھانا ہی پڑے گا۔ تمہیں علم ہے اس صورت حال میں کیا کرنا ہے؟"

"چنتا نہ کریں جی، رب خیر کرے گا"۔ تابو نے سرسری لہجے میں کہا۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور سامنے کا منظر تمام تر جزئیات کے ساتھ واضح تھا۔

"آپ لوگ جیپ چھوڑ کر باہر آ جائیں۔ ہمیں اس وقت گاڑی کی اشد ضرورت ہے"۔ سرغنے نے کلاشنکوف کندھے سے اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھی بھی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔

جیپ سوار برق رفتاری سے دائیں بائیں چھلانگیں لگا کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ چاروں ڈاکو روشنی میں تھے۔ سرغنے نے اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

"فوجی بھائیوں نے ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے۔ لہٰذا تشدد کی ضرورت نہیں"۔ ان الفاظ کی گونج ابھی فضا ہی میں تھی کہ سڑک کے دونوں اطراف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ شب کا سناٹا درہم برہم ہو گیا۔ یہ کراس فائرنگ کی بڑی عمدہ مثال تھی۔ لوٹنے والے اپنی سانسوں کے سرمائے سے محروم ہو گئے۔ تابو اور راجو اندھیرے میں سے باہر آئے۔ دونوں کے چہروں پر ملال وغیرہ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

''رانی تابو! ان حالات میں بندے کو چوکسی لوڑنے کی ضرورت ہے''۔ راجو نے پاؤں کی ٹھوکر سے سرغنے کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''جب اپنوں بیگانوں کو بُرے بھلے کی تمیز نہ رہے تو بندہ کیا کرے؟''

''آپ نے تاں ان بے چاروں کو صفائی کا موقع بھی نہیں دتا''۔

''صفایا تو تم نے بھی کر دیا بے چاروں کا؟''

''میرا تو جی کام ہی جھاڑو پھیرنا ہے۔ آپ دا حکم ہووے کا تے ''ہو تھا'' پھیر دیاں گی۔ پر آپ نے آبادی وچ چار بندیاں دی کمی کر دتی اے''۔

''ان کو تم بندے کہہ رہی ہو؟ یہ بندے ہوتے تو بندوں کا جینا حرام نہ کر دیتے''۔ پھر راجو نے ایک عجیب مثال دی۔ ''جب میرے بال ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو میرے لئے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں، میں ان کو فوراً کٹوا دیتا ہوں۔ ان کا وجود بھی بے گناہوں کے لئے تکلیف کا باعث تھا۔ چلو اب پینڈا کھوٹا ہو رہا ہے''۔

پیرو شاہ سے آگے سرحدی گاؤں ان کی منزل تھی۔ اس گاؤں میں بہروپیا کپتان رہائش پذیر تھا۔ کشمیر کی سرحد قریب ہی تھی۔ سرحدی بستیوں میں ابن الوقت حضرات بہتر زندگی گزارتے ہیں۔ ادھر اُدھر کے تعلقات بھی بہ آسانی بحال ہو جاتے ہیں۔ محب وطن لوگوں کو البتہ آزمائش کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان بستیوں کا مزاج بہرحال عام دیہاتوں سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔

تابو اگرچہ مردانہ لباس میں تھی لیکن فوجی لباس بھی اس کی نسوانیت کو مکمل طور پر چھپا نہیں سکا تھا۔ رات نصف سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب انہوں نے بستی کے نسبتاً الگ مکان پر دستک دی۔ دروازہ ایک مضبوط قد کاٹھ کی ادھیڑ عمر خاتون نے کھولا۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے آنے والوں کا بغور جائزہ لیا۔ ''شریف انسانو! یہ کون سا وقت ہے دروازوں پر چاند ماری کرنے کا''۔

''ماسی! مہمانوں سے مٹھی گل کرنی چاہیئے''۔ تابو نے مسکرا کر کہا۔ ''مہمان تے رب کی رحمت ہوتے ہیں''۔

''آ میری بھانجی رحمت بی بی اندر آ جا''۔ خاتون نے بے تکلفی سے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے ساتھ کون مشٹنڈا ہے۔ مجھے تو تم دونوں ''واردایے'' دکھائی دیتے ہو۔ خیر، بُری نیت سے آئے ہو تو واپسی کا خیال دل سے نکال دو۔ میں چوہدری نظام کی رکھی ہوں۔ بُرے کو زمین میں زندہ گاڑ دیتی ہوں۔ کمین شمین (کمّن) کے بکھیڑے میں نہیں پڑتی''۔ خاتون واقعی کوئی توپ صفت معلوم ہوتی تھی۔

''ہائے سوہنی! تُو تو بالکل میرے جیسی ہے''۔ تابو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ یہ مشٹنڈا نہیں فوجی کپتان ہے۔ بندہ مرد مازقسم کا ہے پر میرا مالک ہے''۔ آخری فقرہ اس نے سرگوشی میں کہا۔

''سوہنا منڈا ہے، بڑی جلدی کرنیل جرنیل بن جائے گا!'' خاتون نے رضوان کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو شوق سے گاتی رہنا ''میرا ماہی رنگ رنگیلا، جرنیل نی کرنیل نی''۔

''ہائے ماسی! بے شرمی کی باتاں نہ کر''۔ تابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آدھی رات، ڈکیت گھڑی، اسے بغل میں لئے پھرتی ہو، بے شرم مجھے کہہ رہی ہو۔ خیر، مجھے کیا خود بھگتو گی جیسے میں بھگت رہی ہوں''۔ خاتون کا لہجہ اچانک سوگوار ہو گیا۔ ''میری ایک گل پلے باندھ لے، اسے نتھ ڈال کر نہ رکھا تو پچھتاؤ گی''۔

''خدا کا خوف کر ماسی! میں تاں ان کے قدموں کی غلام ہوں، نتھ کیسے ڈال سکتی ہوں۔ یاریاں وچ حکم نہیں چلتا۔ اپنی ہستی مٹانی پڑتی ہے''۔

دونوں آرام سے چارپائی پر بیٹھ گئے تو خاتون نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

"ماسی! بن بلائے سہی مہمان تو ہیں۔ کوئی خاطر شاطر کوئی چا، شا"۔ رضوان نے بھی ماحول کے عین مطابق بے تکلفی کا سہارا لیا۔

"پہلے یہ بتاؤ آئے کس کام سے ہو؟ اس گاؤں میں کس کی یاد تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے"۔

"یاد تو نہیں خیر، ہم "رحمے چھاٹ" سے ملاقات کرنے آئے ہیں"۔ رضوان نے خاتون کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو تم رحمت خاں چھٹ کے ملاقاتی ہو؟ اس کمزور ذہنی کتیا کی اولاد کے ملاقاتیوں کو تو میں بس زہر پلا سکتی ہوں یا گولی کے حوالے کر سکتی ہوں"۔ یہ کہتے ہی اس شیرنی نے رضوان کو پستول کی زد پر لے لیا۔ دونوں حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ خاتون نے جس برق رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا اس کی انہیں امید ہی نہ تھی۔ بس کسی جادوگرنی کی طرح اس نے ہاتھ کو جنبش دی اور پستول اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ "چلو میری بھانجی تم بھی اپنے یار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو وصال یار کا موقع فراہم کر رہی ہوں"۔

"واہ...... ماسی جی خوش کر دیا تو نے"۔ رضوان نے پستول کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سنو برخوردار!" خاتون نے گرج کر کہا۔ "کسی غلط فہمی میں نہ رہنا، یہ گھر پاکستانی غیرت مندوں کا ہے، رحمے چھاٹ جیسے ہیجڑوں کے دوست اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے اور اگر اندر آ جائیں تو دوسری دنیا کو سدھار جاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کی مشکوک اولاد وطن فروشی کرتا ہے اور جنگلی بھیڑیے کا نطفہ اس کی پیدائش کا سبب تھا"۔

شہروں سے دور ایک سرحدی گاؤں میں اس شیر دل خاتون نے راجو کا دل باغ باغ کر دیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک ناقابل تسخیر قلعے میں بیٹھا ہو۔ ایسا قلعہ جو وطن عزیز کے وقار میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ وہ بڑے احترام سے محبت وطن خاتون کو دیکھنے لگا۔

"ماسی فردوس! اس پستول کو دشمنوں کے لئے رکھ دو"۔ رضوان نے شیریں لہجے میں کہا۔ "اپنوں کے سینے چھلنی ہو جائیں تو ساری عمر رونا پڑتا ہے اور بندے کی عمر بڑی طویل ہو جاتی ہے۔ تم جیسی وطن پرست ہستی کے تو ہم پرستار ہیں۔ ہم رحمے چھاٹ کے دوست نہیں اس کا خون پینے آئے ہیں۔ تماشا دیکھنا چاہتی تو ابھی چلو ہمارے ساتھ، ہمارا اس کا سامنا کرا دو"۔

"میرا نام فردوس نہیں جنت ہے"۔ خاتون نے پستول نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"ماسی جی! اکو گل ہے (ایک ہی بات ہے) جنت اور فردوس میں کوئی فرق تے نہیں ہوندا"۔ تابو نے بھی بڑی رسان سے کہا۔ "میرا سائیں تجھے "الویں" جہاد دکھتا ہے۔ ہم تو ابھی چار خنزیراں نوں ذبح کر کے آئے آں"۔

"تابو رانی! خنزیر کو ذبح نہیں کیا جاتا، ان کا "جھٹکا" کیا جاتا ہے۔ ذبح تو حلال جانور کیے جاتے ہیں"۔ رضوان نے محبت بھری نگاہوں سے محبوبہ دلنواز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی ایک کا حلیہ بتاؤ"۔ ماسی نے کہا۔ وہ دراصل اپنی تسلی چاہتی تھی۔

"محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے کا تو ہمیں موقع نہیں ملا مگر ان کا سرغنہ، ناٹے قد کا جنگلی بھینسا دکھائی دیتا تھا"۔ راجو نے ذہن پر زور دے کر حلیہ بیان کرنا شروع کیا۔ "گھنگھریالے بالوں کو اس نے مہندی لگا رکھی تھی اور دونوں کانوں میں مندریاں چمک رہی تھیں۔ عمر چالیس پچاس کے پیٹے میں ہوگا، چہرے سے پتہ ہے ...

کا نشان تھا"۔

"دونوں کانوں میں "مندریں" پہن رکھی تھیں"۔ جنت خاتون نے زیر لب کہا۔ "بالکل ٹھیک، وہ رحے کا بڑا بھائی شرفو چھاٹ تھا۔ اس کا باپ سمگلر اور ماں "کوٹھے چی" تھی۔ چوری شوری تو یہ لوگ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کرتے ہیں۔ ان کا اصل دھندا، ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا اِدھر کرتا ہے۔ ان حرامیوں کا منہ تو بس قبر کی مٹی سے بھرے گا"۔ پھر اس نے اچانک ایک سوال داغا۔ "رحے چھاٹ نے تمہارے ساتھ کیا زیادتی کی ہے جو تم اس کا خون پینا چاہتے ہو؟" جنت کا انداز گفتگو تفتیشی نہیں تھا بلکہ وہ صرف حقیقت حال سے آگاہی چاہتی تھی۔

"ماسی انہوں نے ہمیں تو کچھ نہیں کہا، پاکستان کی جڑ پر حملہ کیا ہے"۔ پھر رضوان نے مناسب الفاظ میں واردات کی تفصیل بیان کی۔ ماسی جنت گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

"جب بندے کی آنکھوں پر چربی چڑھ جائے تو وہ اس شاخ کو ضرور کاٹنے کی کوشش کرتا ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا ہو۔ پھر سر کے بل جب گرتا ہے تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ پچھتاوے کی گھڑی بھی گزر چکی ہوتی ہے"۔ ماسی جنت اپنے تجربات کی روشنی میں اظہار حقیقت کر رہی تھی۔ مشاہدہ بھی تجربے کا معتبر وسیلہ ہوتا ہے۔ "تم لوگ تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو، میں "سوہ" لگا کر ابھی آتی ہوں"۔ اس نے چادر کی "بُکل" ماری اور پستول سے مسلح دروازے کی طرف چل دی۔ "کڑیے! باورچی خانے میں ہر شے موجود ہے، منڈے کے کھانے پینے کا انتظام کرلینا۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی"۔

"ماسی جنت کے متعلق کیا خیال ہے جی؟" تابو نے استفسار کیا۔

"ان کے چہرے پر سچائی کا نور ہے لیکن ہم ہر صورتِ حال سے نمٹنے کو تیار ہیں۔ فکر کی ضرورت نہیں"۔

کوئی پون گھنٹے بعد ماسی جنت کی واپسی ہوئی۔

"وہاں تو رت جگا ہو رہا ہے۔ خیر سے بدیسی مہمان بھی آئے بیٹھے ہیں"۔ جنت نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا، شاید ہماری قسمت جاگ ہی جائے اور گم شدہ خزانہ ہمارے ہاتھ آ جائے"۔ رضوان نے جھوٹی امید کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"منڈیا! اگر وہ شے اتنی اہم ہے تو اب تک دلی بھی پہنچ چکی ہو گی۔ تم ہو کس خیال میں، یہ لوگ تو سالم بندے غائب کر دیتے ہیں۔ ہلکی پھلکی شے کی اوقات ہی کیا ہے"۔

***

جنت خاتون ان کے لئے رب کریم کی عطا ثابت ہوئی۔ وہ رحے چھاٹ کی رگ رگ سے واقف تھی۔ کیل کانٹے سے لیس یہ لوگ حریف کے ڈیرے پر پہنچے۔ وہاں مال حرام بود بجائے حرام رفت کے مصداق محفل رقص و سرود جمی تھی۔ بدیسی مہمانوں کی ضیافت طبع کا سارا انتظام موجود تھا۔ باقاعدہ جنریٹر چلا کر برقی روشنی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مہمانان گرامی بیش قیمت صوفوں پہ بیٹھے رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ماسی کون کہتا ہے کہ ہمارا ملک مفلسی کا شکار ہے"۔ راجو نے مناسب اوٹ میں کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"پتر! اسی گاؤں میں ایسے گھرانے بھی آباد ہیں جن کے پاس ہل جوتنے کے لئے بیل تک نہیں۔ وہ لوگ اپنی خواتین کے ہمراہ "کدالوں" سے زمین کا سینہ چیر کر خوراک حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کے ایک موچی خاندان میں پوتا، باپ اور دادا، تین پشت بیک وقت معروفِ کار ہوتی ہیں پھر بھی ان کا چولہا ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ ایسے افراد کی برکت سے ہم پر آسانی بلا نہیں نازل

نہیں ہوتیں''۔ جنت خاتون نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا۔

''بلاواں نازل نہ ہون دی وجہ یہ ہے کہ بندے آپ بلاواں بن گئے ہیں''۔ تابو نے حقیقتِ حال کا اظہار کیا۔

''ہم نے ملک صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ رحے کو زندہ گرفتار کر کے ان کے قدموں میں ڈال دیں گے''۔ راجو نے کہا۔'' اس لئے ذرا دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا''۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے''۔ جنت خاتون نے اس مشکل کو آسان کرتے ہوئے کہا۔'' میں اشارہ کروں گی تو وہ کتے کی طرح دُم ہلاتا ہوا میرے پیچھے چلا آ جائے گا۔ میں اسے منظر سے ہٹا دیتی ہوں تم لوگ ان حضرات سے جو سلوک چاہے کرتے رہنا پھر رحے سے نمٹ لینا''۔

رضوان نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر اس تجویز کو پسند کیا لیکن تابو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ رحا، جنت کی بات کیوں مانے گا۔ حرفِ مدعا اس کی زبان پر آ ہی گیا۔

''ماسی! رحے سے تیرا کیا تعلق ہے؟ اور وہ میرا مطلب ہے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لڑکی! دنیا میں اک تُو ہی تو حسین نہیں''۔ جنت خاتون نے لگی لپٹی رکھے بغیر جواب دیا۔'' رحا مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے لیکن ایک دور تھا کہ یہ مجھے حاصل کرنے کی خاطر خودکشی کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں یہ واقعی بندے دا پتر تھا پھر رفتہ رفتہ پٹڑی سے اتر گیا اور میرے دل سے بھی...... خیر، چھوڑو ان باتوں کو، اپنے کام سے کام رکھو۔ یہ وقت عشق و عاشقی کی باتیں کرنے کا نہیں، مرنے مارنے کا ہے...... منڈیا! اپنی رانی کا خیال رکھنا۔ میں'' اسے'' اپنے گھر لے جا رہی ہوں......''

جنت نے رحے کو آواز دی تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا...... عقل مند سے عقل مند اور شہ زور سے شہ زور انسان، صنفِ نازک کے حضور ناتواں گدھے کے روپ میں آ جاتا ہے۔ اس میں قدرت کی وہ حکمت کارفرما ہوتی ہے جس سے اس داستان کا کوئی تعلق نہیں۔

''جنت خاتون...... یہ آدھی رات گئے سورج کدھر سے طلوع ہو گیا؟'' رحے نے جنت کو دیکھا تو لپک کر آیا۔ اس نے مہمانوں سے معذرت طلب کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

''بڑا بے مروت ہے تُو! اپنی جورو کے یاروں سے اجازت تو لے آتا''۔ جنت نے مسکرا کر کہا۔

''میری جورو بے چاری تو منوں مٹی تلے آرام کر رہی ہے۔ کیوں اسے بے آرام کرتی ہو''۔ رحے نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔'' یہ بتاؤ اس وقت اس ناچیز کی یاد کیسے آ گئی؟''

''وے بے شرما! یہ آدھی آدھی رات تک دھما چوکڑی مچا مچا کر سارے پنڈ کی نیندیں حرام کر رہا ہے اور مجھ سے کہتا ہے بے وقت یاد کیسے آ گئی۔ چل میرے ساتھ تجھ سے کچھ کام ہے''۔

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ تُو یعنی جنت مجھے اپنے ساتھ لے جانے آئی ہے اور وہ بھی اس وقت''۔ رحے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔'' چلنا کہاں ہے، یہ تو بتا دے؟''

''میں آج تجھے قتل کرنے آئی ہوں۔ میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟'' جنت نے مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس؟ اتنی سی بات کے لئے اتنی دور پیدل چل کر آئی ہو۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہوتا میں خود مقتل میں پہنچ جاتا۔ رب کی قسم آج تو واقعی تمہارے ہاتھوں قتل ہو جانے کو جی چاہتا ہے''۔

جنت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو رحما سرور کی لہروں پر ڈولنے لگا۔ جنت کے مکان میں داخل ہونے سے پیشتر اگر اسے گرد و پیش کا ذرا بھی ہوش ہوتا تو گلی کے نکڑ پر کھڑی جیپ کا ہیولا سا اسے ضرور دکھائی دے جاتا۔

***

تابو اور راجو نے بیس پچیس منٹ تک انتظار کیا اور پھر محفل رقص و سرود پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے تو پنڈال میں یکلخت اندھیرا چھا گیا پھر کلاشنکوف سے مسلسل فائرنگ نے انسانی زندگیوں پر خطِ تنسیخ کھینچنا شروع کیا..... گندم کے ساتھ گھن بھی پسنے لگا۔ اس معاملے میں راجو کا ایک اپنا فلسفہ تھا۔ اسی فلسفے پر تاراج خاتون بھی ایمان لا چکی تھی "وطن دشمن عناصر کے دوست بھی ہمارے دشمن ہیں" اس فلسفے پر دونوں عمل پیرا تھے۔

سرحدی گاؤں کے وسنیک گولے بندوق کی آوازوں کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتے۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" کے مصداق بعض اوقات تو وہ اس پر تبصرہ کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اس فائرنگ نے پل بھر کے لئے سکوتِ شب کو مجروح کیا پھر کاروبارِ حیات حسب معمول رواں دواں ہو گیا لیکن زخمیوں کی چیخ پکار سے لوگ رفتہ رفتہ اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ جائے فساد کی نشاندہی ہوئی تو اکثر اپنے اپنے گھروں میں جا دبکے..... "رحما چھاٹ کے معاملات میں کون دخل دے"۔ ہر شخص زیر لب یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔

راجو اور تابو بھاگم بھاگ جنت کے گھر پہنچے جہاں ایک خوشگوار حیرت ان کا انتظار فرما رہی تھی۔ رحما بے سدھ چارپائی پر لیٹا تھا اور ماسی جنت بڑے اطمینان سے چائے نوش فرما رہی تھی۔

"ماسی جی!" تابو نے دونوں الفاظ کھینچ کر ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیسا چمتکار دکھایا ہے آپ نے؟"

"بس! حرامی نے ایک پیالی "چائے" کی پی تھی پھر اسے نیند آ گئی۔ میں کسی کو نیند میں بیزار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اب یہ صبح کی خبر لائے گا"۔ جنت نے مسکرا کر وضاحت پیش کی۔

"شہزادے جی! یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اب اس مونجی (چاول) کی بھری ہوئی بوری کو اٹھانا پڑے گا"۔ تابو نے مصنوعی تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"راننو! کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ توپ کی تیاری کرو تو کام غلیل سے نکل آتا ہے"۔ راجو نے اسے تسلی دی۔ "آگے بڑھ کر ماسی کے ہاتھ چوم لو وطن عزیز کا وجود ایسی ہی ہستیوں کے دم قدم سے قائم ہے"۔

"مجھے چوما چاٹی پسند تو نہیں مگر آج میں خود تمہاری پیشانی چومنا چاہتی ہوں"۔ جنت نے لپک کر راجو کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔ "اب تم لوگ یہاں سے نکلنے والی بات کرو۔ دشمن کے بادے چاچے بھی آ سکتے ہیں....."

"مگر ماسی جنت! آپ کو کوئی دکھ تو نہیں دے گا؟" تابو نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

"کرنیے! تم لوگ اپنی فکر کرو، میں ان چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں"۔

دوسرے روز غروب آفتاب سے پہلے راجو اور تابو رحمے کو لے کر حاکم پور پہنچے اور رسن بستہ قیدی کو انہوں نے حسب وعدہ ملک حاکم کے قدموں میں جا ڈالا۔ ملک صاحب تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ اپنے زخموں کو یکسر بھلا کر نوجوانوں کی طرح پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"رحمیا! تو تو اپنے باپ سے بھی دو قدم آگے کی چیز نکلا"۔ ملک صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ "وقت برباد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اسے تہہ خانے میں لے

چلو"۔

سب لوگ ان کی راہنمائی میں خفیہ تہہ خانے میں پہنچے تو سزا کے آلات دیکھ کر خود راجو حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ اپنی حیرت پر قابو پاتا ہوا ایک چھوٹے سے پنجرے کے قریب جا کر ٹھہر گیا اور اس کے اندر گوشت خور بجو کو بے قراری سے پھدکتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بجو اپنی چھوٹی چھوٹی خونخوار آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ قبرستان میں مردوں کے بخیے ادھیڑ دینے والا خونخوار جانور زندہ انسانوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ملک صاحب! یہ تو بڑی نایاب چیز ہے"۔ رضوان نے مسکرا کر کہا۔

"پھر کام کی شے کہو"۔ ملک صاحب نے تصحیح کی۔

"لوگ کہتے ہیں سانپ اور بجو سدھائے نہیں جا سکتے لیکن کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ گوشت خور میرے اشاروں پر ناچتا ہے"۔

رجے کا اس تہہ خانے میں داخل ہوتے ہی رنگ فق ہو گیا۔ "ملک صاحب! رب رسولؐ دے واسطے صرف ایک موقع دیں مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا"۔

"شاوا بھئی شاوا"۔ ملک صاحب نے بدستور اپنا سرد لہجہ بحال رکھا مگر تا ہوئے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ کپتان کا بہروپ بھرنے والے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن پر ہتھوڑا آ لگا ہو۔

"تمہارے دوزخی باپ نے تمہیں اس کمرے کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا؟" ملک صاحب نے کہا۔ "اگر بتایا تھا تو تم کس برتے پر چڑھ دوڑے اس حویلی پر۔ بچو! تم مجھے نہیں اس بھوکے گوشت خور کو ساری داستان سناؤ گے..... وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تمہیں اس کام پر لگایا۔ باقی باتیں میرا پتر راجو تم سے پوچھے گا..... یاد رکھو، یہ بجو میری سیٹی کا احترام کرتا ہے اور اسے پیٹ کا گوشت پسند ہے۔ البتہ میرے حکم پر یہ منہ میں آیا ہوا نوالہ بھی چھوڑ دیتا ہے اور ہڈیوں تک کو بھی نہیں چھوڑتا۔ بس یہی مختصر سی داستان ہے"۔ پھر ملک صاحب نے قیدی کو ایک تختے پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ حکم عدولی فضول تھی۔ لہٰذا وہ خود ہی چوبی تختے پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چمڑے کی پٹیوں سے جکڑا ہوا، بے حس و حرکت رہنے پر مجبور تھا۔ ملک صاحب نے بجو کو پنجرے سے آزاد کر دیا۔ وہ واقعی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ملک صاحب کو گھورنے لگا پھر اس کے گلے سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"اچھا اچھا، مجھے نخرے پسند ہیں نہ شکریے وغیرہ کی ضرورت ہے، چلو شروع ہو جاؤ"۔ ملک صاحب نے قیدی کی پنڈلیوں کی جانب اشارہ کیا۔ بجو اچھل کر رجے کی دائیں پنڈلی پر حملہ آور ہوا۔ سب لوگ اس کی فرمانبرداری پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ قیدی کے حلق سے دلدوز چیخ بلند ہوئی۔

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں ہر چیز بتانے کو تیار ہوں تم..... تم کوئی سوال تو کرو"۔ قیدی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"تو کیا میں اس بے زبان جانور کو بھوکا مرنے دوں؟" ملک نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ان کا چہرہ شدت غیظ و غضب سے سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ "اپنے آپ کو رحم کا مستحق ثابت کرو"۔ ملک صاحب نے گرج کر کہا اور ساتھ ہی ان کے ہونٹوں سے ہلکی سی سیٹی خارج ہوئی۔ بجو اپنا کام چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اپنے مالک کو دیکھنے لگا۔ سیٹی کی دھن بدلی تو وہ ننھا خونخوار رجے کے پیٹ پر پھدک کر جا بیٹھا اور اپنے استرے سے تیز پنجوں سے پیٹ کو یوں کھودنے لگا جیسے وہ تربت تازہ کو کھودنے کا عادی تھا۔ یقیناً اس گوشت خور کے ذہن میں انسانی سینے میں بند لذیذ دل اور کلیجا وغیرہ

ہوں گے۔

تہ خانہ قیدی کی چیخ پکار، آہ و فغاں سے گونجنے لگا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ اس کا ذہن ہاتھوں کو یقیناً احکام صادر کر رہا ہو گا کہ اس خونخوار جانور کو پیٹ نوچنے کھودنے سے منع کرے مگر اس کے ہاتھ مضبوط چمڑے کی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے، لہٰذا بے بس تھے۔ قیدی تھرتھرانے اور تڑپنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آگ لگا رہا تھا کہ نازک پیٹ کی کھال اُدھڑ جائے گی تو وہ بجو یقیناً اس کے پیٹ میں گھس جائے گا۔ رحمے نے صدقِ دل سے اس خدا کے حضور التجا کی جسے وہ قطعاً بھول چکا تھا۔ اسی خدا کے نیک بندوں کا فرمان تھا۔ ”حب الوطن من الایمان“ وطن کی محبت جزو ایمان ہوتی ہے مگر وہ تو ان چیزوں کو عرصہ ہوا بھول بھال چکا تھا۔

”اے میرے خدا! میں تجھے بھول چکا تھا لیکن تُو...... تُو نے مجھے کیسے بھلا دیا۔ میری مدد فرما اور مجھے اس مردار خور سے نجات دلا دے۔ میں...... میں تو ابھی زندہ سلامت ہوں“۔

یہ التجا وہ بہ آواز بلند کیے جا رہا تھا۔ ملک صاحب بڑی گہری نظروں سے اپنے پالتو جانور کی کارکردگی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ پیٹ پھٹنے میں وقت ہی کتنا درکار تھا لیکن مالک نے خونخوار کو یک دم رُک جانے کا حکم صادر کیا...... دیکھنے والی آنکھوں نے یہ طرفہ تماشا ایک بار پھر دیکھا کہ وہ بجو فوراً رک گیا اور اپنے دونوں اگلے پنجے چھوٹے سے سینے پر باندھ کر حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا۔

ملک صاحب نے اشارہ کیا تو وہ پھدک کر زندہ لاش سے نیچے اتر آیا۔ رضوان کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ سب کچھ اس کی چشم تماشا کے عین سامنے ہو رہا تھا۔ موت کا کھیل ملتوی ہوا تو ملک صاحب نے راجو کو اشارہ کیا۔ ”اب تم جو کچھ پوچھنا چاہو اس سے پوچھ سکتے ہو، یہ جھوٹ بولنے سے گریز کرے گا۔ ویسے میں جھوٹ سچ میں تمیز کرنا جانتا ہوں“۔

رحمے کی پنڈلیوں اور پیٹ میں آتشِ دوزخ بھڑک رہی تھی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”اس عذاب کی ضرورت نہ تھی۔ ملک صاحب، جو اپنا ضمیر بیچ سکتا ہے وہ عیش و آرام کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لیں میں نے اپنوں کو فروخت کر دیا تو بے گانوں کو کیوں بخشوں گا۔ خدا کے لئے میرے زخموں پر مرہم رکھئے، میں دشمنوں کی ساری کارروائی آپ حضرات کے گوش گزار کرنے کو تیار ہوں۔ وہ بات میں بھی بتاؤں گا جن پر ابھی عمل درآمد ہونا ہے“۔

”یہ اس کے دل کی صدا ہے“۔ ملک صاحب نے زہر آلود مسکراہٹ سے کہا۔ ”اس نے ابھی ابھی وطن فروشوں کی نفسیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ان کو اپنی جان سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور جب جان پر بن جائے تو یہ سارے رشتے توڑ دیتے ہیں“۔

”وہ فائل کہاں ہے اور اس علاقے میں سرگرم تمام افراد کی نشاندہی کرو“۔ ابتدا اس چھوٹے سے سوال سے ہوئی اور انتہا......؟ انتہا کی کوئی حد نہ تھی۔

راجو نے تین بار اپنے سوالات دہرائے۔ قیدی کے بیان میں سرِمو فرق نہیں تھا۔ سب لوگ مطمئن ہو گئے۔

”راج چترا! یہ میری قید میں رہے گا“۔ ملک صاحب نے کہا۔ ”میں خود موت کے منہ سے بچ کر آیا ہوں اور اب ایک دو اچھے کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اس فائل کو برآمد کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر ان حرامیوں کو نیست و نابود کرتا ہوں جو اس علاقے میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ فکر نہ کرو میں اوپر نیچے والوں کو دیکھ لوں گا۔ ویسے تم بھی

اپنے حساس ادارے کو متنبہ کردو۔ میں بندوق کے دونوں "پیرلوں" سے فائر کرنے کا عادی ہوں"۔

"ایک آخری سوال کا جواب دو"۔ تابو نے حرف آخر کے طور پر پوچھا۔ "کیا وہ فائل تم نے پاکستان میں ان کو دی تھی یا خود اسے ساتھ لے کر اپنے مالکوں کے پاس تشریف لے گئے تھے"۔

"میں خود وہاں گیا تھا...... میں اکثر براستہ جموں ہندوستان جاتا رہتا ہوں۔ میں اس عمارت کا نقشہ بھی آپ لوگوں کو بنا کر دے سکتا ہوں جہاں وہ فائل رکھی گئی ہے...... وہ شیوسینا کی ایک ذیلی شاخ کا ہیڈ کوارٹر ہے"۔ رحما تو بس ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ "لیکن وہ نقشہ بنانے کے لئے میرے ہاتھ آزاد ہونے چاہئیں"۔

"برخوردار! یہ تصویر بنوانے کے لئے تو میں تمہیں آلوؤں والے پراٹھے بھی کھلا سکتا ہوں"۔ ملک صاحب نے بطرز تفنن کہا۔ "بلکہ تمہارے زخموں کا علاج بھی ہو جائے گا لیکن رہو گے تم میری قید میں۔ اگر ایک لفظ بھی غلط ہوا تو میرا ببر انسانی گوشت کو پسند کرتا ہے اور انسانی دل اس کی مرغوب ترین غذا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟؟"

"ملک صاحب! میں اس سے بھی زیادہ کرنے کو تیار ہوں"۔ رحمے نے پیشکش کی۔ "آپ میرے ساتھیوں کو فی الحال بالکل نہ چھیڑیں...... میں آپ کے آدمیوں کو اس بلڈنگ تک بحفاظت پہنچا سکتا ہوں جہاں وہ منصوبے والی فائل رکھی ہوئی ہے۔ آپ...... آپ میری باتوں کا یقین کریں۔ بس مجھے اس عذاب سے نجات دلا دیں"۔

"دور فٹے منہ تیرا حرامی!"۔ تابو کو اچانک غصہ آ گیا۔ "چند زخموں کو بھی برداشت نہیں کر سکا، کس برتے پر چلا تھا باپ دادے کی قبروں کا سودا کرنے"۔

ملک صاحب نے اسی تہہ خانے میں ایک الماری کا پٹ کھولا اور سفید رنگ کا سفوف رحمے کے زخموں پر چھڑک دیا۔ حیرت انگیز طور پر رحمے کو فوراً قرار آ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھولے گئے تو وہ ان کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ چند سانس، چند گھڑیاں قرار کی نصیب ہوئیں تو اسے ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوا۔ "ملک صاحب! میں عمر بھر آپ کا غلام رہوں گا"۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"لو اس عمارت کی مکمل تصویر بناؤ اور اس کی ساری تفصیل بھی بیان کرو"۔ ملک صاحب نے حکم دیا۔ "اس کے حفاظتی انتظامات کی تشریح بے حد ضروری ہے"۔

"اگر آپ لوگ مجھے آزاد کر دیں گے تو میں خود آپ لوگوں کو اس جگہ لے جاؤں گا اور آپ کا وفادار......"

"مشکوک والدین کی اولاد! تو ہمیں کیا سمجھتا ہے؟" رضوان نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے مالکوں سے رابطہ کر کے ان کو "سب ٹھیک ہے" کہہ کر تسلی دے گا۔ اگر ہوشیار بننے کی کوشش کی تو تیرے سینے میں دھڑکنے والا دل ببر کی خوراک بن جائے گا۔ تو وہ راستہ ہے جس کو روند کر ہم نے منزل تک پہنچنا ہے۔ اب شروع ہو جا اور تصویر بنا"۔

رحمت خان کو مطلوبہ اشیاء مہیا کر دی گئیں اور وہ ماہرانہ انداز میں اس عمارت کی تصویر بنانے لگا۔

جنت خاتون نے سچ ہی کہا تھا۔ رحمت جب پٹڑی سے نہیں اترا تھا تو وہ ضرور شاعرانہ مزاج کا حامل ایک بلند پایہ مصور رہا ہوگا۔ دیکھنے میں وہ ایک عام سی عمارت تھی۔ فرنگی دور میں ایسی عمارتوں کا عام رواج تھا۔ یک منزلہ عمارت کے تین حصے نمایاں تھے۔ مغربی دیوار کو واضح دکھایا گیا۔ رحمت نے ماہرانہ انداز میں انتہائی مغربی اور نسبتاً چھوٹے حصے کی چھت پر تین فٹ بلند پردہ "وال" دکھائی جو ہوادار جھرلوں سے مزین تھی۔ دوسرے اور

تیسرے حصے میں یہ پردہ وال مفقود تھی۔ پہلے حصے کی ایک دیوار میں شیشے والی عام سی کھڑکی تھی۔ دوسرے حصے میں تین مستطیل لمبی لمبی کھڑکیاں تھیں۔ آخری اور تیسرے حصے میں محراب دار دروازہ تھا۔ عمارت کی چھت پر دو ڈھائی فٹ کا مضبوط چھجا نظر آ رہا تھا۔ چھت کے رقبے میں اضافے کے لیے یہ چھجا سیمنٹ سریے کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ اس چھجے تلے سیمنٹ کے مستطیل ''پردولے'' تھے جنہوں نے اس اضافی حصے کو مضبوط سہارا دے رکھا تھا۔

اس یک منزلہ عمارت کے بائیں جانب ایک پُراسرار قسم کی گنبدوں والی عمارت تھی جو پہلی نظر میں عہد فرنگی کا جنرل پوسٹ آفس دکھائی دیتی تھی۔ اس پُراسرار عمارت کا مجموعی تاثر کسی گوردوارے کا سا تھا۔ مرکزی اور بڑا گنبد مزاروں، مساجد پر تعمیر کیے جانے والے گنبدوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس عمارت سے کافی دور دھندلی سی ایک ایسی ہی گنبدوں والی بلڈنگ نظر آ رہی تھی۔

تصویر مکمل کرنے کے بعد رحمت نے ایک ''آرٹسٹک ٹچ'' دیا۔ پُراسرار عمارت کا نچلا حصہ دھوئیں میں لپٹا ہوا دکھایا۔ یہ دھواں پہلی عمارت کے دو حصوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''وے! اے دھواں تیرا ماما کدھر سے آ گیا۔ تیری بے بے چتا میں جل رہی ہے''۔ تابو نے اپنے مخصوص لہجے میں سوال کیا۔

''یہ دونوں عمارتیں، بادی النظر میں عام سی دکھائی دیتی ہیں''۔ رحمت نے وضاحت پیش کی۔ ''لیکن میں ان کو خونی اور خطرناک ترین کہتا ہوں۔ اس بلڈنگ کے کسی حصے میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ پُراسرار دکھائی دینے والی عمارت کا راستہ اسی معمولی دکھائی دینے والی عمارت کے اندر ہے اور وہ راستہ انتہائی خفیہ ہے۔ کوئی ناپسندیدہ اجنبی شخص اگر اس خونی عمارت کے قریب آنے کی کوشش کرے گا تو فوراً مارا جائے گا''۔

''کیوں مارا جائے گا وے مداری دیا پترا!'' تابو نے پھر اعتراض کیا۔ ''تیرے پیو نیں توپاں گڈیاں ہویاں نے''۔

ملک صاحب تابو کے اس انداز گفتگو سے محظوظ ہونے لگے۔ رحمت نے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''میری بہن! توپوں سے کہیں زیادہ خطرناک انتظام کر رکھا ہے شیوسینا کے افراد نے۔ عمارت کے گرد فرش تلے ایسے آلات نصب ہیں کہ ایک اجنبی کسی خاص پتھر پر پاؤں رکھتے ہی جلائے عذاب ہو جائے گا۔ پہلے تو زہریلا دھواں ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور دوسرے خطرے کے الارم بجنے شروع ہو جائیں گے۔ عمارت کے اندر وافر مقدار میں گیس ماسک موجود ہیں جو اس دھوئیں سے بچاؤ کا تیر بہدف علاج ہیں..... لیکن مداخلت کرنے والا لاعلمی کی بنا پر مارا جائے گا۔ میری اچھی بہن، یہ دھواں میں نے عمداً دکھایا ہے''۔

''یہ پکی اینٹوں کی دیوار کیسی ہے؟'' یہ سوال ملک صاحب نے کیا۔ ''یہ دیوار تصویر سے لگا نہیں کھا رہی''۔

''اسے دھوکا فریب کا شہکار کہا جا سکتا ہے''۔ رحمت نے ملک صاحب کی تیز نگاہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے وضاحت کی۔ ''واقعی یہ تصویر کے مطابق نہیں۔ یہ عمارت کے گرد چار دیواری ہے جس کا صرف ایک حصہ میں نے دکھایا ہے۔ اس دیوار میں صرف ایک دروازہ ہے اور وہ بھی بم پروف۔ یہ خاص نوعیت کی اینٹیں ہیں جن میں ننگی تاروں کا جال بچھا ہے۔ کوئی سی دو تاریں آپس میں شارٹ ہو جائیں تو خودکار حفاظتی نظام اپنا کام شروع کر دے گا''۔

''لیکن اینٹیں تو خود موصل (کنڈکٹر) ہوتی ہیں۔ ننگی تاریں آپس میں شارٹ کیوں نہیں ہو

جاتیں؟" رضوان نے ٹھکتے کی بات کی۔

"میں نے عرض کیا تھا کہ یہ اینٹیں فریب کا شہکار ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ان میں ننگی تاروں کا جال بچھا ہوگا لیکن تاریں ان میں موجود ہیں اور اینٹیں انسولیٹر (Insulator) ہیں۔ برقی رو ان میں سے نہیں گزر سکتی"۔

"خیر! یہ کوئی تشویش کی بات نہیں"۔ راجو نے سرسری انداز میں کہا۔ "میں اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا"۔

رحمت دہشت گرد اور وطن فروش خاموش تھا۔ وہ بڑے غور سے اپنی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا جیسے کچھ یاد کررہا ہو یا کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔

"اس سارے ماحول میں جو میں نے اس تصویر میں دکھایا ہے ایک شے کی کمی مجھے بری طرح محسوس ہو رہی ہے"۔ رحمے نے اعتراف کیا۔

"کس شے کی کمی رہ گئی ہے؟" ملک صاحب نے سوال کیا۔

"ایک ایسی مکار اور خونخوار عورت جو شیو سینا کی اس ذیلی شاخ میں بڑی فعال ہے"۔ رحمت نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "اس عورت سے میری ملاقات اسی عمارت میں ہوئی تھی۔ ایک کمرے میں اس کی عجیب و غریب تصویر دیوار پر بنی تھی.... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کو یہاں کیسے فٹ کروں"۔ پھر خود ہی اس کے چہرے پر آگہی کی روشنی سی آگئی اور وہ اپنے کام میں ازسرنو مصروف ہوگیا۔ تصویر مکمل کرکے وہ ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ "بالکل ٹھیک، یہ تصویر اس دوشیزہ کے باطن کی مکمل عکاس ہے"۔ رحمت نے زیرِ لب کہا۔

"کیا یہ خطرناک عورت ہے؟"

"جی یقین کریں۔ یہ بڑی خونخوار شے ہے اور جب مکاری سے ہنس نہ رہی ہو تو خوب صورت تھی ہے۔ اس کی مسکراہٹ کو میں نے کاغذ پر منتقل کر تو دیا ہے لیکن میں خود بھی نہیں جانتا کہ یہ اس انداز میں کیوں مسکرا رہی ہے؟ بہرحال اس کمرے میں ہوبہو یہی "پوز" میں نے دیکھا تھا"۔

"یہ کوئی "مونالیزا" کی مسکراہٹ نہیں کہ اسے تحقیق کا موضوع بنایا جائے، ادھر دکھاؤ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں"۔ راجو نے تصویر کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔

خصوصی اینٹوں والی دیوار کے پس منظر میں ایک مسکراتی ہوئی خاتون کی تصویر دونوں عمارتوں کی مناسبت سے بہت بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص کے اگلے حصے کے دو پلو تھے جن کو گانٹھ لگا کر ستر پوشی کی گئی تھی۔ کسی زمانے میں یہ انداز امریکی معاشرے کی لاابالی دوشیزاؤں کا ہوا کرتا تھا۔ نیلے رنگ کی اسکرٹ کا ایک حصہ نمایاں تھا۔ دائیں کلائی میں اس نے ایک سرخ کنگن پہن رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دیوار کے سہارے جھکی یا "پیڑھی" پر بیٹھی ہوئی ہو۔ باچھیں کھلی ہوئیں اور نیم وا آنکھیں دائیں طرف محو نظارہ تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر اس نے ٹھوڑی پر رکھا ہوا تھا۔

"یہ ہنسی واقعی معنی خیز ہے"۔ راجو نے تبصرہ کیا۔ "اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ اعلان کر رہی ہیں کہ جو کچھ میں جانتی ہوں وہ تم کبھی بھی نہیں جان سکو گے۔ فی الحال تو میں نہیں بتا سکتا کہ یہ عورت کیا چھپا رہی ہے لیکن عنقریب جان جاؤں گا"۔ پھر راجو کی نگاہ سرخ کنگن پر ٹک کر رہ گئی اور وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔

"کیا آپ نے اس کی مسکراہٹ کا مفہوم پا لیا ہے؟" رحمت نے استفسار کیا تو راجو نے اسے گھور کر دیکھا۔

"خدا کرے کہ میرا اندازہ غلط ہو"۔ اس نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔ "بہرحال اس دوشیزہ سے ملاقات بڑی دلچسپ رہے گی"۔

"اب یہ بتاؤ کہ یہ عمارت کہاں واقع ہے؟" ملک صاحب نے اہم ترین سوال کیا۔

"ہماچل پردیش میں، شملہ سے کوئی سو میل کے فاصلے پر رام پور کے نواح میں"۔ رحمت نے ایک ہی فقرے میں نشاندہی مکمل کر دی۔

"ملک صاحب! آپ کی اجازت سے میں اس خبیث کو اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ میں حریف کا خبث باطن اسی پر لوٹانا چاہتا ہوں"۔ رضوان نے ناپسندہ خواہش کا اظہار کیا۔

"مگر پتر یہ ضمیر فروش تو قابل گردن زدنی ہے موقع ملتے ہی فرار ہو جائے گا"۔

"نہیں ملک صاحب! میں اسے ایسی زنجیر میں جکڑوں گا کہ یہ فرار سے نفرت کرنے لگے گا شدید قسم کی نفرت"۔

تھوڑی دیر بعد راجو نے بریف کیس میں سے ایک ڈبیا نکالی۔ اس میں عجیب و غریب قسم کے کیپسول پڑے ہوئے تھے۔ ہر کیپسول میں سے بال جیسی باریک تاریں نکل رہی تھیں۔ رحمت کو تخت پر الٹا لٹا کر راجو نے اس کی کمر پر سن کر دینے والا محلول چھڑکا پھر روئی سے ملنے لگا۔ کمر کا بیشتر حصہ سن کر کے اس نے آپریشن کا آغاز کیا۔ کیپسول کو تاروں سمیت گوشت میں دبا کر ٹانکے لگائے اور لمبے چوڑے زخم پر زود اثر "سپرے" کر دیا۔

"وہ جی، دوا کے بغیر آپریشن ہوتا تو مزہ بھی آتا"۔ تابو نے کہا۔

"نہیں، تاراج! اسے یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ کیپسول کی شاخیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں"۔ راجو نے اپنی کارروائی کی تشریح کی۔ "اگر وہ خصوصی اینٹوں کی دیوار تعمیر کر سکتے ہیں تو ان تاروں کو ایکسرے سے معلوم کر کے دکھائیں"۔ پھر اس نے رحمے سے کہا۔

"اس کیپسول میں زود اثر پوٹاشیم سائنائڈ بھرا ہوا ہے اور یہ ہے اس کیپسول کو پھاڑنے والا ریموٹ کنٹرول جو ایسے دس کیپسولوں کو چشم زدن میں پھاڑ سکتا ہے۔ تمہارے کیپسول کا نمبر 5 ہے۔ اگر میں یہ پانچ نمبر والا بٹن دبا دوں تو تمہاری پشت پر ایک ہلکا سا دھماکا ہوگا اور کیپسول پھٹک سے پھٹ جائے گا۔ پھر دنیا کی کوئی طبی امداد تجھے موت کے منہ سے نہیں بچا سکے گی۔ میرے ریموٹ کنٹرول کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ کتنا وسیع، یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا اور آخری بات یہ کہ دنیا کا ماہر ترین سرجن بھی اس کیپسول کو آپریشن کے ذریعے تمہارے جسم سے الگ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک انتہائی حساس سرکٹ ہے۔ کوئی ایک تار بھی اس "کلوز سرکٹ" کی ٹوٹ گئی تو کیپسول پھٹ جائے گا۔ اسی قسم کا ایک ریموٹ کنٹرول ہمارے ادارے کے پاس محفوظ ہے۔ میں نے تمہارے کیپسول کا نمبر اپنے ہیڈ کوارٹر والوں کو بتا دیا ہے۔ ساری صورت حال کی وضاحت کر دی۔ اب گویا تمہاری موت اور زندگی کے درمیان میری انگشت شہادت کا اشارہ حائل ہے۔ تم نے میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی اٹھایا تو جہنم کے سفر پر روانہ ہو جاؤ گے"۔

ملک صاحب اس وضاحت کو سن کر حیران و ششدر ہونے کے علاوہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے شفقت پدری سے لرزتا ہاتھ رضوان کے کاندھے پر رکھ دیا۔ "پتر! تم نے مجھے پھر سے جوان کر دیا"۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے۔

"میں نے ایک انتظام اور بھی کر رکھا ہے"۔ راجو نے رحمے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بیٹے اور بیٹی کی بطور خاص نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے کوئی ایسی کارروائی کی یا اس میں حصہ لیا جس سے وطن

عزیز کو نقصان کا اندیشہ ہوا تو میرے آدمی چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تمہاری نسل کو اس عذاب گھر میں لے آئیں گے اور بجو کی دعوت کا اہتمام ہو جائے گا"۔

رحمے کا چہرہ دہشت سے زرد پڑ گیا۔ اس نے لکنت بھرے لہجے میں کہا۔"جناب ان کا کیا قصور؟"

"جڑ کے گناہ شاخوں کے عذاب کا سبب بنتے ہیں۔ تم نے کبھی غور نہیں کیا؟" ملک صاحب نے پتے کی بات کی۔

"دو روز بعد تم سفر کے قابل ہو جاؤ گے پھر ہم تمہارے ہماچل پردیش کی جانب روانہ ہو جائیں گے"۔

"جناب مجھے صرف ایک بات بتا دیں"۔ رحمت نے التجا کی۔"اس کیپسول کا جو آپ نے میرے گوشت میں دفن کیا ہے کوئی علاج بھی ہے یا میری موت کا آغاز ہو گیا ہے؟"

راجو نے تھوڑی دیر سوال پر غور کیا۔ سود و زیاں کو تولا اور سچی بات بتا دی۔"اس کا علاج صرف میرے پاس ہے کیوں کہ اس کا موجد بھی میں ہوں"۔

رحمت نے سکھ کا سانس لیا لیکن تابو اس سچ بیانی پر قدرے حیران ہوئی۔

"آپ نے اس کو سچی بات بتا دی یہ عقلمندی نہیں"۔ دونوں کو تنہائی میسر ہوئی تو تابو دل کی بات زبان پر لے آئی۔

"سچ بیانی سے کام لے کر میں نے اسے امید کا دامن مضبوطی سے تھام لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اب وہ ہماری زندگی کی دعائیں مانگتا رہے گا"۔ رضوان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

***

راجو، ڈینی اور تابو کیل کانٹے سے لیس رحمے کے ہمراہ بہ آسانی بارڈر کراس کر گئے۔ بین الاقوامی سرحد کو عبور کرنا انہیں یوں لگا جیسے راوی کا پل عبور کر لیا جائے۔

رحمے چھاٹ کی رسائی جانے کہاں تک تھی۔ وہ بس سرگوشی میں "جے کالی ماتا" کا کلمہ سر (کوڈ ورڈ) دہراتا اور ہر بند دروازہ خود بخود کھل جاتا۔ جموں تک کا خفیہ راستہ قدرے دشوار گزار تھا۔ امرتسر تک کا سفر انہوں نے بذریعہ ریل طے کیا۔ امرتسر ریلوے سٹیشن پر ان کا ٹکراؤ ملٹری پولیس سے ہو گیا۔ شہر کے مخدوش حالات کی بناء پر ہر شخص کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ ڈینی کا دل دھڑکنے لگا۔

"استاد! ہم نے اپنی لگام اس ضمیر فروش کے سپرد کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے"۔ ڈینی نے اظہار تشویش کیا۔

"مختصر راستہ اختیار کرنے کے لئے خطرات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔ راجو نے سرگوشی کی۔"اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم طویل مگر نسبتاً محفوظ راستہ اختیار کرتے"۔ رحما، فوجی کپتان سے مذاکرات کر رہا تھا۔ تابو نسوانی لباس میں تھی۔ رحمے نے سکھ کپتان کو کوئی ایسی شے دکھائی کہ وہ پل بھر میں ریشہ خطمی ہو گیا۔

"بادشاہو جی آیاں نوں صدقے آیاں نوں تسی تاں خاص بندے ہوئے"۔ اس کے بعد اس نے انہیں بصد احترام رخصت کیا۔

"صاحب جی! رحمے نے کی سنگھایا سی ایس اوت نوں"۔ تابو نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"شیوسینا کا شناختی کارڈ جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وطن عزیز میں اور جانے کتنے شیوسینا کے نوکر دندناتے پھر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآنی آیات کو سستے داموں فروخت کر دیا"۔ رضوان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"رب خیر کرے گا جی، دل چھوٹا نہ کرو"۔ تابو اپنے مخصوص انداز میں اسے تسلیاں دینے لگی۔

شملہ سے رام پور تک جانے والی پکی سڑک بڑی

ہموار تھی۔ انہوں نے بذریعہ بس سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو راجو نے بس سے اتر جانے کا اشارہ کیا۔

''میرے اس شہر میں بڑے تعلقات ہیں''۔ رحمے چھاٹ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہم نہایت مناسب جگہ قیام کریں گے''۔

''نہیں، ہم اسی جگہ اتریں گے''۔ راجو نے ایک مندر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

بس جگہ جگہ کھڑی ہو کر مسافروں کو ان کی پسندیدہ جگہوں پر اتار رہی تھی۔ ڈرائیور حضرات سوار ہونے والوں کا انتظار تو کر لیتے ہیں لیکن بس سے اترنے والوں سے جان چھڑانے کی بھی ان کو جلدی ہوتی ہے۔ یہی برصغیر کا مزاج ہے۔ یہ چوکڑی بس سے اتری تو راہنمائی کے فرائض رضوان سرانجام دینے لگا۔ مندر کے قریب بہت سی دکانیں تھیں۔

''اب میری بات غور سے سنو''۔ راجو رحمت سے مخاطب ہوا۔ ''ہم عارضی طور پر جدا ہو رہے ہیں۔ تم دو روز کے بعد ہر روز رات نو بجے اس مندر کی سیڑھیوں پر میرا انتظار کیا کرو گے اگر مسلسل تین روز ہماری ملاقات نہ ہو سکی تو تم فوراً واپس چلے جاؤ گے۔ ہماری ملاقات ملک صاحب کے گاؤں میں ہو گی۔ اب وہ شیو سینا والا خفیہ نشان میرے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں اس شہر میں تم اس کے بغیر بھی گزارا کر سکتے ہو۔ برے حالات سے نمٹنا تمہاری ذمے داری ہے اور آخری بات اپنی رہائش گاہ کا فون نمبر مجھے بتا دو''۔

کانسی کا بنا ہوا چھ کونے والا ''ڈیوڈ سٹار'' رحمے نے لرزتے ہاتھوں سے راجو کے حوالے کر دیا۔ اس ستارے کی ایک طرف کالی ماتا کی شبیہ تھی، دوسری طرف شیو دیوتا کی آنکھ نقش تھی۔ جسے نیم وا دکھایا گیا تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق تباہی کا دیوتا شیو اپنی تیسری آنکھ کھولے گا تو غیر ہندو افراد کا صفحۂ ہستی سے صفایا ہو جائے گا۔

''ایہہ گدڑ سنگی تے بڑے کم دی شے جے''۔ تابو نے دھیمے لہجے میں تبصرہ کیا۔

''تابو رانی! یہ شیو سینا کے خاص خاص آدمیوں کے پاس بے پناہ طاقت کا نشان ہے۔ یہ ستارے کے چھ کونے ہندوؤں اور یہودیوں کے گٹھ جوڑ کی علامت ہیں''۔

''ایہہ تے بڑی خطرے دی گل اے جی''۔

''سو تو ہے مگر اس کا کیا علاج کہ ہماری اپنی صفوں میں اکیلا نہیں۔ ساری ''تانی'' بگڑ چکی ہے''۔

راجو نے ایک ٹیکسی کو روک کر ایڈریس بتایا اور تینوں خاموشی سے منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ لب سڑک ایک درمیانے درجے کا ہوٹل دکھائی دیا تو ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی بے تکلفی سے چائے کی دعوت دی۔ ''مہاراج، اس ہوٹل کی چائے گرد و نواح میں مشہور ہے''۔ راجو نے گھڑی پر وقت دیکھا اور دعوت قبول کر لی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' ذکی نے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔

''اس وقت ہم کوہ شوالک کے دامن میں گوند ساگر کے جنوبی حصے میں موجود ہیں۔ دریائے ستلج یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ہماری منزل یہاں سے قریب ہی ہے''۔ وہ اگرچہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے لیکن یہ چلبلی پولیس تھی۔ قریبی میز پر بیٹھے ہوئے ایک ہوتی سے نوجوان نے انہیں غور سے دیکھا اور انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ انداز ایسا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے بور ہو کر باہر جا رہا ہے۔ چائے پینے کے بعد یہ لوگ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھے تو گاڑی کے انجن نے ٹس سے مس ہونے سے انکار کر دیا۔

''یہ تو بڑی خراب بات ہو گئی مہاراج! انجن میں گڑبڑ دکھائی دیتی ہے''۔ ڈرائیور نے متفکر لہجے میں کہا۔

"مگر آپ چنتا نہ کریں میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں"۔

اور واقعی معجزانہ طور پر ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ راجو اس حسن اتفاق پر زیرلب مسکرانے لگا۔

"مہاراج! آپ کا کام بن گیا۔ آپ دوسری گاڑی میں سوار ہو جائیے، کرائے کی فکر نہ کیجئے جو کچھ آپ عنایت فرمائیں گے وہ ہمیں قبول ہوگا"۔

"آپ بڑے دیالو ہیں مہاراج!" راجو نے ڈرائیور کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا گاڑی کا بڈ کھولیں۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں"۔

ڈرائیور کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس نے انجن کا بڈ کھولا۔ راجو نے پہلی نظر میں جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ "مہاراج! خرابی بھیتر میں دکھائی دیتی ہے، میں آپ کی کوئی سہایتا نہیں کر سکتا"۔

دوسری گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے راجو نے اپنے ساتھیوں کو شارے سے سمجھایا کہ کھیل کا آغاز ہو چکا ہے۔

دریائے ستلج کا پل ابھی نصف عبور کرنا باقی تھا کہ ایک گاڑی سامنے سے فراٹے بھرتی ہوئی آئی اور ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور اگر چاہتا تو کترا کر نکل سکتا تھا مگر اس نے تو گاڑی کھڑی کر کے دروازہ کھول اور مقام فساد سے بھاگنے والی بات کی۔ راجو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے ڈرائیور کی پشت پر پوری قوت سے ٹھوکر رسید کی۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح پل کی آہنی ریلنگ سے ٹکرایا اور اس رکاوٹ کو عبور کرتا ہوا دریائے ستلج کی شوریدہ سر لہروں کے سپرد ہو گیا۔ اس کارروائی کی ڈرائیور کو قطعاً توقع نہ تھی۔ پلک جھپکنے میں سب کچھ ہو گیا۔ راجو نے سٹیئرنگ سنبھالا اور دشمنوں کے گاڑی سے نکلتے نکلتے اپنی گاڑی پہلے گیئر میں دوڑا کر ان سے ٹکرا دی۔ یہ ایک شعوری حادثہ تھا۔ ڈپی اور تابو کو اس نے سنبھل کر بیٹھ جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ تصادم اتنا ہولناک تو نہیں تھا کہ گاڑیوں کے پرخچے اڑ جاتے کیونکہ پہلے گیئر میں رفتار کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اتنا ضرور ہوا کہ دروازے کھول کر باہر نکلنے والے حضرات دونوں گاڑیوں کے درمیان "سینڈوچ" بن کر رہ گئے۔ انسانی گوشت پوست نے متحرک گاڑی کا سارا بوجھ برداشت کیا جو ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ دو کا تو بس کچومر ہی نکل گیا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ساکن گاڑی کا رخ بھی بدل چکا تھا۔ وہ پل کے کنارے سے ٹکرائی مگر دریا برد ہونے سے بچ گئی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ گاڑی کے دو دروازے پل کی آہنی ریلنگ نے بند کر رکھے تھے اور دوسری جانب والے دو دروازے ٹکراؤ کے نتیجے میں پچک کر کھلنے سے انکار فرما رہے تھے اور تین حملہ آور پنجرے میں بند چوہوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ دراصل وہ حواس باختہ سے ہو رہے تھے۔ اپنی ہی سرزمین پر ان کو شاید مزاحمت کی توقع نہیں تھی اور غیر متوقع کارروائی توقع سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ راجو نے فوراً گاڑی روکی اور برق رفتاری سے باہر نکلا۔ تابو اور ڈپی اس سے پہلے ہی باہر نکل کر کارروائی کا آغاز کر چکے تھے جو مختصر ہی ثابت ہوئی۔ دونوں کے پاس موت کے خاموش ہرکارے تھے۔ ٹھک ٹھک کی سی آواز آئی اور گاڑی میں مقید "سیکھوں" کی پیشانیوں میں سوراخ ہو گئے۔ نہ خنجر پہ کوئی داغ چھکا، نہ آستیں خون آلود ہوئی۔

"چلو جی پینڈا مکوتا نہ کرو، کم ہو گیا اے تسیں تے اویں نسے وچ آ جاندے او"۔ تابو نے راجو کا انتظار بھی نہ کیا اور پھرتی سے "مسروقہ" گاڑی کی اگلی سیٹ پر جا

بیٹھی۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اس منزل کی طرف جا رہی تھی جس کے متعلق ڈیبی اور تابو نا آشنا تھے۔

***

"استاد! میرے خیال میں یہ رام پور نہیں کوئی اور شہر ہے"۔ ڈیبی نے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" راجو نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"رام پور تو اتر پردیش (یوپی) کے تقریباً مرکز میں واقع ہے"۔ ڈیبی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مرشد آباد کے بعد رام پور پھر بریلی آتا ہے اور وہ سارا علاقہ میدانی ہے یہاں تو اچھے خاصے پہاڑ ہیں"۔

"اوہ تیرا ستیاناس! مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہم غلط شہر میں آ گئے ہیں"۔ راجو نے فکر کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "چلو خیر، ہم اسی رام پور پر گزارا کیے لیتے ہیں۔ ارے فلوش بھارت اتنا بڑا ملک ہے کہ یہاں قدم قدم پر "رام پور" آباد ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہماچل پردیش صوبہ پنجاب کا حصہ ہے۔ دھوتی پرشادوں نے پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہریانہ، پنجاب اور ہماچل پردیش اور یہ رام پور، یوں سمجھو پنجاب کا کونا ہے۔ جس دریا کے پل پر تم لوگوں نے بڑی بے رحمی سے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے یہ پنجاب کا مشہور دریائے ستلج ہے اور اسی دریا پر ہشیار پور سے پہلے بھاکڑہ ڈیم بنا کر اہنسا کے پجاری ہمیں پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔ تمہارا "تاریک جغرافیہ" تاریخ جغرافیے سے ذرا مختلف ہے؟ یوں سمجھو یہ چھوٹا رام پور ہے اور وہ یوپی کے عین درمیان ریاست رام پور ہے یعنی بڑا رام پور"۔

دریائے ستلج پیچھے رہ گیا تھا۔ دائیں جانب سڑک سے ذرا ہٹ کر گاڑیوں کی ورکشاپ نما عمارت تھی۔ راجو نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ایک طرف کچھ عمر رسیدہ گاڑیوں کا میک اپ وغیرہ کر کے انہیں شباب عطا کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف گاڑیوں کے انجنوں میں نئی روح پھونکی جا رہی تھی۔

راجو نے گاڑی کھڑی کر کے ایک گریس اور سیاہی میں لتھڑے لڑکے کو متوجہ کیا۔ "چھوکرے! استاد کاموں سے بولو ابھکار آیا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد ایک دیوہیکل ادھیڑ عمر کا شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ان کی گاڑی کی طرف آیا اور راجو کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "اوئے راج کمار تو بندہ ہے کہ بھوت"۔ پہلے اس نے راجو کو گاڑی سے گھسیٹ کر باہر نکالا پھر پُرجوش انداز میں اس سے بغلگیر ہوا پھر اپنے ریچھ کے پنجے جیسے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کر جھٹکے دینے لگا۔ یہ گویا مصافحہ ہو رہا تھا۔

"استاد! میں نے اس ہاتھ سے ابھی بہت سے کام لینے ہیں"۔ راجو نے اس کے پہلو میں دوسرے ہاتھ سے گھونسا جڑتے ہوئے کہا۔ صرف ڈیبی جانتا تھا کہ کوئی عام انسان ہوتا تو یہ گھونسا اسے زمین بوس کر دیتا مگر شاید استاد کاموں کا جسم فولاد کا بنا ہوا تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر راجو کا ہاتھ شکنجے میں سے آزاد کر دیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

"شکرے کی دُم تو ذرا بھی نہیں بدلا"۔ یہ کہہ کر اس نے دوسرے مہمانوں کو سرسری نگاہ سے دیکھا پھر اس کی نگاہ تابو پر جم کر رہ گئی جو گاڑی سے باہر آ کر راجو کے قریب کھڑی ہو گئی تھی۔ اونچی لمبی سرخ و سپید رنگت والی مضبوط قد کاٹھ کی بانکی نار جو کچھ استاد کاموں کی آنکھوں نے دیکھا دل نے اسے پسند کیا۔ تابو کے سر پر اس نے دستِ شفقت رکھا اور ڈیبی سے ہلکے انداز میں مصافحہ کیا۔ ڈیبی کو محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ شکنجے وائس (Benchvice) کے جبڑوں میں آ گیا ہے"۔

''چھوکرو! کوئی ملنے ملانے والا آئے تو بولنا استاد شملے گیا ہے۔ پرسوں واپسی ہوگی۔ آنکھیں کھلی رکھنا''۔ کاموں نے شاگردان رشید کو ہدایت کی اور مہمانوں کو لے کر خاص کمرے میں چلا گیا۔ ''اب بتاؤ کیا افتاد آن پڑی۔ کل سے تین بار تمہاری خیریت دریافت ہوچکی ہے''۔ استاد کاموں بغیر تمہید کے حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ راجو نے مختصر مگر مناسب الفاظ میں داستان خیر وشر بیان کرنے کے بعد رحمے کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔ کاموں نے چونک کر تصویر کو دیکھا۔ اس کی جبیں پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ ''خونی بلڈنگ اور خونی دیوی'' اس نے زیر لب کہا۔ ''ادھر چند روز سے کچھ غیر معمولی سرگرمی دکھائی تو دی تھی مگر میں نے کوئی توجہ نہ دی''۔

''استاد! گاڑی کا حلیہ بدلوا دینا۔ وہ ذرا... ''

''سب ٹھیک ہے''۔ استاد کاموں نے بے پروائی سے کہا ''پندرہ منٹ بعد تمہاری گاڑی پندرہ حصوں میں تقسیم ہوچکی ہوگی اور ہر حصہ مناسب جگہ پر فٹ ہوچکا ہوگا''۔

''استاد! وقت بالکل نہیں ہے، راستے میں رکاوٹ پیش کی گئی تھی''۔ راجو نے بے چینی سے کہا۔

''چھیڑ چھاڑ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ تم لوگ ذرا آرام کرکے تازہ دم ہوجاؤ۔ خونی بلڈنگ اور تمہاری اس دیوی کو بھی دیکھ لیں گے''۔

''اس نے ماتھے پر بندیا کیوں نہیں لگا رکھی؟'' تابو نے بڑی گہری بات کی۔

''اس خاتون کی اصلیت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا تعلق کس مذہب سے ہے''۔ استاد کاموں نے بندیا کی عدم موجودگی کی تشریح کی۔ ''اور پھر ایسے معاملات میں مذہب وملت کا اظہار غیر ضروری ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کل پچھلے پہر کسی وقت ''زیارت'' کے لئے جائیں''۔

''آج رات میں کیا خرابی ہے؟'' ڈینی نے سوال کیا۔

''کچھ تیاری کرنی ہے اور رات کو حفاظتی انتظامات زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ فضول کی لٹھ بازی اچھی نہیں ہوتی''۔ استاد کاموں نے تسلی بخش جواب دیا۔

''اس جگہ کا سربراہ کون ہے؟'' راجو نے استفسار کیا۔

''جس کی تصویر تمہارے سامنے ہے''۔

''کیا؟ یہ... یہ...'' تابو نے اپنا فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''خونی دیوی بڑی قبول صورت خاتون ہے''۔ استاد کاموں نے عمداً خوب صورت کے بجائے قبول صورت کہا۔

''آپ کو قبول ہے تو افسوس کے لئے تیار رہیں''۔ تابو نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''اس نے ہمارے گھر ڈاکا ڈالا، ہمارے بندے مارے، ہم اس کے ہوتوں سوتوں کو ماریں گے۔ اسے میں اپنے ہاتھوں سے ذبح کروں گی''۔ پھر اچانک وہ خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگی اور راجو کی جانب معذرت خواہانہ نگاہوں سے دیکھ کر لب کشائی کی۔ ''وہ جی، غلطی ہوگئی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا جھٹکا کروں گی''۔ پھر وہ استاد کاموں سے مخاطب ہوئی۔ ''میرے صاحب جی کہتے ہیں حرام شے کو ذبح نہیں کیا جاتا اس کا ''جھٹکا'' کیا جاتا ہے''۔

استاد کاموں حیرت زدہ نگاہوں سے حسن معصوم کو دیکھنے لگا۔ تعلق کی یہ گہرائی یہ خود سپردگی تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔

***

سورج زوال پذیر ہوا تو چار سرفروشوں کا قافلہ خونی عمارت کی جانب روانہ ہوا۔ چاردیواری کو دیکھ کر راجو کو

رحمت کی ہر بات کا یقین آ گیا۔ تصویری کارین کا پی اس کے سامنے تھی۔ اب اسے تصور میں حسب منشا رنگ بھرنا تھا۔ وہ سب اس وقت چست سیاہ لباس میں ملبوس تھے۔ تابو نے سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس نے اس کے لمبے سیاہ بالوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ مکمل مردانہ لباس میں تھی۔ وہ سب چھوٹے سائز کی خطرناک گنوں سے مسلح تھے۔ چاروں کے پاس چھوٹی سی لیزر گنیں بھی موجود تھیں۔ استاد کاموں نے دیوار میں نقب لگانے کی تجویز پیش کی جسے رضوان نے سختی سے مسترد کر دیا۔

''نہیں استاد! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں مگر ہمارا دشمن لومڑی سے زیادہ مکار ہے۔ اس کے کھانے کے دانت اور، مگر کاٹ کھانے کے اور ہوتے ہیں''۔ یہ کہہ کر راجو نے ایک چھوٹا سا سرکٹ ڈیٹکٹر (Detector) نکالا اور اس کی مدد سے دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ ڈیٹکٹر کی آواز بدل گئی تو اس نے اس جگہ پر نشان لگا دیا۔ نشان زدہ جگہ کی دونوں جانب اس نے لیزر گن سے فائر کا آغاز کیا۔ بغیر کسی شور وغل کے دیوار صابن کی طرح کٹنے لگی۔ ایک نشان زمین سے پینتالیس درجے کا زاویہ بنا رہا تھا اور دوسرا کوئی اسی درجے کا۔ یہ بڑی نفیس نقب تھی۔ دیوار کے اندر والی تاریں آپس میں ''شارٹ سرکٹ'' ہوئے بغیر کٹ گئیں۔ حفاظتی نظام ناکارہ ہو گیا۔ خطرے کا الارم بھی خاموش رہا اور زہریلا دھواں بھی خارج نہ ہوا۔

''ایک ہی شگاف کافی تھا۔ دوسرے کی چنداں ضرورت نہ تھی''۔ استاد کاموں نے سرگوشی کی۔

''نہیں استاد! میں دونوں اطراف کے نظام کو ناکارہ بنانا چاہتا ہوں''۔ راجو نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

چاروں آدمی پہلی آزمائش بخیر و خوبی گزر گئے اور عمارت کی مغربی دیوار کا جائزہ لینے لگے۔

''کسی کھڑکی دروازے کو چھوئے بغیر ہمیں اندر داخل ہونا ہے''۔ راجو نے کہا۔ ''صدیوں پرانا طریقہ آزمایا جائے گا۔ میں کمند پھینکوں گا پھر ہم باری باری چھت پر چڑھ جائیں گے۔ میرے بعد استاد آپ آئیں گے پھر تاراج اور اس کے بعد ڈیبی۔۔۔''

راجو نے کمند پھینکی اور رسے کی مدد سے فوراً چھت پر چڑھ گیا۔ کاموں اور دوسرے اوٹ میں چھپے رہے پھر استاد کی باری تھی۔ وہ بھی بخیر و عافیت منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ جب تابو اوپر چڑھ رہی تھی اور ڈیبی فرش پر چلتا ہوا عمارت کی جانب آنے لگا تو اچانک سفید رنگ کا دھواں راجو کو زمین سے پھوٹتا ہوا دکھائی دیا لیکن حیرت انگیز طور پر خطرے کا الارم خاموش رہا۔

''اف گاڈ! استاد چوٹ ہو گئی۔ دھواں خارج کرنے کا ڈبے دار نظام دہرا تھا۔ ڈیبی نے ضرور کسی غلط پتھر پر پاؤں رکھ دیا ہوگا۔ اب خدا ہی اس کی مدد کرے''۔ پھر راجو نے چیخ کر کہا۔ ''تابو رانی جلدی کرو دھواں تمہارے تعاقب میں ہے''۔

تابو نے ایک پل اوپر دیکھا۔ پھر بڑی تیزی سے وہ کسی پھرتیلی چھپکلی کی طرح چھت پر پہنچ گئی۔ اوپر ان کو ایک ٹریپ ڈور نظر آیا۔ تینوں نے گیس ماسک پہنے اور خوابی بلڈنگ میں اتر گئے۔ یہ ساری کارروائی جس کی بنا پر دھواں خارج کرنے والا نظام حرکت میں آ گیا تھا ایک لحاظ سے ان کے حق میں تھی۔ عمارت کے اندر مصروف کار افراد خطرے کا الارم نہ بجنے کی بنا پر خاموشی سے اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہے اور موت ان کی طرف دبے پاؤں آتی چلی گئی۔ اگر ڈیبی میں ذرا بھی عقل ہوئی تو وہ اس جگہ سے فرار ہو جائے گا یا گیس ماسک پہن کر کسی اوٹ میں دبک کر بیٹھ جائے گا۔ راجو نے سوچا۔

عمارت کے اندر مصروف کار افراد کے لئے یہ ایک مکمل ''سرپرائز اٹیک'' تھا۔ خطرناک ترین جگہوں پر کام

کرنے والے لوگ باہر کے معاملات سے یکسر بے پروا ہو کر اور خارج کے خطرات کو دل سے نکال کر اپنے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ باہر کی حفاظت کرنے والے اور ہوتے ہیں اور اندر کام کرنے والے اور۔ یہی مروجہ دستور ہے۔ چھت پر سے ٹپکنے والی بلائیں جنگلی بلوں کی طرح کبوتروں کے ڈربے میں گھس گئیں۔ راجو اور تابو نے تو گنوں کا استعمال کیا لیکن استاد گاموں کے ہاتھ ہی آہنی ہتھوڑے کا کام کر رہے تھے۔ پل بھر میں پہلے حصے کا صفایا ہو گیا۔ باہر دھوئیں نے ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن عمارت کے اندر بڑی ہی بھینی بھینی خوشبودار اور فرحت بخش ہوا چلنے لگی۔

یہ دراصل اندر والے افراد کو دھوئیں کے زہریلے اثرات سے بچاؤ کی تدبیر تھی لیکن حفاظتی لاازم ایجاد کرنے والوں کو شاید یہ امید نہ تھی کہ وہ حملہ آوروں کی خاطر و مدارات کا اہتمام اپنے ہاتھوں سے فرما رہے ہیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی ان سے زیادہ چالاک ہوشیار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ خونی بلڈنگ جیسے کہ رحمت نے کہا تھا فریب دہی کا شاہکار تھی۔

عمارت کے اندر گنے چنے افراد تھے، شاید حملہ آور اوقات کار کے بعد آئے تھے۔ خونی دیوی کا دفتر بھی خالی تھا۔ راجو تابو کے ہمراہ عمارت کے دل میں داخل ہوا تو سامنے دیوار پر وہی تصویر آویزاں تھی جسے رحمت نے بعد میں بنایا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ تصویر کے پس منظر والی دیوار میں کوئی شگاف نہیں تھا۔ ایک بار پھر پل بھر کے لئے رضوان نے خاتون کی مسکراہٹ کو بغور دیکھا اور زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ ہنسنے مسکرانے یا غور و فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اسے مسروقہ فائل کو تلاش کرنا تھا۔

''اگر میں اس فائل کو چھپاتا تو کس جگہ؟'' راجو نے سوچنا شروع کیا اور فوراً ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر سے تصویر کھینچ لی۔ ''کوئی اپنے دفتر میں ایسی ہی تصویر آویزاں کرنے کی حماقت نہیں کرتا''۔ وہ تابو سے مخاطب ہوا۔ ''یہاں کسی مہاتما کی یا مہاپُرش کی تصویر ہونی چاہئے تھی۔ یہ عورت آخر ہمیں کیا سمجھانا چاہ رہی ہے''۔

تصویر اپنی جگہ سے سرکی تو اس دیوار میں شگاف ہو گیا۔

''پُراسرار بلڈنگ میں جانے کا خفیہ راستہ''۔ بے اختیار راجو کے منہ سے نکلا۔ وہ تینوں اس شگاف میں داخل ہوئے۔ یہ ایک درمیانے سائز کی سرنگ تھی۔ استاد کو جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اچانک ہی وہ سرنگ ایک کشادہ کمرے میں جا کر ختم ہو گئی۔ اس چوکور کمرے میں روشنی کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی گویا چوہے دان میں پھنس گئے۔ ان کے پیچھے آہنی دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا اور سپاٹ دیواریں ان کا منہ چڑانے لگیں۔

استاد گاموں اور راجو نے بغور ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''برخوردار آگ کے کھیل میں ہاتھ جلنا تو پہلی شرط ہے''۔ استاد گاموں نے مسکرا کر کہا۔

کمرا موسیقی کی مترنم لہروں سے گونجنے لگا۔ راجو بڑے غور سے موسیقی کو سن رہا تھا۔ ''یہ چوہے بلی کا کھیل کسی مقصد کے بغیر نہیں ہو سکتا''۔ اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

''خونی دیوی تمہیں دعوت وصل دے رہی ہے برخوردار!''۔ استاد نے زہرخنداں سے جواب دیا۔ ''یہ ماتمی موسیقی کی دھن ہے''۔

''میں اس بل بتوڑی کی ٹانگیں چیر دوں گی ذرا میرے سامنے تو آ جائے''۔ تابو نے آتش زیر پا ہوتے ہوئے کہا۔

''راج کمار! تم ابھی طفل مکتب ہو''۔ ماتمی دھن یکلخت بند ہو گئی اور کمرے میں ایک نسوانی آواز گونجنے لگی جس کے پس منظر میں سانپ کی پھنکار سے ملتی جلتی

سرسراہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ ''بہرحال تمہاری جرأت و ہمت کو خراج تحسین پیش نہ کرنا بخل سے کام لینا ہوگا۔ تم میرے حفاظتی نظام کو ناکارہ بنا کر اس کمرے تک آ پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ مجھے جرأت کے پیکر تم جیسے نوجوان پسند ہیں لیکن یہ تمہاری آخری حد ہے اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ''۔

''یہ ضرور بل بتوڑی بول رہی ہے شہزادے!'' تابو نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کس گستاخ کی آواز ہے، راج کمار تمہارے ساتھ یہ کون بدتمیز ہے؟''

موت کے منہ میں یہ گفتگو بڑی عجیب لگ رہی تھی مگر راجو کو امید کی کرن بھی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید یہ خونی دیوی مذاکرات پر اتر آئے لیکن وہ آواز اچانک ہی بلند ہوگئی تھی۔

''بولتی کیوں نہیں اب، چل میرا ایک ہاتھ باندھ کے میرے سامنے آ۔ تجھے میں چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں کا دودھ بھی یاد دلا دوں''۔ تابو نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میرے شہزادے کو پسند کرنے والی تو نے کبھی شیشے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟''

''تابو رانی! غصہ تھوک دے''۔ راجو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''راج کمار! اس زبان دراز کی زبان کو لگام دو تاکہ میں تم لوگوں کو مرگ وادی میں دھکیلنے سے پیشتر ذہنی عذاب میں بھی مبتلا کرسکوں''۔ پھنکار کے پس منظر میں خونی دیوی کی آواز پھر گونجنے لگی۔ ''تم نے ہمارے میزائلوں کا توڑ پیش کر کے اپنی موت کو دعوت دی۔ ہمارے سائنس داں اس حرکت سے خاصے پریشان ہوئے۔ ان کو اب ازسرنو سارے سرکٹ میں تبدیلی کرنا پڑے گی۔ چونکہ تم سفر آخرت پر روانہ ہونے والے ہو لہٰذا میں اس راز کا انکشاف کر رہی ہوں کہ تمہارے ملک میں ہمارے سینکڑوں ہزاروں غلام مصروف کار ہیں۔ دہشت گردی اب قصۂ پارینہ ہونے والی ہے۔ تمہاری حساس ترین اور اہم ترین تنصیب کو نشانہ بنانا ہمارا مقصد تھا۔ اس میں ہم سو فیصد کامیاب ہوئے۔ میری کلائی میں جو سرخ کنگن ہے یہ معمولی کنگن نہیں۔ اس میں ایک طاقتور ریموٹ کنٹرول نصب ہے۔ کنگن کے اندر دو گول دائروں میں دو تاریں ہیں۔ جونہی کنگن کو توڑ کر تاروں کو شارٹ کیا جائے گا ریموٹ کنٹرول طاقتور سگنل نشر کرنا شروع کردے گا اور تمہاری اہم ترین تنصیب جملہ تیاریوں کے ساتھ زمیں بوس ہو جائے گی۔ یہ ایسا دھماکا ہوگا جس کی گونج سارے کرۂ ارض پر سنائی دے گی۔ تمہارے ملک میں درجنوں ایسے دھماکے ہوئے جو تمہارے ماہرین کی سمجھ میں نہ آسکیں یہ ہمارے غلاموں کی کارروائی کے علاوہ میرے ریموٹ کنٹرولز کی قابل صد فخر کارکردگی کا نتیجہ تھے۔ دھماکا خیز مواد البتہ میرے غلاموں نے وہاں نصب کیا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول جو میرے غلاموں کی تحویل میں ہیں ان کی کارکردگی یعنی رینج Range محدود ہے لیکن وہ تلوار جو تمہارے سر پر لٹک رہی ہے اس کا کنٹرول میری تحویل میں ہے اور اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہے۔ ہم اپنی ہر شرط تم لوگوں سے منوا سکتے ہیں۔ ہم نے ثقافتی یلغار کے ذریعے تمہیں پہلے پستی میں دھکیلا۔ ہوس اور تلذذ کے کیف آور سمندر میں غوطے کھانے لگے تو تمہارے سارے طلسم بکھر گئے۔ اب تم کسی میدان میں بھی ہم سے آگے نہیں ہو۔ سوائے ہوس اور حماقت کے۔ حرف آخر کے طور پر یہ بھی سن لو کہ وہ بلیو پرنٹ والی فائل ابھی تک اس بلڈنگ میں محفوظ ہے۔ وہ اتنی خطرناک ہے کہ میں نے اس کی فوٹو کاپی کی اجازت بھی نہیں دی''۔

''وہ فائل کہاں ہے؟'' راجو نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہاری کلائی میں کنگن کو دیکھتے ہی میں بات

کی تہہ تک پہنچ گیا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ کسی حساس تنصیب کو دھماکے سے اڑانے والی بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ میں تمہاری مسکراہٹ کے سحر میں سرکھپاتا رہا"۔

"اور اب کیا تم میری مسکراہٹ کا راز پاسکے ہو؟"

"اب یہ کون سی راز والی بات رہ گئی ہے"۔ راجو نے جواب دیا۔

"تم لوگ فائل کے پیچھے پڑے ہو اور تمہارا سب کچھ داؤ پر لگ چکا ہے"۔ خونی دیوی نے صاف الفاظ میں کہا۔ وہ پھنکار اب غائب ہو چکی تھی۔ "بطور انعام اس جگہ کی نشان دہی کئے دیتی ہوں جہاں وہ فائل اس وقت موجود ہے"۔

تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ رضوان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"اس موت گھر کے بعد ایک معمولی سا کمرا ہے جس میں ایک تجوری رکھی ہے اس تجوری کو میرے سوا کوئی نہیں کھول سکتا۔ وہ خطرناک فائل اسی میں آرام فرمارہی ہے لیکن اب میں اسے وہاں سے نکال لوں گی"۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" رضوان نے صدیوں پرانا داؤ آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

"تم راج کمار! یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں مرنے سے پہلے تمہیں صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں"۔ راجو نے تابو کو اپنے قریب کھینچ کر اسے مہر بہ لب رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تابو اس کی قربت سے سرشار ہوگئی اور اس کا مفہوم بھی سمجھ گئی۔

"گویا میرے حسن نے تمہیں گھائل کر ہی دیا"۔ کمرے میں قہقہے کی صدا گونجنے لگی۔ "اس وقت میں تم سے صرف پانچ میل دور اپنے عشرت کدے میں تنہائی سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ میں اپنے سوئمنگ پول میں نہا رہی ہوں۔ یہ ہے میری تنہائی کا سبب"۔

"یہ تو سراسر ظلم ہے"۔

"سو تو ہے"۔ دیوی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر دیش کے لئے میری قربانی تو ملاحظہ ہو کہ میں تم جیسے پسندیدہ مرد کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار رہی ہوں۔ جہاں دیش کی عظمت کا معاملہ ہو میں اپنے جذبات کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ اب میں تیز ترین "سوم رس" میں اپنے آپ کو ڈبو دوں گی تاکہ اپنے فیصلے پر مجھے پچھتانے کا موقع ہی نہ ملے۔ ڈارلنگ گڈ بائی۔ تم نرکھ کے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔ میں؟ خیر، میں اپنے آپ سے نمٹنا جانتی ہوں۔ وہ دیکھو سامنے موت کے سفر کا آغاز ہوگیا ہے"۔

کمرے کی فضا میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ اچانک تابو کے حلق سے چیخ بلند ہوئی اور وہ سامنے والی دیوار کو مرگ دیدہ ہرن کی طرح دیکھنے لگی۔ دیوار پر تیز نوکیلی لمبی لمبی میخیں نکل آئی تھیں۔ جیسے برسات میں کھمبیاں اگ آتی ہیں اور وہ دیوار آہستہ آہستہ ان کی طرف سرک رہی تھی۔ ان کے عقب میں ہموار دیوار نے فرار کے سارے راستے بند کر رکھے تھے۔ راجو اور استاد گاموں ٹکٹکی باندھے اپنی جانب سرکنے والی موت کو دیکھ رہے تھے۔

"ہائے میں مراں! میرا سیف الملوک شہزادہ!" تابو عرف تاراج خاتون اچھل کر راجو کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر رضوان کو اپنی اوٹ میں لے رکھا تھا۔ گویا وہ اپنے شہزادے کی جانب بڑھنے والی موت کے آگے دیوار چین بن کر کھڑی ہوگئی تھی۔ دیوانی موت کا وار اپنے جسم کی ڈھال پر روکنا چاہتی تھی۔ یہ سراسر حماقت تھی، پاگل پن تھا، جو کچھ بھی تھا جذبۂ صادق تھا جو رنگ لا کر رہتا ہے۔

"تاراج خاتون! میری جان تُو مجھے موت سے کیسے بچا سکتی ہے؟" راجو نے شدت جذبات سے لرزاں

لہجے میں کہا۔

"میرے مالک میرے سردے سائیں! مجھے اپنے دل سے کیا ہوا وعدہ نبھا لینے دے"۔ جذبہ صادق لب کشا ہوا۔ "موت کو میرے وجود سے گزر کر میرے سینے، میرے دل کو چیر کر تجھ تک پہنچنا ہوگا"۔ تابو نے پہلی بار رضوان کو "تو تم" کہہ کر مخاطب کیا۔ دبے پاؤں سرکتی ہوئی موت نے گویا من و تو والا فاصلہ ہی مٹاڈالا تھا۔ تابو کا جسم خزاں رسیدہ پتے کے مانند لرز رہا تھا لیکن یہ موت کا خوف ہرگز نہیں تھا۔ یہ تو محبوب کی قربت تھی جس میں وہ پگھل رہی تھی۔ موم بتی کا شعلہ کانپ رہا تھا۔ وہ سادہ لوح پاگل سی لڑکی دستورِ محبت میں نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی پھر اس نے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے چہرہ گھما کر راجو کو دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر خود کو اس کے حصار میں قید کر لیا۔ فصیل جاں نے لرزنا بند کر دیا۔ وہ محبوب کی بانہوں کے حصار میں تھی۔ دل کو قرار تو آنا ہی تھا۔ راجو نے اپنی بانہوں کا حلقہ مزید تنگ کر لیا پھر بادل ناخواستہ اس پھسلی عافیت سے تابو کو محروم کر دیا۔

"ارے پاگل! مجھے سوچنے تو دے"۔ راجو نے مسکرا کر کہا۔ اس مسکراہٹ میں افسردگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

استاد گاموں اس بے وقت کی راگنی سے لاتعلق سا کھڑا تھا۔ پھر جیسے وہ طلسم سے آزاد ہو گیا۔ ڈوبنے والا انسان ہاتھ پاؤں تو ہلاتا ہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ نوکیلی آہنی میخوں کے درمیان والی ہموار سطح پر رکھ دیے اور فصیل جاں کی پوری توانائی سے دیوار کو دھکیلنے لگا لیکن دیوار کا سفر جاری رہا۔ اس کی آہستہ خرامی میں کوئی فرق محسوس نہ ہوا۔ جانے اس دیوار کو کتنے "ہارس پاور" کی موٹر دھکیل رہی تھی۔ یہ کوئی سپر مین والی فلم کا سین تو تھا نہیں کہ موت کی دیوار رک جاتی۔

"استاد! پیچھے ہٹ جاؤ"۔ راجو نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "لیزر گن نکالو۔ لیزر گن"۔ یہ فقرہ اس نے سرگوشی میں کہا۔ مبادا وہ خونی دیوی سن لے۔ تابو کو بھی اس نے اشارے سے سمجھایا۔ اس کی اپنی لیزر گن تو بالکل تیار تھی مگر استاد گاموں اور تابو نے اپنی اپنی گنیں لباس کے اندر چھپا رکھی تھیں۔

"ہماری بھی کیسی مت ماری گئی"۔ استاد نے زیر لب کہا۔

بیک وقت تین لیزر گنز (Laser Guns) آہنی دیوار کو چاٹنے لگیں۔ نوکیلی میخیں ان کے قریب آ رہی تھیں۔ زندگی اور موت میں دوڑ لگ گئی۔ دیوار پر گنوں سے مستطیل شگاف پڑنے لگا۔ مستطیل کی نچلی لکیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میخوں نے ان کو آ لیا۔ استاد گاموں نے گن پھینک کر پہلا حربہ آزمایا۔ تابو اور راجو نے بھی اس کی پیروی کی۔ رفتہ رفتہ موت ان سے دور ہونے لگی۔ آہنی دیوار میں سے مستطیل ٹکڑا ٹوٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ راجو نے برق رفتاری سے تابو کو شگاف سے باہر دھکا دیا۔ پھر خود نکلا اور آخر میں استاد گاموں بھی موت کے جبڑوں سے بچ کر نکل آیا۔

دیوی کے تلاتے ہوئے کمرے میں پہنچے تو تجوری ان کے سامنے تھی۔ استاد ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ "جب بُرا وقت آتا ہے تو واقعی مت ماری جاتی ہے"۔ استاد نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا۔ "یہ خونی دیوی تو مجھے گھسیٹے خان کی اولاد لگتی ہے۔ اس تجوری کے متعلق وہ ڈینگیں مار رہی تھی؟ اسے تو میں چٹکی بجا کر کھول سکتا ہوں"۔

اور واقعی استاد نے کمال کر دکھایا۔ لیزر گن استعمال کی جاتی تو فائل کے ضائع ہو جانے کا احتمال تھا۔ فائل کو دیکھ کر راجو کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ سارے کاغذات جوں کے توں موجود تھے۔ اس نے یہ ہفت اقلیم کی دولت لباس کے نیچے سینے سے لگائی۔

''استاد! ذرا رک جاؤ، میں اس عمارت میں اپنی آمد کے آثار چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ بس زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگیں گے''۔

اس عمارت سے رخصت ہو کر پُراسرار عمارت میں پہنچے وہاں البتہ ان کو اتنا وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔

''استاد! وہ ڈینی......؟''

''وہ دودھ پیتا بچہ نہیں، زندگی ہوئی تو بچ بچا کر آ ہی جائے گا''۔ استاد نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ''اب تم لوگ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میں نے واپسی کا انتظام کر رکھا ہے''۔ جب وہ پُراسرار بلڈنگ سے نکل کر ایک سبزی سے لدے پھندے ٹرک میں سوار ہوئے تو موٹر مکینکوں والی ڈانگریاں پہنے ہوئے تھے اور ان کے سارے ''عیب'' چھپ چکے تھے۔ چہروں پر گریس موبائل آئل، میل کچیل اور اور سیاہی کے مرکب سے ''میک اپ'' کیا ہوا تھا۔ چند گاڑیاں خونی بلڈنگ کی جانب بھاگی جا رہی تھیں۔

''استاد! خونی دیوی کے سوئمنگ پول میں نہانے چلنا ہے''۔ راجو نے کہا۔ ''ہمارا میک اپ صرف اس پول میں ڈبکی لگانے سے اترے گا''۔ پھر وہ تابو سے مخاطب ہوا۔ ''کیا خیال ہے تاراج بابو؟''

''اس سے ملاقات تو ضروری ہے جی، اس نے ہماری بڑی بے عزتی خراب کی ہے''۔ تابو نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔

ان کی کارروائی میں سرفہرست برق رفتاری تھی اور یہی ان کی کامیابی کا راز بنتی جا رہی تھی۔ رحمت چھاٹ کو راجو نے دو روز بعد کا وقت دیا تھا لیکن کارروائی ایک روز بعد ہی کر گزرا تھا۔ ہر جنگ میں مکمل رازداری اور برق رفتاری کامیابی کا زینہ ہوا کرتی ہے۔ اسی نہج پر رضوان کی تربیت ہوئی تھی۔ کامیاب تربیت کا دوسرا نام عادت ثانیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

استاد کاموں خونی دیوی کی قیام گاہ سے واقف تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ٹرک ڈرائیور کو اپنی ورکشاپ چلنے کا اشارہ کیا۔ ورکشاپ پہنچے تو ایک خوشگوار حیرت ان کی منتظر تھی۔ ڈینی ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور ہر نوع کے حالات میں زندہ رہنے کے فن سے آشنا تھا۔ پل بھر میں انہوں نے حلیہ تبدیل کیا اور چاروں خونی دیوی کے عشرت کدے کی طرف چل دیئے۔

''اگر نصیب اچھے ہوئے تو موصوفہ 'سوم رس' کے نشے میں دھت پڑی ہوگی''۔ راجو نے اظہار خیال کیا۔

''برخوردار! وہ کوئی عام نازک اندام دوشیزہ نہیں ہر حالت میں مجسم خطرہ ہے۔ بس ذرا نرگسیت کا شکار ہے۔ یہ کمزوری تو ہر بنت حوا میں ہوتی ہے''۔ استاد کاموں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

پہاڑی کے دامن میں وہ ایک خواب ناک سی عمارت تھی۔ سفید براق رنگ میں ڈوبی ہوئی جو نیلے بادلوں تلے اور بھی بھلی لگتی تھی۔

''استاد! اس عورت کا ذوق حسن واقعی قابل تعریف ہے''۔ راجو نے دوربین کی مدد سے عمارت کے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں برخوردار! اس نے تمہیں پسندیدگی سے جو نوازا ہے''۔ کاموں نے لطیف سی چوٹ کی مگر راجو کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ''کیا شے دیکھ لی ہے شکرے؟'' اس نے دوربین کی طرف ہاتھ بڑھاتے کہا۔ ''ذرا میں بھی تو نظارہ کروں اس غارت گر ہوش کا''۔

''پنچھی گھونسلے سے پرواز کر گیا استاد''۔ راجو نے دوربین اسے تھماتے ہوئے کہا۔

ملٹری کی جیپ سفید عمارت کے مین گیٹ سے فراٹے بھرتی ہوئی نکلی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر

خونی دیوی براجمان تھی اور پچھلی سیٹوں پر اس کے محافظ بندوقیں تانے بیٹھے تھے۔

"تم نے اس کی دم میں آگ جو لگا دی ہے۔ ظاہر ہے اب تو وہ جیٹ جہاز کی رفتار سے پرواز کرے گی۔ ٹھیک ہے ہم انتظار کئے لیتے ہیں"۔ استاد گاموں نے فیصلہ سنا دیا۔

جس پہاڑی پر وہ چھپے بیٹھے تھے وہ سرسبز و شاداب تھی۔ ان کے دیکھ لئے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ خطرات کی حد سے بہت دور جا چکے تھے۔ ہتھیلیوں پر نقد جاں سجائے بیٹھے تھے۔ وہ دودھ پینے والے مجنوں نہیں خون دینے والے عشاق تھے۔

***

سورج نے صف لپیٹی، شام اتری تو سفید عمارت روشنیوں سے جگمگانے لگی۔ خونی دیوی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اپنے کمرے میں ٹہلتی ٹہلتی وہ قد آدم آئینے کے سامنے رک کر اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ اپنی سرگیں سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھ کر وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ "شانتی اپنے آپ پر قابو پاؤ۔ دشمن کو حقیر مت سمجھو۔ مطلب براری کے لئے ہر حربہ استعمال کرو۔ مہان گورو چانکیہ کی "ارتھ شاستر" پر عمل کرو۔ یہ مہان پستک ہر قدم پر تمہاری راہنمائی کرے گی"۔ پھر اس کی نگاہ اپنی کلائی والے کنگن پر جم کر رہ گئی۔ بصد احتیاط اس نے کنگن اتارا اور اسے گھورنے لگی۔

"اگر ان مسخروں نے مزید حماقت کا ثبوت پیش کیا میں اس کنگن کو توڑ کر دشمن کی کمر توڑ ڈالوں گی۔ بھگوان کی سوگند میں ایسا کر گزروں گی۔ ہمارے نیتاؤں کی عقل تو جانو گھاس چرنے گئی ہے۔ دھیرج شانتی کا اپدیش دیتے رہتے ہیں"۔ اس نے وہ سرخ کنگن سنگھار میز کی دراز میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا۔ اس کمرے میں پرندہ تک پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ اپنے عالیشان پلنگ پر بیٹھ کر لائحہ عمل مرتب کرنے لگی پھر کچھ سوچ کر اس نے موبائل فون پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ "عمارت کے گرد ہوشیار پہرے دار متعین کر دو۔ نہیں اس دیوار کو مرمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، سوت گھر کو بھی ویسا ہی رہنے دو۔ ورنہ میری آتش انتقام سرد پڑ جائے گی۔ اسی چتا کی اگنی میں دشمنوں کو بھسم ہونا ہے اور نا کا بندی میں کوتاہی ہوئی تو ذمے داروں کو بلیدان دینا پڑے گا۔ میرے احکام پر عمل کرو۔ گھس بیٹھیے گرفتار ہو جائیں تو فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرو۔ اس کے علاوہ مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش مت کرنا"۔

***

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی جب سرفروشوں کی چوکڑی اپنی کمین گاہ سے نکلی۔ خونی دیوی کی رہائش گاہ پر سکوت طاری تھا۔ مین گیٹ پر دو پہرے دار چاک و چوبند کھڑے تھے۔ گیٹ کے بعد وسیع لان تھا اور رہائشی کمروں کے عین سامنے سوئمنگ پول۔ اس پول کا درجہ حرارت معتدل رکھنے کے لئے جدید اور نفیس قسم کا الیکٹرانک نظام ایک کونے میں نصب تھا۔

راجو فوجی وردی میں ملبوس پُر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچا۔ دونوں پہرے دار چوکس ہو گئے۔ اس کے عہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے رضوان سے "شناخت" طلب کی اور ورطۂ حیرت میں گم ہو گئے۔ شیو سینا کا مہا مہان نشان دیکھ کر وہ سلیوٹ کرنا تک بھول گئے۔

"سر! پدھاریئے سر! اندر اطلاع کر دوں؟" ایک پہرے دار نے دروازہ کھولتے ہوئے درخواست کی۔

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ راجو نے مختصر جواب دیا۔ "راستہ میرا دیکھا بھالا ہے"۔

"سر! ذرا رک جایئے میں کتوں کو زنجیر تو ڈال دوں"۔ پہرے دار نے اپنا فقرہ مکمل کیا ہی تھا کہ اس کی گردن شکنجے میں آ گئی۔ ایک دیو قامت راکھشس نے

جانے کہاں سے آ کر اسے دبوچ لیا۔ زمین سے اس کے پاؤں کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ دوسرے پہرے دار کو حیران ہونے تک کا موقع نہ ملا۔ راجو نے پوری قوت سے حریف کی گردن پر وار کیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ کوئی ناخوشگوار آواز نکالے بغیر زمین بوس ہو گیا۔

''استاد! اب دل لگی چھوڑ بھی دو، بے چارہ سورگ باشی ہو چکا ہے''۔ راجو نے گاموں کو یاد دلایا تو گاموں نے پہرے دار کو ناگوار بوجھ کی طرح ایک طرف پھینک دیا۔ ڈیجی اور تابو بھی ان سے آن ملے۔ لان میں وہ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان پر دو بلائیں نازل ہو گئیں۔ یہ گدھے کے قد برابر خونخوار کتے تھے اور ایسے عجیب و غریب کہ ان میں ''کتاپن'' نام کو نہیں تھا۔ نہ بھونکے نہ غرائے نہ انہوں نے دانت نکوسے۔ بس اچانک چھلانگیں لگا کر حملہ آور ہو گئے۔ ایک نے ڈیجی کی گردن دبوچنے کی کوشش کی دوسرا تابو کی جانب لپکا۔

ڈیجی نے سگ نابکار کی گردن دبوچ لی اور دونوں باقاعدہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ڈیجی کی شہ رگ نوکیلے تیز دانتوں سے کوئی دو انچ کے فاصلے پر تھی جب اس کے ہاتھ میں کتے کا نچلا جبڑا آ گیا۔ اس نے فصیل جاں کی پوری قوت سے زور لگایا اور ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ کتے کا جبڑا حلق تک چیر چکا تھا۔ اب وہ بھونکنے کے قابل ہی نہ رہا۔ ڈیجی لان ہی میں لیٹ کر استراحت فرمانے لگا پھر اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

تابو پر حملہ آور کتے کا وہ حشر ہوا جو لنکا میں راون کی فوج کا نہ ہوا ہو گا۔ استاد گاموں نے آنے والی بلا کے سر پر ہتھوڑے جیسے ہاتھ کا وار کیا۔ کتے کے حلق سے بس ''چوں'' سے ملتی جلتی آواز خارج ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ٹرک تلے روندا گیا ہو۔

''استاد جی! تسیں کیہ بلا او''۔ تابو نے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر چاروں ہمہ تن گوش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ہر سمت مکمل سناٹا طاری تھا۔

''یہ خاموشی میری سمجھ میں نہیں آ رہی''۔ راجو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے''۔

پھر ایک بالکل ہی غیر متوقع بات ہو گئی۔ راجو کو بخوبی علم تھا کہ خونی دیوی کے قبضے میں سرخ کنگن کی شکل میں ترپ کا اکا تھا۔ یہ گویا اس کی شہ رگ پر رکھا ہوا تیز دھار خنجر تھا۔ اس لئے وہ ہر حیلے وسیلے سے اسے چوکنا کئے بغیر سوڈی کنگن تک رسائی چاہتا تھا۔ صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ شور و غل سے گریز کیا جائے۔

''ڈیجی تم استاد کے ساتھ عمارت کے مشرقی حصے کا چکر لگاؤ میں اور تابو مغربی حصے کو دیکھ لیتے ہیں''۔ راجو نے دو حصوں میں بٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

جونہی استاد گاموں اور ڈیجی پندرہ بیس قدم آگے گئے اچانک ایک دیوہیکل دراز ریش سادھو ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں عجیب قسم کا ٹیڑھا میڑھا عصا تھا۔

''بالکو! کس کی کھوج میں ہو؟'' سادھو نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میری دیوی کا پوتر استھان ہے اور اس کی رکھشا کرنا میری تپسیا کا ایک حصہ ہے''۔

''مہاراج ہمیں آپ کی تپسیا سے کوئی سروکار نہیں''۔ استاد نے بصد احترام کہا۔ ''آپ بھگتی مارگ (رہ عشق) کے مسافر ہیں بھگوان سے لو لگانے والوں کو ان بکھیڑوں سے دور رہنا چاہئے''۔ استاد گاموں کی سنے بغیر سادھو نے برق رفتاری سے ''کھونڈ'' گھما کر وار کیا۔ یہ ایسا وار تھا جو کسی بھی انسان کی جان لے سکتا تھا۔ وار استاد کے پہلو پر پڑا۔ دوسرے وار کی سادھو مہاراج کو حسرت ہی رہی۔ استاد گاموں نے کھونڈ کو مضبوطی سے

پکڑ لیا اور دونوں اس عصا پر قبضہ کرنے کی تگ و دو کرنے لگے۔ یہ دو لیل مستوں کا ٹکراؤ تھا۔ اس کشمکش میں استاد کو کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے وہی گھونڈ پوری قوت سے سادھو مہاراج کے سر پر دے مارا۔ استاد کا سر پھٹ گیا لیکن اس نے جنگ سے منہ نہ موڑا۔ اب وہ دونوں باقاعدہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ذیلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ استاد کے عقب کی حفاظت کرے یا میدان جنگ میں کود پڑے۔ پھر زن سے ہوا کو چیرتا ہوا ایک خنجر آیا اور استاد گاموں کے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرنجان مرنج بندر نما شخص درخت سے کود کر ذیلی سے لپٹ گیا۔ اب وہ دالان باقاعدہ میدان جنگ بن گیا۔

''اس حرافہ کو تو سادھو سنتوں کی اشیرباد بھی حاصل ہے''۔ ذیلی اس چڑیچ کو گھونسے بھی رسید کر رہا تھا اور سوچتا بھی جا رہا تھا۔ وہ مرنجان مرنج جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ ذیلی کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

استاد گاموں کے پہلو میں خنجر پیوست ہوا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سارے پہلو میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ یہ ایک ناقابل فہم سی بات تھی۔ اس کے لئے خنجر کا زخم کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کی فصیل جاں میں مقید توانائی اس سے بے وفائی کرنے لگی ہے۔

''او میرے خدا! یہ خنجر ضرور مہلک زہر میں ڈوبا ہوا تھا''۔ یہ خیال آتے ہی استاد گاموں نے سادھو کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی۔ وہ ہاتھ جو آہنی سلاخوں کو بھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ اس کے دھند میں ڈوبتے ہوئے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ آہنی گرفت میں کی ہوئی گردن کو کچل کے رکھ دینا۔ اس ایک پل میں گویا چراغ نے سنبھالا لیا۔ کمرے جذبے نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ قوی ہیکل سادھو کی آنکھیں خوف و دہشت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے ہزار جتن کئے مگر موت کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد تنگ سے تنگ ہوتا چلا گیا۔ جانے کتنے لمحے بیت گئے۔ کتنی صدیاں گزر گئیں، سادھو بھی نہ اٹھنے کے لئے کٹے ہوئے تناور درخت کی طرح زمین پر گر گیا۔ اس کی آتما شریر سے کوچ کر گئی۔ استاد گاموں کی سانسیں اکھڑنے لگیں لیکن حریف کی گردن بدستور شکنجے میں رہی۔ یم دوت اور عزرائیل فانی انسانوں پر بیک وقت نازل ہوئے۔

وہ بندر نما شخص اچانک ذیلی کے ہاتھوں سے پھسل کر دور جا کھڑا ہوا۔ سادھو اور استاد گاموں کی لاشیں ایک دوسرے کے قریب پڑی تھیں۔ اس نے استاد کے پہلو سے خنجر نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا پھر اس نے سادھو کی لاش کو بغور دیکھا۔ ''گوردیو! ان ملیچھ مسلوں کو بھارت ورش میں زندہ رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں''۔ اس نے ایک ایک لفظ تول تول کر کہا۔

ذیلی نے بھی جھک کر اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا تیز دھار خنجر نکال لیا اور دونوں ایک دوسرے کو نظروں سے تولنے لگے۔ ذیلی اس حقیقت سے ناآشنا تھا کہ حریف کا خنجر سم قاتل میں بجھا ہوا ہے۔ اور اسی بے خبری کی سزا اسے بھگتنا پڑی۔

وہ مرنجاں مرنج شخص اچھل کر حملہ آور ہوا۔ ذیلی کا سینہ حریف کا ہدف تھا۔ زہریلا خنجر ہدف تک تو نہ پہنچ سکا کہ وہ ایک پیشہ ور کباڈی کا سینہ تھا لیکن بازو پر چرکا لگانے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ ذیلی اس خراش کو خاطر میں نہ لایا اور اس نے اپنا خنجر ماہرانہ انداز میں حریف کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ مرنجاں مرنج شخص کے حلق سے عجیب و غریب قسم کی صدا خارج ہوئی۔ اس کے پھیپھڑے ہوا کو ترسنے لگے۔ سارا کرۂ ہوا مل کر بھی ان پھیپھڑوں کی طلب کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔

ذیلی حریف سے فارغ ہوا تو اس کے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ یہ احساس رفتہ رفتہ دیکھتے الاؤ

میں بدل گیا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر لان کی نرم و ملائم گھاس پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک طرف لڑھک گیا۔

راجو اور تابو لمبا چکر لگا کر واپس آئے تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ استاد کاموں اور ڈیٹی کی لاشیں نیلی پڑ چکی تھیں اور ان کے منہ سے جھاگ خارج ہو رہی تھی۔ راجو پہلی نگاہ ہی میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ تابو پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاشوں کو دیکھ رہی تھی۔ رضوان نے مرنجاں مرنج شخص کے ہاتھ سے خنجر لے کر اس کا بغور معائنہ کیا پھر اسے سونگھ کر افسردگی سے سر ہلانے لگا۔

''تابو رانی! ہمارے دونوں ساتھی شیطانی وار سے شہید ہو گئے''۔ راجو نے زیر لب کہا۔ ''یہ خنجر زہریلا ہے''۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر وہ خنجر اپنے قبضے میں کر لیا۔ ''استاد اور ڈیٹی ہمارے راستے کے سارے کانٹے صاف کر گئے''۔ راجو کے لہجے میں دنیا جہان کا دکھ سمٹ آیا۔

حیران کن بات یہ تھی کہ خونی دیوی جس کمرے میں محو استراحت تھی اس کا دروازہ مقفل نہیں تھا۔ خواتین عموماً دروازے کی اندر سے چٹخنی چڑھا کر سوتی ہیں لیکن خونی دیوی کو تو روحانی معاونت بھی میسر تھی پھر اس کی دہشت کا طلسم ہی اس کی حفاظت کو کافی تھا۔ راجو اور تابو دبے پاؤں اندر داخل ہوئے تو خونی دیوی شب خوابی کے لباس میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لئے اس نے فراخ دلی سے مے نوشی کی تھی۔ راجو نے محو خواب دوشیزہ کی ننگی کلائیوں کو دیکھا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ''گویا وہ کنگن کسی جگہ محفوظ ہے اور اس چڑیل کی دسترس میں نہیں''۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''اٹھ نی، تینوں بھو دا یار وکھاواں''۔ تابو نے شاندار جملہ ادا کرتے ہوئے خونی دیوی کو جھنجھوڑا۔

ایک پل وہ محو خواب تھی، دوسرے پل قہر آلود نگاہوں سے جگانے والی کو گھورنے لگی۔ راجو بڑے اطمینان سے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ کنگن حاصل کرنے کے لئے خونی دیوی سے مذاکرات کرنے کو بھی تیار تھا۔ اس کے لئے وہ حتی الامکان تیاری کر کے آیا تھا۔ دھونس، دھاندلی، مہر و محبت۔ ہر حربہ اس کی نگاہوں میں جائز تھا۔

چھوکری! کون ہے تو اور کمرے میں آنے کی تجھے جرأت کیسے ہوئی''۔ وہ ایک ملکہ عالیہ کے انداز میں لب کشا ہوئی۔

تابو نے چٹاخ سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ ''اے'' اس کے ہونٹوں سے صرف ایک لفظ ادا ہوا۔ اس زناٹے دار تھپڑ نے مذاکرات کے سارے دروازے بند کر دیئے۔

''تم لوگ اپنی موت کو ترسو گے اور تمہیں میں کالی ماتا کے چرنوں میں.....'' خونی دیوی اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ تابو اچھل کر اس کے پلنگ پر چڑھ گئی لیکن دیوی نے اسے دونوں ہاتھوں میں تول کر پلنگ کی دوسری جانب اچھالا اور برق رفتاری سے قلابازی لگا کر اس کے اوپر جا گری۔ عشرت کدہ میدان جنگ بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑیں۔

راجو عدم مداخلت کے ذریعے اب بھی مذاکرات کا کم از کم ایک دروازہ کھلا رکھنا چاہتا تھا مگر حالات دوسرا رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ حاکم پور کے دور افتادہ گاؤں میں پروان چڑھنے والی تابو ترش کرشت پہلو ہیرا بن چکی تھی۔ اس کا وجود طاقت و توانائی کا خلاصہ تھا جسے راجو نے لمبی تربیت کے ذریعے ناقابل شکست بنا دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں خونی دیوی فن حرب و ضرب کا وقار گردانی جاتی تھی۔ دونوں ایک مقصد کی خاطر برسر پیکار تھیں۔ چار ٹانگیں اور چار ہاتھ اگرچہ نسوانی اعضاء تھے مگر

اس برق رفتاری سے حرکت کر رہے تھے کہ نگاہیں دھوکا کھا رہی تھیں۔ عشرت کدے کا فرنیچر اس معرکہ آرائی کی نذر ہونے لگا۔

راجو نے محسوس کیا کہ خونی دیوی نے دو تین بار اپنی سنگھار میز کی جانب بغور دیکھا تھا۔ یہ ایسی ہی لاشعوری حرکت تھی جو ہر مسافر سے سرزد ہوتی ہے اور وہ لُٹ جانے میں اس جیب کو ٹٹولتا ہے جس میں اس کی پونجی رکھی ہو۔ فنکار جیب تراش "اس نشان دہی" سے استفادہ کر جاتے ہیں۔ راجو کو یقین ہو گیا کہ اس کا مطلوبہ کنگن ضرور اسی جگہ چھپایا گیا ہے۔

جنگ زوروں پر تھی جب خونی دیوی نے اچھل کر پوری قوت سے اپنی ایڑیاں تابو کے سینے پر ماریں۔ تابو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور فرش زمین پر چاروں شانے چت ہو گئی۔ دیوی نے چھلانگ لگائی اور ایڑیوں کے بل تابو کے پیٹ پر گری۔ اس واؤ سے بچاؤ کی تربیت راجو اسے بارہا دے چکا تھا۔ تابو نے پیٹ کے عضلات کھینچ کر سنگ صفت بنا لئے اور آنے والی کا بوجھ برداشت کر گئی۔ خونی دیوی ایڑیوں کی مدد سے اس کا پیٹ گویا کچل رہی تھی لیکن تابو اس کی کوشش کو ناکام بنائے جا رہی تھی۔ راجو بڑے غور سے یہ کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر تابو کی توجہ ایک پل کے لئے اِدھر اُدھر مبذول ہوئی تو اس کا ارتکاز مجروح ہوتے ہی خونی دیوی کامیاب ہو جائے گی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ اس کی خونی ایڑیاں تاراج خاتون کا پیٹ ہی پھاڑ ڈالیں۔ اس لئے وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ خدا خدا کر کے تابو نے دشمن جاں کے پاؤں قابو کئے اور کروٹ بدل کر اسے گرانے میں کامیاب ہو گئی۔ راجو جانتا تھا کہ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ یہ وار عموماً جاں لیوا ثابت ہوتا ہے۔ تابو نے اچھل کر زمین چھوڑی تو اس کی گویا جون ہی بدل گئی۔

"میرے ملک توں میلی اکھ نال ویکھن والی روز خ دی تیاری کر لے"۔ تابو نے رقاصہ کی طرح گھوم کر پاؤں کی ایڑی سے خونی دیوی کی کنپٹی پر دستک دی۔ پہلی بار دیوی کے منہ سے آہ نکلی پھر تابو لٹو کی طرح گھومنے لگی اور ہر چکر میں اس کا پاؤں دیوی کے رخ روشن پر تھک سے لگتا۔ گھومتے گھومتے ایک بار اس نے کھڑی ہتھیلی کا وار دیوی کی صراحی دار گردن پر کیا۔ اس وار میں بے پناہ طاقت تھی۔ دیوی زمین بوس ہو گئی۔ ہونٹوں کے کناروں سے خون رس رس کر تابو کی ٹھوڑی کو رنگین بنا رہا تھا۔

"لکھ دی لعنت تیری اوقات تے۔ جی کروا اے تیریاں بوٹیاں نگا چیر دیاں"۔ تابو نے خالص نسوانی انداز میں کہا۔ "کدھ رکھے ای کنگن؟"

خونی دیوی نے نیم وا آنکھوں سے اس بلائے بے درماں کو دیکھا اور پھر اس کی نقاہت بھری نگاہ سنگھار میز کی جانب اٹھ گئی۔ راجو نے سہارا دے کر اسے زمین سے اٹھایا۔

"شریمتی جی! ہم تمہیں بہ آسانی موت کے حوالے کر سکتے ہیں"۔ راجو نے کہا۔ "لیکن یہ مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کنگن کا حصول ہمارے لئے کیوں ضروری ہے۔ تم اس وقت ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ تمہاری سہائتا کرنے والے پرلوک سدھار چکے ہیں، اس کے باوجود میں تمہیں ایک تماشا دکھانا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ"۔ تینوں عمارت کے اس حصے میں جا کھڑے ہوئے جہاں سے خونی بلڈنگ اگر دن کی روشنی ہوتی تو دیکھی جا سکتی تھی۔ راجو نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتار کر اپنے ہاتھ میں تھام لی اور خونی بلڈنگ کی سمت اشارہ کیا۔ "اپنی سچائی کا یقین دلانے کے لئے مجھے یہ ناخوشگوار فریضہ ادا کرنا پڑ رہا ہے ادھر دیکھو"۔

تقریباً پانچ سیکنڈ بعد کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور خونی بلڈنگ سے شعلے اٹھنے لگے۔

خونی دیوی سکتے کے عالم میں شعلوں کو تکے جا رہی

تھی۔ راجو کا پیغام اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔

"تم لوگوں کی حساس تنصیبات کے ساتھ یہی سلوک ہونے والا ہے"۔ رضوان نے کہا۔ "تم وہ کنگن ہمارے حوالے کر دو اور ان حرکات سے باز آ جاؤ ورنہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ میرا مفہوم تم نے سمجھ لیا ہو گا۔ میں تمہیں زندہ چھوڑنے پر مجبور ہوں"۔

"ایسی کون سی مجبوری ہے جس کی بناء پر تمہیں میری زندگی سے پیار ہو گیا ہے"۔ خونی دیوی پہلی بار لب کشائی ہوئی۔

"تم میری بات اچھی طرح سمجھ چکی ہو۔ خصوصاً اس تشریح کے بعد"۔ اشارہ خونی بلڈنگ کے نذرِ آتش ہو جانے کی طرف تھا۔ "تمہارے بعد کوئی اور تمہاری جگہ سنبھالے گا پھر اسے سمجھانے کے لئے مجھے آنا پڑے گا۔ بار بار کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے یہی سیانے کہتے ہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں"۔ دیوی نے کہا۔

"ہم بدستور دشمن رہیں گے لیکن کمینی حرکات سے گریز کریں گے"۔

"تم میری توقع سے بڑھ کر عقلمند ثابت ہوئی ہو شریمتی! اب کنگن میرے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں اس وقت وہ تمہاری سنگھار میز کی دراز میں ہے"۔

"تم نے خود اسے کیوں حاصل نہیں کر لیا؟" شریمتی حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اب تم حماقت کا ثبوت پیش کر رہی ہو؟" راجو نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری موت ہمارے مفاد میں نہیں اور دھینگا مشتی میں وہ کنگن ٹوٹ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تشریح تمہاری توہین کے مترادف ہو گی"۔

شریمتی سر جھکا کر سوچنے لگی۔ "یہ بات اگرچہ میری طبیعت کے سراسر خلاف ہے لیکن یاد رکھنا، معاف کرنا میری سرشت ہی میں نہیں۔ اس کا بدلہ میں بڑے بھیانک انداز میں لوں گی۔ سمجھ لو میں ناگن ہوں اور زخمی ہو چکی ہوں"۔

"زخمی ناگن!" راجو نے زیرِ لب دہرایا۔ "میں اس بات کو یاد رکھوں گا بلکہ تمہارا یہ پیغام اپنے وطن کے بچے بچے تک پہنچا دوں گا کہ ناگن زخمی ہو چکی ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے"۔

"اس کے لئے تمہیں بڑا شوخ اندازِ بیاں اپنانا پڑے گا۔ بڑے پاپڑ بیلنے ہوں گے"۔

اپنے کمرے میں آ کر خونی دیوی نے وہ کنگن لرزتے ہاتھوں سے راجو کے حوالے کیا۔ راجو نے تابو کی کلائی میں پہنا دیا۔ "تاراج بانو! اس کی اہمیت سے تم واقف ہو لہٰذا......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنے آپ"۔ تابو نے بے داغ لہجے میں کہا۔

"تم نے بھی میری بات سمجھ لی"۔ رضوان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس کنگن کو مجھ پر فوقیت دیتیں تو بخدا مجھے زیادہ خوشی ہوتی"۔

"نہیں راج! میں جھوٹ نہیں بول سکتی اور منافقت سے مجھے سخت نفرت ہے"۔ اس بار خونی دیوی نے بھی حسرت بھری نگاہوں سے تابو کو دیکھا۔

"شاید ایسے لوگوں کی وجہ سے تمہارے پاکستان کا وجود قائم ہے"۔ خونی دیوی نے جھکی نگاہوں سے زیرِ لب کہا۔ "راج کمار! مجھ سے ایک سودا کرو گے؟" شریمتی نے بدستور فرشِ زمین کو جھانکتے ہوئے کہا۔

"بات سوچ سمجھ کر کرنا"۔ تابو نے مداخلت کی۔

"پلیز مداخلت سے گریز کرو۔ ورنہ میں اپنا ارادہ بدل دوں گی"۔ خونی دیوی کے لہجے میں تلخی در آئی۔ راجو نے تابو کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں جانتی ہوں تم کسی نہ کسی طرح بچ کر جا سکتے ہو۔ میرا ایک ہم کارکن تمہارے ادارے کی قید میں

ہے۔ اس کے بدلے میں تمہاری واپسی کو آسان بنا دیتی ہوں"۔

"عام حالات میں مجھے یہ شرط ہرگز قبول نہ ہوتی لیکن "اس کنگن" کی وجہ سے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تمہارا آدمی واپس آ جائے گا"۔

***

گیارھویں روز رضوان ملک صاحب کے سامنے بیٹھا کارروائی کی تشریح کر رہا تھا۔ "رحمت کی نشاندہی پر شیو سینا کے اہم کارکنوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ رحمے کا مقدمہ ابھی زیر غور ہے"۔

"تاباں دھیمے ذرا حقہ تازہ کر لے آ۔ مواد ہی نہیں آ رہا"۔ ملک صاحب نے پہلی بار تابو سے خدمت لے کر اسے صدق دل سے قبول کر لیا اور جب انہوں نے رضوان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کا رنگ بدل چکا تھا۔

"رحماں اس وقت کہاں ہے؟" ملک صاحب نے عکسیہ لہجے میں پوچھا۔

"اپنے گاؤں میں"۔

"وہ ریموٹ کنٹرول کہاں ہے؟"

"وہ تو میں آپ کے سپرد کر گیا تھا"۔

"یہ چابی لو اور تہہ خانے کی الماری سے وہ کنٹرول نکال لاؤ"۔ ملک صاحب نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"ریموٹ کنٹرول میز پر رکھ کر انہوں نے صرف ایک سوال کیا۔ "اس کا رینج کافی ہے نا؟" پھر انہوں نے پانچ نمبر والا بٹن انگشت شہادت سے دبا دیا۔ "اگر میں نے گناہ کیا ہے تو خدا مجھے معاف کرے"۔ معافی طلب کرتے ہوئے بھی ملک صاحب کا لہجہ چہک رہا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ سجاول خان کی ذہنی پسماندگی کا علاج بھی ایک ماہر نفسیات نے ڈھونڈ نکالا۔ کوئی ایک ماہ بعد وہ مکمل رو بہ صحت ہو کر راجو، تابو اور ملک صاحب سے محو کلام تھا کہ راجو نے کنگن والا معاملہ اس کے سامنے رکھا۔

"کنگن کو غیر موثر بنانا کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں لیکن ہم کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے"۔ سجاول نے وضاحت کی۔ "ریموٹ کنٹرول سے خارج ہونے والا سگنل الیکٹرو میگنیٹک ویو یا سادہ فریکوئنسی پر مشتمل ہوتا ہے اور سکے Lead میں سے تو تابکار شعاعیں بھی نہیں گزر سکتیں۔ ایک عام سگنل کی کیا اوقات ہے"۔

چنانچہ سکے کی موٹی چادر سے ایک مضبوط چوکور ڈبا بنایا گیا۔ اس میں موذی کنگن کو رکھ کر زمین کی گہرائی میں دفن کر دیا گیا۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے وہ کنگن ٹوٹ بھی جائے تو قیامت خیز "سگنل" باہر نہ نکل سکے۔ رضوان ہر محفل میں ایک ہی موضوع زیر بحث لاتا ہے۔ "عزیزان من! ناگن زخمی ہو چکی ہے، وہ اپنے کارکنوں سے ایسا ہی کوئی اور ریموٹ کنٹرول بنوا سکتی ہے۔ وہ تلوار ہمارے سر پر لٹکتی رہے گی اس کا ایک ہی حل ہے کہ تلوار کی دھار کو کند کر دیا جائے۔ اس کے لیے بچے بچے کا تعاون درکار ہے۔ فی الحال میں نے اس زخمی ناگن کو اپنے منتر سے کیل کر پٹاری میں بند کر رکھا ہے لیکن اگر اس کا منتر طلسم پاش پاش ہو گیا تو؟"

وطن عزیز میں کوئی راجو کی بات ہی نہیں سن رہا، صرف اس کی محبوبہ دلنواز تابو سید ھی سادی اور معصوم تابو اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی ہے۔ "شہزادے جی! آپ کے منتر کی کیا بات ہے، زخمی ناگن کو چلتا تو رہا ایک طرف اس نے تو تابو شیرنی کو رام کر لیا ہے"۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کیا اس "جعلی کڑی" کی تسلی کافی ہے۔ شاید ہم "زخمی ناگن" کے مفہوم سے واقف ہی نہیں؟

◆O◆

انتخاب

چند مختصر مختصر دل نشیں نوکیلی، کٹیلی مگر خیال انگیز مختصر کہانیوں کا انتخاب

سنگریزے

ٹو ہر ٹینا

تین بندوق بردار محافظوں میں گھرا ہوا ایک شخص کار سے اترا۔ چہرے مہرے سے وہ سیاسی رہنما معلوم ہوتا تھا۔ تینوں مسلح محافظوں نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کار گھیر لی، جیسے کوئی ہوا کار اٹھا لے گا۔ ویسے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایس ایس پی کا دفتر ایک چھوٹا سوتا قلعہ تھا۔

ہر طرف سے حفاظتی دستے میں گھرا ہوا لیڈر ہانپتا کانپتا سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے کمرے میں پہنچا۔ ایس ایس پی نے ایک عقلمند افسر کی طرح اس کا استقبال کیا۔

"آیئے جناب آیئے تشریف رکھیے"۔

"ایس ایس پی! ہم بہت بڑی شکایت لے کر آئے ہیں تمہارے پاس"۔ لیڈر نے بیٹھنے سے پہلے کہا۔

"جناب! بیٹھیے تو سہی۔ چائے، ٹھنڈا؟ گلے شکوے تو چلتے ہی رہیں گے"۔ پولیس افسر صاحب بھی گویا نیم سیاست داں بن گئے ہوں۔

"بات یہ ہے کہ مجھے صرف تین باڈی گارڈ دے کر ٹال دیا گیا اور مختار سنگھ کو پائلٹ جیپ بھی دے دی گئی۔ جیپ پر ایک سپاہی مشین گن لیے بیٹھا رہتا ہے، وہ آس پاس جھانکتا بھی کوے کی طرح ہے۔ مختار سنگھ بھی سابق ایم ایل اے ہے، میں بھی۔ ایک ہی بازار میں یہ دو بھاؤ کیوں؟"

"اصل میں بات یہ ہے کہ وہ برسر اقتدار جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور برسر اقتدار جماعت کو خطرات زیادہ ہوتے ہیں"۔ ایس ایس پی نے اپنی طرف سے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"رونا تو اسی بات کا ہے"۔ سیاست کار نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "تم جیسے ایمان دار افسر سے ہم اس امتیازی سلوک کی توقع نہیں رکھتے"۔

"امتیازی سلوک کی بات نہیں ہے، جناب! میں تحفظ کی بات کر رہا ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کہاں کتنی حفاظت کی ضرورت ہے"۔

لیڈر نے حقارت سے محافظوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "ان بے چاروں نے آج تک بچایا ہے کس کو؟ یہ یا تو مر گئے یا بھاگ گئے۔ میں تو صرف اتنی درخواست کرتا ہوں کہ سب سے ایک سا برتاؤ ہونا چاہیے۔ ہم بھی عوامی نمائندے ہیں"۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھئے"۔ پولیس چیف پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "عوامی دور میں عوام کے نمائندوں کو آخر محافظوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں ضرورت کی نہیں، عزت کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے حریف پائلٹ جیپ میں مشین گنوں کے ساتھ انتخابی حلقوں میں جائیں اور ہمارے پلے کچھ نہ ہو۔ ہماری تو عزت دو کوڑی کی رہ گئی، یہ کیسی ناانصافی ہیں" لیڈر کرسی سے اٹھ گیا۔

اس کی پیٹھ دیکھ کر ایس ایس پی کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔

جھجک

پڑھے لکھے نوجوان کو کہیں جانا تھا۔ وہ بس کے اڈے پر بسوں کے بورڈ پڑھتا پھر رہا تھا۔

بیوقوف کہلانے کے ڈر سے اس نے کسی سے بس کے بارے میں پوچھا نہیں، صرف گھومتا رہا۔ ایک بس سے دوسری اور دوسری سے تیسری اور چوتھی۔

ایک ان پڑھ سا آدمی آیا، اس نے بس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے بس کے متعلق پوچھا اور جھٹ سے بس میں بیٹھ گیا۔ بس چلنے لگی۔

پڑھا لکھا نوجوان اب بھی بسوں کے بورڈ پڑھتا ہوا وہیں چکر لگا رہا تھا۔

اپنی اپنی اوقات

وہ ایک سکول میں چپڑاسی ہے۔ سکول میں امتحان ہو رہے ہیں۔ امتحان دینے والے طلبہ کو پانی پلانا اس کی ڈیوٹی ہے۔ ابھی پرچہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میں اور وہ کھڑے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ صاف سفید کپڑوں والا کسی اچھے گھر کا ایک لڑکا اس کے پاس آیا اور اسے الگ لے جا کر اس کی ہتھیلی پر کچھ رکھ کے بولا۔ "لے، اب تیرا ہی آسرا ہے۔ کتنے کو تو تو جانتا ہے نا! بس، نگاہ رکھنا، کہیں..." وہ چلا گیا۔

"یہ کیا ہے یار؟" میں نے اس کی مٹھی کھولی۔

"ارے..... یہ کیا؟ بس یہی..." اس کی ہتھیلی پر صرف پچاس روپے دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔ "بس پچاس روپے، ابے کم سے کم سو دو سو تو مارتا۔ حساب کا پرچہ ہے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنی اپنی قسمت ہے بھائی! اندر والے نگران پانچ سات سو روپے میں خوش ہو جاتے ہیں۔ ہمیں پانچ سات سو کون دے گا؟" اس نے رونی صورت بنائی۔

کیسے دن

"کیا ہوا ہے؟ تو نے سکوٹر ادھر کیوں موڑ لیا؟ بس اڈا تو چوک کے دوسری طرف ہے"۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ظفر نے مجھ سے کہا۔

"تو نے آگے آگے چلتی ہوئی پولیس جیپ نہیں دیکھی؟"

"دیکھی تو ہے"۔

"پیچھے کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہوا سپاہی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیپ نے پہلا موڑ کاٹا اور پھر میرے موڑ کاٹتے ہی سپاہی نے بندوق سیدھی کر لی۔ جیپ نے اگلا موڑ کاٹا۔ ہمیں بھی اسی طرف جانا تھا۔ سپاہی نے

بندوق کے گھوڑے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے فوراً اڈے والے موڑ کے بجائے یہ موڑ کاٹ لیا"۔

"اچھا، یہ بات ہے تو تُو نے بہت ہوشیاری کی ورنہ پتہ نہیں، کیا ہو جاتا؟"

"اف، کیسے دن آ گئے ہیں"۔ میں نے ٹنکو کو سکوٹر دیا اور کہا۔ "لے، اب یہ لے جا لیکن آہستہ آہستہ چلانا۔ کسی ناکے پر رکنے کو کہا جائے تو فوراً بریک مارنا۔ ذرا بھی دیر کی تو پتہ نہیں، کیا ہو جائے۔ میں شام تک لوٹ آؤں گا۔ اندھیرا نہ کرنا۔ ماں بہت گھبرائے گی"۔

آج 'پنجاب بند' کا اعلان ہوا تھا۔ دن کے وقت بسوں کے ساتھ حفاظتی دستے چل رہے تھے۔ کھڑکی سے لگ کر دو پولیس والے بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور دو پولیس والے پچھلی سیٹ پر۔ بس میں کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ تھیلا ٹانگوں پر رکھ کے میں بس کے بیچوں بیچ خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

بس چلی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا پولیس والا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ تھوڑا چوکنا ہو گیا۔ اگلے سٹاپ پر ساتھ والی سیٹ خالی ہو گئی۔ میں نے اپنا تھیلا اس پر رکھ دیا اور چور نظروں سے دیکھا۔ پولیس والا اب بھی میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہت ڈر لگا چناں چہ میں ایک دم اٹھ گیا۔ پولیس والا بھی بندوق تانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے دو تین قدم تیزی سے اس کی طرف بڑھائے اور اس کے بازو کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا لیکن اس کا ہاتھ اب بھی بندوق کی لبلبی پر تھا۔ میں نے کہا۔ "آج بہت گرمی ہے"۔

وہ کچھ نہیں بولا لیکن اس نے میرے سینے کی طرف غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں میرے تھیلے پر جا کے ٹھہر گئیں۔ میں نے کیلوں کا پورا گچھا نکال لیا۔ تھیلا خالی ہو گیا۔ پولیس والے نے بندوق پاس ہی ایک طرف رکھ دی۔

"کیلا کھاؤ گے؟" میں نے اسے کیلا دیا۔

اس نے اطمینان سے کیلا لے لیا اور ایک لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "کیسے دن آ گئے ہیں"۔

میں اطمینان سے کیلا کھانے لگا۔ باہر کھیتوں کی ہریالی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

پھٹے کاغذ کی کہانی

ہیڈ ماسٹر صاحب نے چھٹی جماعت کے لڑکے کرمے کے باپ کو سکول بلوایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر بہت اداس اور حیران تھا کہ لوگ اس حد تک جھوٹ بول سکتے ہیں۔

"تمہی دھرم سنگھ ہو؟"

"جی صاحب!" دھرم سنگھ نے اتنی دھیمی اور سہمی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی قبر کی مٹی کے نیچے سے بول رہا ہو۔

ہیڈ ماسٹر نے دھرم سنگھ کی خستہ حالی غور سے دیکھی پھر فیس معاف کرنے کی درخواست پر نظر جما دی اور اپنے آپ سے بولا۔ "ٹھیک ہی تو لکھا ہے"۔

"میں کسان ہوں، دو بیگھے زمین ہے، اس میں ہوتا کچھ نہیں۔ پہلے میں نے اپنے آپ کو نیچ ذات کا لکھوانے کے بارے میں سوچا تھا پھر سوچا، جھوٹ کیوں بولوں؟" پگڑی سے آنسو پونچھنے لگا۔ "سوچتا ہوں، کسی نہ کسی طرح کرما پڑھ جائے، کچھ بن جائے۔ میں تو..." اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "آپ سوچتے ہوں گے، میں نے جھوٹ بولا ہے لیکن سچ کہتا ہوں، میں مر چکا ہوں۔ میں اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی تک نہیں دے سکتا، میں مر چکا ہوں"۔

"ایسا نہیں سوچتے، دل مضبوط رکھ کر جیتے ہیں۔ میں نے کرمے کی پوری فیس معاف کرنے کے لئے نوٹ لکھ دیا ہے۔ آئندہ بھی یہ جب تک میرے پاس رہے گا، اس کی فیس معاف رہے گی"۔ اس نے کاغذ لوٹاتے ہوئے کہا۔ "لو، یہ درخواست پھینک دو"۔

دھرم سنگھ نے درخواست کے دو ٹکڑے کئے اور میز کے نیچے "مجھے استعمال کرو"۔ والے ڈبے میں پھینک دیئے پھر باہر نکل آیا۔

"ایک ٹکڑا ڈبے میں گرنے کے بجائے فرش پر گرا تھا، اس پر لکھے ہوئے لفظ کچھ اس طرح تھے۔

...... دو بیگھے زمین ہے۔

باپ مر گیا ہے۔

معاف کی جائے۔

آپ کا تابع دار

کرم سنگھ 6-بی

نیچی جگہ، پانی

تھوڑی سی بارش ہوتی اور پانی پھسلتا ہوا نشیب میں جمع ہو جاتا۔ مکھیاں اور مچھر گندگی پھیلاتے۔

"ایمرجنسی راج میں ہم سے فیصلوں میں تو کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ بڑے عہدوں پر تعینات افسروں نے اچھے فیصلے لاگو کرنے میں شاید ہی غلطیاں کی ہوں"۔ ایمرجنسی کی وجہ سے ٹوٹ جانے والی حکومت کے ایک اہم عہدے دار کا خیال تھا۔

"چوکی دار ذمے دار ہے، گھونٹ لگا کے کہیں پڑ گیا ہوگا۔ پیچھے سے سارا گودام خالی ہو گیا"۔ سرکاری چینی گودام سے چوری ہو جانے پر حفاظتی افسر کا بیان تھا۔

"متعلقہ فائل گم ہوگئی ہے تو متعلقہ کلرک سے پوچھو، اسی کی بے پروائی سے گم ہوئی ہے"۔ محکمے کا سربراہ کہہ رہا تھا۔ لاکھوں روپے کا گھپلا پکڑے جانے کے بعد متعلقہ فائل گم ہوگئی تھی۔

"متعلقہ مل میں ملاوٹ، ہو سکتا ہے رات کی شفٹ میں کام کرنے والے کسی مزدور سے کوتاہی ہوگئی ہو اور مل کے باہر پڑے ہوئے کنکر پتھر اور مٹی مسالے میں مل گئی ہو۔ لکھو کے مزدور کو ضرور سزا ملنی چاہئے، اسی کی غفلت سے یہ گڑبڑ ہوئی"۔ مالک مالک پولیس سے کہہ رہا تھا۔

...... مالی ذمے دار ہے۔

...... نچلا ہی ذمے دار ہے۔

...... نچلی ذمے دار ہے۔

...... مزدور ذمے دار ہے۔

بارش ہو رہی ہے۔ نیچے گندے تالاب میں اب اور پانی جمع نہیں ہو سکتا۔ پانی کا دریا منہ زور ہو رہا ہے، کنارے کھڑی ہوئی مضبوط عمارتیں ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھے رہی ہیں۔

سربراہ

کوٹھری سے تیکھی برچھی کی طرح روشنی کی لکیر ایک جھری سے باہر آ رہی تھی۔ بیٹھک کے بڑے تختوں کی دراز سے بھی روشنی سفید لہو کی دھار کی طرح باہر جا رہی تھی۔

آنگن کے بیچ میں ایک پرانا اور گھنا نیم تھا۔ نیم کے نیچے وہ ماضی کے ٹوٹے ہوئے دھاگے جوڑ جوڑ کر کوئی کہانی بُن رہا تھا۔

کچے پرانے دھاگے۔

کالی اندھیری رات، ٹپ ٹپ بارش کی ننھی ننھی بوندیں، کبھی بادل گرجتے، کبھی بجلی چمکتی۔

اُس کے چار بیٹے تھے۔ اسے ان کی شادی کی فکر تھی، پچھواڑے دو کوٹھریاں تھیں، آگے ایک کمرہ تھا اور باہری دروازے کے نزدیک ایک بیٹھک تھی۔

بڑے لڑکے کا بیاہ ہوا تو پچھلی کوٹھری اس کے لئے اور اس کی گھر والی کے لئے مخصوص ہوگئی۔

دوسرے لڑکے کا بیاہ ہوا تو پیچھے کی دوسری کوٹھری میں باپ کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب اس کوٹھری میں دوسرا لڑکا اور اس کی بیوی رہتے تھے۔

تیسرے لڑکے کو شادی کے بعد آگے والا کمرہ مل گیا۔

اب اسے چوتھے بیٹے کی فکر تھی۔ اس آخری لڑکے کے لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ کھیتی باڑی میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ اگر یہ کنوارا رہ گیا تو لوگ کیا کہیں گے۔

آخر ایک دن چوتھے لڑکے کی بھی شادی ہو گئی۔ اس نے جہیز کا سامان بیٹھک میں سجا دیا۔

بوڑھا باپ نیم کے نیچے آ گیا۔ بالکل اکیلا اور ہر فکر سے آزاد۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ نیم کاٹ کر وہ اپنے لئے ایک چھوٹا سا کچا کوٹھا کیوں نہ ڈال لے لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے چاروں بیٹے کوٹھا کیسے بانٹیں گے؟ نیم کا درخت تو چلو کاٹ کر بانٹ بھی لیں گے۔

ایک بار وہ اٹھ کر مسجد کی طرف جانے لگا لیکن پھر لوٹ آیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اتنے بڑے خاندان کا مالک اور۔

اب وہ گھیس کی بکل مارے نیم کے نیچے بیٹھا تھا۔ ٹپ، ٹپ۔ آہستہ آہستہ بارش ہو رہی تھی اور اس کے کپڑے ایک ایک کر کے بھیگتے جا رہے تھے۔

پتھر لوگ

ٹھنڈی اندھیری رات، نہر کا کنارہ۔ جیپ رکی۔

"ہاں، یہ جگہ ٹھیک ہے۔ ٹانگ کھینچ کر نیچے پھینکو اور چلو۔ سردی کے مارے جسم کپکپا رہا ہے"۔

"یہ آج کی آج بھتی رہتی تو ایک رات اور گرم ہو جاتی"۔

"کہتی تھی، مجھے کیا پتہ، پردھان صاحب کی اچکن کی جیب سے پچاس روپے کس نے چوری کئے۔ کوٹھی میں روز شراب کی محفلیں جمتی ہیں...... سالی نکلی بڑی پکی، مانی ہی نہیں"۔

"ہم نے کون سا اسے مار اچھا تھا، پیار ہی تو کیا تھا، ہی ہی ہی"۔

☆☆☆

ملگجا اندھیرا۔

جاگیردار کا ٹرک رکا۔

جاگیردار کا لڑکا نیچے اترا۔ ایک طرف بیٹھے ہوئے دونوں ملازم (بھی) اترے۔

"کون ہے یہ؟ بے ہوش پڑی ہے برہنہ"۔

"یہ تو دلاری لگتی ہے۔ بڑے سرکار کے گھر کا کام کرتی ہے، بے چاری بیوہ"۔

"چلو، او ئے چلو۔ ہمیں کیا، کوئی بھی ہو"۔

"دلاری ہی ہے"۔ ملازم نے اس کی شلوار اٹھا کے اس کے اوپر ڈال دی تاکہ برہنگی چھپ سکے۔

☆☆☆

کہر بھری صبح۔ ہر طرف دھند۔ کار رکی۔ وہ باہر آئے۔

"اتنی سردی میں یہ یہاں کیوں پڑی ہے؟"

"دانت دیکھ، جیسے ہنسی کے کھلے ہوئے دانتے"۔

"یہ تو مری ہوئی لگتی ہیں سردی سے مرگئی ہوگی"۔

"رات ہمارے پاس آجاتی، ساری رات گرمی میں رہتی"۔

"شاید مل رہی ہے"۔

"چل یار چلیں، نہیں تو پولیس خواہ مخواہ تنگ کرے گی"۔

ہرا چشمہ

گئودان کی اپیل سن کر ایک سیٹھ نے گائے خیرات کی۔ جس شخص کو خیرات کی گائے ملی، وہ شہر کی گندی سی بستی میں رہنے والا ایک غریب مزدور تھا۔ اس کی کون سی زمین تھی جہاں ہری ہری گھاس اُگتی۔ بستی کے آس پاس ہریالی کا نام ونشان نہ تھا۔ خیرات میں اُسے گائے ملی تھی، گھاس نہیں۔ اس نے گائے کو کھلانے کے لئے سوکھی گھاس ڈالی۔ امیر کی گائے نے سوکھی گھاس دیکھ کر منہ پھیر لیا، وہ کسی حالت میں سوکھی گھاس کھانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ آدمی نے اس کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیر کے منت کی۔ "اے گائے ماتو تو گئو ماتا ہے۔ میں تیری پوجا کروں گا"۔

گائے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ دو دن سے بھوک ہڑتال پر ڈٹی ہوئی تھی۔ مزدور ڈر رہا تھا کہ گائے کو کچھ ہوگیا تو گائے کی موت کا پاپ اس کے سر ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ ہو رہا تھا۔

اسے اس طرح پریشان اور گائے کی منت سماجت کرتے دیکھ کر کسی نے اسے گائے کی آنکھوں پر ہرا چشمہ باندھنے کا مشورہ دیا۔ مزدور نے ایسا ہی کیا۔ ہری پنی کی عینک بنا کر اس نے گائے کی آنکھوں لگا دی۔ اب گائے کے سامنے سوکھی گھاس کی جگہ ہری گھاس تھی۔ وہ خوش ہو گئی۔

مزدور اب خوش تھا لیکن اس کا پڑھا لکھا بے روزگار بیٹا اداس تھا۔ مزدور نے اس سے اداسی کا سبب پوچھا، وہ روہانسا سا ہو کر بولا۔ "بابو! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم عوام گائیں ہیں۔ لیڈر لوگ ہماری آنکھوں پر امیدوں کا ہرا چشمہ لگا کر ہم سے ووٹ لے جاتے ہیں اور ہم سوکھے کو ہریالی سمجھ لیتے ہیں"۔

روبوٹ

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک سائنسدان تھا، دوسرا تاریخ کا استاد۔ سائنسدان کہہ رہا تھا۔ "دیکھو، سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ جانور کے دماغ میں مشین فٹ کر کے اس کا ریموٹ ہاتھ میں لے لو پھر جیسے چاہو جانور کو نچاؤ"۔ اپنی بات ثابت کرنے کے لئے وہ ایک گدھا لے آیا۔ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کے وہ جو جو حکم دیتا رہا، گدھا وہی کرتا رہا۔ سائنس داں کہتا۔ "پونچھ ہلا"۔ گدھا پونچھ ہلانے لگتا۔ وہ کہتا۔ "سر" گدھا سر ہلانے لگتا۔ اسی طرح وہ اس کی ہدایت کے

مطابق دولتیاں مارتا، ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا اور لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ سائنسدان اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔

تاریخ کا استاد گدھے کے کرتب دیکھ کے چپ تھا۔ اس کے منہ سے تعریف کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ سائنسدان کو غصہ آ گیا۔ اس نے جھنجلا کے خاموشی کی وجہ پوچھی۔ تاریخ کا استاد کہنے لگا۔ ''گدھے کے دماغ میں مشین فٹ کر دینا کون سی بڑی بات ہے۔ ہزاروں برس سے آدمی کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں''۔

وہ دونوں سڑک پر چلنے لگے۔ سڑک پر ایک فوجی انڈوں کی ٹرے اٹھائے ہوئے جا رہا تھا۔ تاریخ کے استاد نے اس کے پیچھے جا کر یکایک اٹینشن کہا۔ اٹینشن کا لفظ سنتے ہی فوجی یہ بھول گیا کہ وہ سڑک پر انڈے کی ٹرے لے جا رہا ہے۔ وہ فوراً اٹینشن ہو گیا اور انڈے زمین پر گر کے ٹوٹ گئے۔

تاریخ کا استاد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''دیکھا۔ بالکل اسی طرح مذہب کا، سیاست کا، روایت کا، رواج کا ریموٹ کنٹرول انسانوں کو روبوٹ بنا دیتا ہے۔ میرے دوست تم نے تو صرف ایک گدھا نچایا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہٹلر کے ہاتھ میں کون سا ریموٹ کنٹرول تھا جس سے اس نے کروڑوں بے گناہ انسان مروا دیے تھے؟''

رشتہ

مخبر نے جگیرے کو بتایا۔ ''آج روپالے میں چوری ہو سکتی ہے''۔

''کیسے؟'' جگیرے چور کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔

''گھر والا گھر میں نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔ جگیرے نے ترشی ہوئی مونچھوں پر بل دیا۔

مرغ کی بانگ سے پہلے ہی جگیرا مخبر کے بتائے

ہوئے گھر میں پہنچ گیا۔ وہ صندوق کے پاس کھڑا تھا۔ تیجو کو شک ہوا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر بلی کی طرح دبے پاؤں سوئچ کے قریب پہنچی۔ بلب جلا تو بیچ بیچ سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ "چور" آواز جیسے تیجو کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

تیجو اور جگیرے نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ جگیرے کی آنکھیں ایک دم سے جھک گئیں۔ تیجو نے پوچھا۔ "اوئے جگیرے! تجھے بہن ہی کا گھر ملا تھا چوری کرنے کو؟"

"میں نے سنا تو تھا کہ اپنے گاؤں کی کوئی لڑکی یہاں پاسے میں بیاہی ہوئی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا، وہ اس گھر میں ہو گی۔"

جگیرا جانے لگا۔

"اب کدھر؟" تیجو نے اس کی بانہہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ جگیرے نے نظریں چرا لیں۔ "بیٹھ جا۔ چائے پی کر جانا۔ میں چولہے پہ چائے کا پانی رکھتی ہوں۔"

جگیرا، تیجو کی تواضع پر حیران ہوتا ہوا، ایک بچے کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چائے آنے تک وہ پچھتاتا رہا۔

چائے پی کر چلتے وقت جگیرے نے انٹی سے سو کا نوٹ نکالا اور تیجو کے ہاتھ میں زبردستی پکڑا دیا۔

"اوئے کوڑھی! یہ کیا؟" تیجو نے مڑے تڑے نوٹ کی طرف دیکھا۔

"یہ بھائی کا فرض ہے بہن!" جگیرا تیزی سے دہلیز پھلانگ گیا۔

پورا گاؤں خاموش تھا۔ کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔

ننگے لوگوں کی فکر

دو دہشت گردوں نے پہلا قتل موٹر سائیکل پر کیا۔ حکومت نے موٹر سائیکل پر دو آدمی ایک ساتھ بیٹھنے پر پابندی لگا دی۔

دوسری بار قاتل سائیکل پر بھاگ نکلے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سائیکل پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ لوگوں نے اپنی سائیکلیں چھپا کر رکھ دیں۔

تیسرا قتل ہوا۔ قاتل ہری قمیص میں تھا۔ پولیس نے چوک میں کھڑے ہو کر ہری قمیص والے لوگ پکڑنے شروع کر دیے۔

چوتھے قتل کے وقت قاتل صرف نیکر اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ حکومت نے نیکر اور بنیان والوں پر پابندی لگا دی۔ لوگوں نے بنیان پہننا ہی چھوڑ دیا۔

قاتل پکڑے نہیں جا سکے۔

ننگ دھڑنگ لوگوں کو فکر ستانے لگی کہ اگر دہشت گردوں نے آئندہ واردات ننگے ہو کر کی تو ہم پولیس کی مار سے بچنے کے لیے لباس کہاں سے لائیں گے؟

صدمہ

ادھیڑ عمر کا سیدھا سادا سنتو بے ناپ کے بوٹ پہنے ہوئے پانی کی بالٹی اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے اسے ہوشیار کیا۔ "دھیان سے چڑھنا۔ سیڑھیوں میں کئی جگہ سے اینٹیں نکلی ہوئی ہیں، گر نہ پڑنا۔"

"فکر مت کرو جی۔ میں پچاس کلو آٹے کی بوری اٹھا کر بھی سیڑھیوں سے نہیں گرتا۔"

واقعی دس بالٹیاں پانی ڈھوتے ہوئے بھی سنتو کا پیر نہیں پھسلا۔

دو روپے کا نوٹ اور چائے کا کپ سنتو کو تھما کے میری بیوی نے کہا۔ "روز آ کر پانی بھر دیا کر۔"

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سنتو بہت خوش تھا۔

"آج کل روز بیس روپے بن جاتے ہیں پانی اوپر پہنچانے کے۔" کہتے ہیں، ابھی نہر میں کم سے کم ایک مہینے تک پانی نہیں آئے گا، اپنی تو موج ہو گی۔"

اسی دن شہر میں پانی آ گیا اور نل میں بھی۔

دوسرے دن سیڑھیاں چڑھ کر سنتو نے پانی کے لئے بالٹی مانگی تو میری بیوی نے کہا۔ ''اب ضرورت نہیں ہے رات کو اوپر کی ٹونٹی میں پانی آ گیا تھا''۔

''شہر میں پانی آ گیا؟'' سنتو نے آہ بھری اور لوٹنے کے لئے سیڑھیاں اترنے لگا۔

اچانک کسی کے سیڑھیوں پر گرنے کی آواز آئی۔ میں نے دوڑ کر دیکھا۔ سنتو آنگن میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگ گئی تھی۔ ماتھا پکڑتے ہوئے وہ بولا۔ ''کل بالٹی اٹھا کے نہیں گرا اور آج خالی ہاتھ گر پڑا''۔

میں نے سوچا، اسے کل نہیں، آج احتیاط کی ضرورت تھی۔

بٹوارا

گھر کا ماحول کشیدہ رہنے لگا تو دونوں بھائیوں نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سامان کا بٹوارا کرتے وقت گھر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر اپنا حق جتانے کے لئے دونوں بھائیوں نے طرح طرح کی دلیلیں دیں۔ کسی چیز سے ان کا بچپن کا تعلق تھا تو کوئی چیز چھوٹے بڑے ہونے کے باعث ان کی بنتی تھی۔ سوئی سے لے کر فریج تک کے لئے ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ جیسے تیسے سب کچھ بٹ گیا۔ بس بوڑھے ماں باپ رہ گئے۔ ان پر کسی نے حق نہیں جتایا۔ کسی نے نہیں کہا کہ ان سے اس کا بچپن کا رشتہ ہے۔

بڑے نے ترکیب بتائی۔ ''ایسا کر، انہیں پہلے چھ مہینے تو رکھ لے۔ بعد کے چھ مہینے میں رکھ لوں گا''۔

چھوٹے کی بیوی نے کان میں عقل انڈیلی۔ ''چھ مہینے میں تو ہم ماں کی بیماری کا علاج کرتے کرتے کنگال ہو جائیں گے۔ اگر بڑھیا چل بسی تو ہزار دو ہزار اور لگ جائیں گے۔ ان سے کہو، پہلے چھ مہینے یہی رکھ لیں ماں کو''۔

بات نہ بنی تو چھوٹے نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم انہیں آپس میں بانٹ لیں۔ ماں کو تو لے لے، بابو جی میرے پاس رہ جائیں گے''۔

''ماں کو تو تو ہی رکھ۔ ماں کو چھوٹے بچے سے زیادہ پیار ہوتا ہے''۔ بڑے کی بیوی نے تنک کر کہا۔

دنیا دکھاوے کو کچھ تو کرنا ہی تھا۔ آخر وہ دونوں قرعے کے ذریعے ماں باپ کو بانٹنے پر تیار ہو گیا۔ کاغذ کے دو ٹکڑے لئے گئے، ایک پر ماں، دوسرے پر باپ لکھا گیا۔ دونوں ٹکڑے تہہ کر کے میز پر پھینکے گئے اور ایک بچے سے پرچی اٹھانے کے لئے کہا گیا۔

بچہ پرچی اٹھا رہا تھا۔ دونوں بھائی اور ان کی بیویاں آنکھیں بند کر کے دعا کر رہے تھے۔ ''ہے بھگوان ہماری باپ والی پرچی نکالنا''۔

ایک اور ڈر کا جنم

مریل سے کلرک نے جیب سے مہینے بھر کی تنخواہ نکال کے چارپائی پر رکھی اور سرہانے کے نیچے سے قرض داروں کی فہرست نکالی، جمع تفریق کے بعد اس کے پاس صرف پچاس روپے بچے تھے اور پورے انتیس دن آگے کھڑے تھے۔ کمرے میں وہ اکیلا تھا، بچوں کی ضرورتیں اور بیوی کی حسرتیں فلم کی ریل کی طرح اس کی آنکھوں سے گزرنے لگیں۔ بیوی کی مطلوبہ چیزوں پر لکیر پھیرتے ہوئے اسے تھوڑی تکلیف ہوئی لیکن اسے احساس تھا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے۔

پیر کی ادھ گھسی چپلوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر منی کے ٹوٹے ہوئے جوتے نے ایک جھٹکے سے اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ بیوی اندر آ گئی اور پچاس کا نوٹ اٹھا کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتہ، یہ تو میں نہیں دوں گی''۔

''میری بات تو سنو''۔

"بالکل نہیں"۔

"سردیاں شروع ہوگئی ہیں اور منی ....."

"منی کے جوتے سے زیادہ ضروری آپ کی دوائی ہے"۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے گلے سے اٹھتی ہوئی کھانسی جبراً روک لی تاکہ اسے کھانستے دیکھ کر بیوی ڈاکٹر کو بلانے نہ چلی جائے۔

ہم دردی

میرا اکلوتا کوٹ بس کی کھڑکی سے اٹک کر پھٹ گیا۔ میرے پڑوسی دوست شری کانت ڈرائی کلینرز کی دکان پر ایک پٹھان رفوگر بیٹھتا ہے۔ میں نے سوچا اسے کوٹ رفو کے لیے دیتا جاؤں، یہ میلا بھی کافی ہو چکا ہے، ڈرائی کلین بھی کروالوں گا۔

میں نے پٹھان کو سلام کر کے کوٹ رفو کے لیے دے دیا اور پانچ روپے مزدوری بھی دے دی جو اس نے مانگی تھی۔

دوسرے دن میں کوٹ لینے گیا۔ شری کانت بڑی محبت سے ملا۔ اس نے ہم دردی سے پوچھا۔ "پٹھان نے رفو کے کتنے پیسے لیے؟"

"پانچ روپے"۔ میں نے سرسری جواب دیا۔

"کیا ضرورت تھی پیسے دینے کی۔ گھر ہی کا تو کام تھا۔ وہ ہماری دکان پر بیٹھتا ہے مگر کیا ہم کوئی کرایہ لیتے ہیں اس سے؟" اس نے پٹھان کو آواز دی۔ "رفوگر! اے رفوگر! تم اتنی مدت سے یہاں بیٹھتے ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ صاحب ہمارے گھر کے آدمی ہیں۔ ان سے بھی پانچ روپے لے لئے؟ چلو پیسے واپس کرو ان کے"۔

میں شری کانت کا بے حد ممنون ہوا۔ چلتے وقت میں نے اس سے تکلفاً پوچھا۔ "ڈرائی کلیننگ کے کتنے پیسے؟"

"دس روپے"۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

آئینہ

صبح سے میں اپنی نئی کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کرداروں کی الجھی ہوئی ڈور سلجھاتے میں، میں خود الجھ کر رہ گیا۔ کہانی کا اختتام سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بارہ بج گئے تھے لیکن میں لکھ لکھ کر صفحات پھاڑ رہا تھا۔

"آپ نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔ مجھے امی کے گھر جانا تھا"۔ بیوی نے ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"بیس بار کہا ہے، جب میں لکھ رہا ہوں تو پریشان مت کیا کرو لیکن تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا"۔ میں نے غصے سے اسے جھڑک دیا۔

وہ کچھ نہیں بولی لیکن مایوسی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔ میں پھر پلاٹ میں جوڑ توڑ کے لئے کسی نئے نکتے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"پاپا! آج چھٹی ہے۔ آپ نے ہمیں روز گارڈن لے جانے کا وعدہ کیا تھا"۔ میری پانچ سالہ بیٹی نے پیچھے سے آ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اپنے خیالات کا تسلسل ایک بار پھر ٹوٹ جانے پر میں نے بیٹی کو دور دھکیل دیا اور زور سے بیوی کو مخاطب کیا۔ "انہیں سنبھال کر رکھا کرو۔ سارے نمبر کا دماغ پتہ نہیں کیوں، کام نہیں کرتا"۔

بیٹی اونچی آواز سے رونے لگی۔ بیوی نے اسے اٹھایا اور سرد لہجے میں بولی۔ "آپ گھر کے جیتے جاگتے کرداروں کے ساتھ تو انصاف کر نہیں سکتے، کہانی کے فرضی کرداروں کو آپ سے کیا آس ہو سکتی ہے؟"

میرے ہاتھ سے قلم گر پڑا، میں نے خاموش نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آج تک میں اپنے کہانی نویس ہونے کا بھرم ہی پال رہا ہوں۔

مکافاتِ عمل

سمندر میں پیاسا

مکہ میں موجودگی کے باوجود اللہ نے اسے حج کی سعادت سے محروم رکھا

عبدالغنی فاروق

حافظ افتخار میرا ایم اے کا کلاس فیلو تھا۔ ستمبر 1964ء سے اگست 1966ء تک ہم دو سال یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے طالب علم کی حیثیت سے ایک ہی کلاس میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہ حافظِ قرآن تھا اور ایک مکمل عالمِ دین کا پیکر اختیار کیے ہوئے تھا۔ خوبصورت چہرے پر گھنی متشرع داڑھی، سر پر جناح کیپ، اکثر شیروانی پہنے رکھتا۔ اللہ نے اسے ایک دلکش سراپا عطا کیا ہوا تھا لیکن افسوس، حافظ وقار تو اذان سے بالکل محروم تھا۔ اس میں ذہانت اور حکمت کی شدید کمی تھی۔ اس کا مطالعہ بھی یک طرفہ تھا اور وہ غور و فکر کا عادی

بھی نہیں تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ بچپن میں ایک مخصوص مذہبی فضا میں رہنے بسنے کی وجہ سے اس کے دماغ کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھی اور اس میں ردو بدل کی گنجائش پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔

مثال کے طور پر حافظ افتخار مختلف نیک نام اور بے حد روشن کردار کی حامل شخصیات سے عناد و اسطے کا بغض رکھتا تھا جبکہ منفی حیثیت کے حامل افراد سے گہری عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ مولانا مودودی پر بے رحمی سے تنقید کرتا جبکہ غلام غوث ہزاروی کی تعریف میں رطب اللسان رہتا۔ سید قطب کو برا بھلا کہتا اور جمال عبدالناصر کو عالم اسلام کا عظیم ہیرو قرار دیتا۔ یہ معاملہ یہاں تک پھر بھی قابل برداشت تھا لیکن اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ سیدنا علی مرتضیٰؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی سان پر چڑھائے رکھتا اور ایک فرقے کی ضد میں ان انتہائی محترم شخصیات کے خلاف دشنام طرازی سے بھی دریغ نہ کرتا جبکہ امیر معاویہؓ اور یزید کی خوب خوب تعریف کرتا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ حافظ افتخار عجیب متضاد خصوصیات کا حامل تھا اور چھچھوراپن تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بار ہماری کلاس کے چند لڑکوں نے ایک طرحی مزاحیہ مشاعرے کا اہتمام کیا۔ قافیہ ردیف تھا: طرح دار مونچھیں، یار مار مونچھیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس مشاعرے میں سراسر غیر سنجیدگی بلکہ پھکڑ پن غالب تھا لیکن حافظ اپنی داڑھی اور ٹوپی سمیت اس میں کود پڑا اور اس نے بھی مونچھوں کی مدح میں ایک "غزل" کہہ ڈالی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے شعروں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ وہ شاعر تھا ہی نہیں بلکہ شعر پڑھتا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ بے چارے شاعر کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہا ہے۔ یعنی عمداً اس کی روح کو اذیت دے رہا ہے۔ سننے والوں کا ذوق الگ زخمی ہوتا تھا۔

چونکہ حافظ افتخار تخلص بھی نہیں تھا اور اسے اردو شعر و ادب سے قلبی مناسبت بھی نہیں تھی، نہ وہ لکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس لئے ایم اے اردو کے امتحان میں بہت کم نمبر لے کر کامیاب ہوسکا۔ چنانچہ پبلک سروس کمیشن نے جلد ہی یعنی جولائی 1967ء میں اردو کے لیکچررز کی اسامیوں کا اعلان کیا اور درخواستیں طلب کیں تو مطلوبہ شرائط پوری نہ کرنے کی وجہ سے حافظ درخواست ہی جمع نہ کرا سکا۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج سے فارغ ہونے کے بعد حافظ افتخار سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ یوں بھی اس سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن 1968ء کی گرمیوں کی بات ہے، میں ایک ماہنامہ میں کام کر رہا تھا۔ میں ایک روز دوپہر کو کھانے اور نماز کے لئے باہر نکلا تو سامنے سے حافظ کو آتے ہوئے دیکھا۔ چمن آباد کے نواح میں رسول پارک ہے اور وہیں حافظ کا گھر تھا۔ میں سمجھا کہ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے لیکن خلاف معمول مجھے دیکھ کر اس نے کسی خوشی یا گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ یوں لگا کہ وہ اس ملاقات سے کچھ پریشان ہو گیا ہے۔

حافظ افتخار قریب آیا۔ اس نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ آج کل بے روزگار ہوں، ایم اے اسلامیات کا امتحان دے رکھا ہے اور نوکری کی تلاش میں ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بغل میں تین چار کتابیں تھیں۔ پوچھا یہ کتابیں کیسی ہیں تو حافظ پر پریشانی سے زیادہ ندامت بلکہ خوف کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہو گیا..... اور اس کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں آ گئی جب میں نے ہاتھ بڑھا کر کتابیں اس کی بغل سے اچک لیں۔ یہ کتابیں مولانا مودودی کی تھیں: اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی وغیرہ۔ میں نے چونک کر حافظ کی طرف دیکھا جو شدید

شرمندگی کے احساس سے پانی پانی ہو رہا تھا۔

"حافظ صاحب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مودودی کے تو آپ سخت مخالف ہیں، ان کی کتابیں پڑھ کر آپ کا دھرم بھرشٹ تو نہیں ہو جائے گا"۔

"اصل میں یار وہ پنجاب اسمبلی میں ٹرانسلیٹرز کی کچھ اسامیاں نکلی ہیں۔ میں نے وہ ٹیسٹ کوالیفائی کر لیا ہے۔ اب انٹرویو ہے اور اس کے لئے ان کتابوں کو پڑھے بغیر چارہ نہیں تھا"۔

"تو یوں کہیئے نا کہ مودودی کا جادو آپ کے سر پر چڑھ کر بولا ہے۔ ہے نا یہی بات لیکن یہ بات آپ کے عقائد اور نظریات کے خلاف نہیں ہے؟" میں نے تبصرہ کیا اور حافظ خلاف عادت خاموش رہا اور سر جھکا کر اپنے راستے پر چل دیا۔

بعد میں سنا کہ حافظ کو پنجاب اسمبلی میں مترجم کی نوکری مل گئی اور جب اس نے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کر لیا تو اسے اسلامی نظریاتی کونسل میں ملازمت مل گئی اور وہ 1973ء میں لاہور سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔

1985ء یا 1986ء میں اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میں مولانا محمد متین ہاشمی صاحب کو ملنے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کے دفتر بھی گیا۔ وہیں حافظ افتخار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کیا ہو رہا ہے تو اس نے اپنے محکمے کے افسران بالا کے خلاف شکووں کا دفتر کھول دیا۔ حالانکہ اب وہ گزیٹڈ افسر تھا اور اٹھارویں گریڈ میں تھا لیکن اس کے منہ سے شکر کا ایک کلمہ بھی ادا نہ ہوا اور جب میں نے اسے نومسلموں کے بارے میں اپنی مقبول عام کتاب "ہم کیوں مسلمان ہوئے" ہدیۃً پیش کی تو اس نے سرسری نظر سے دیکھے بغیر اسے قریبی ریک میں پھینک دیا اور شکریے یا تحسین کا ایک لفظ بھی اس کے لبوں سے برآمد نہ ہوا۔ سچی بات ہے کہ میں اس کی بداخلاقی سے بڑا ہی بددل ہوا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔

اور پھر برسوں بیت گئے۔ بارہ تیرہ سال گزر گئے حافظ افتخار کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ اس سے رابطہ کرنے کی دل میں کوئی خواہش ہی نہیں رہی تھی لیکن دسمبر 1998ء میں ایک روز اخبار میں خبر پڑھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں انیسویں گریڈ کے ایک افسر حافظ افتخار اچانک ہارٹ اٹیک سے وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر 65 برس تھی۔

قدرتی طور پر مجھے حافظ کی موت کا بہت افسوس ہوا کہ اگرچہ کمزور ہی سہی، مگر اس سے ایک دیرینہ تعلق تو تھا۔ اب مجھے جستجو تھی کہ اس کی موت کن حالات میں واقع ہوئی اور اس کا ظاہری سبب کیا تھا؟ لیکن دور و نزدیک کوئی ایسا ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ جس سے میرے تجسس کی تسکین ہو۔ مگر حیرت انگیز طور پر میری ملاقات مجاہد لاہوری صاحب سے ہو گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس لئے کہ شاید اللہ کی مشیت یہ چاہتی تھی کہ حافظ کے بارے میں مکمل معلومات مجھ تک پہنچ جائیں اور یہ کہانی مکمل ہو کر تاریخ میں محفوظ ہو جائے اور خلق خدا کے لئے عبرت و موعظت کا ذریعہ بن جائے۔

مجاہد لاہوری صاحب علمی دنیا میں چنداں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ کم و بیش ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ معروف محقق و مترجم ہیں۔ چند سال پہلے اسلامی نظریاتی کونسل سے بیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے ہیں اور ربع صدی تک (1973ء سے 1998ء) انہیں حافظ افتخار کے رفیق کار کی حیثیت سے ایک ہی ادارے میں خدمات انجام دینے کا موقع میسر آیا ہے۔ مجاہد صاحب سے میرا تعارف 1970ء سے ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مجاہد لاہوری صاحب نے لاہور میں مستقل اقامت اختیار کر لی ہے۔ حافظ کی

وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک روز مجاہد صاحب سے ملاقات ہوگئی اور میں نے ان سے اس کی تفصیل معلوم کی، تو انہوں نے ایسے عجیب وغریب انکشاف کئے جو حافظ کے مزاج اور عمومی رویے کے حوالے سے چونکا دینے والے تو نہ تھے، مگر لرزا دینے والے ضرور تھے اور بڑے ہی عبرت ناک بھی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف حافظ کے ساتھ ایک ہی ادارے میں کام کرتے تھے اور دونوں کی رہائش گاہیں بھی ہمیشہ قریب قریب رہیں بلکہ خاصا عرصہ تو وہ حافظ کے بالکل پڑوس میں مقیم رہے۔ اس طرح وہ اس شخص کے اجتماعی اور ذاتی رویوں کے عینی شاہد ہیں۔ چنانچہ مجاہد صاحب کی زبانی اسلام آباد میں قیام کے دوران حافظ کی زندگی کی جو تصویر بنتی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

حافظ کا باپ اس کے بچپن ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ یہ دو بھائی تھے۔ حافظ بڑا تھا۔ ماں نے اپنے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے دونوں بیٹوں کی پرورش کی۔ اسے قرآن حفظ کرایا، سکول کی تعلیم دلائی لیکن کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے سارے اخراجات اس کے قریبی رشتہ داروں نے برداشت کئے جو خاصے امیر تھے اور کینال پارک گلبرگ میں رہتے تھے۔ بلکہ حافظ کے گھرانے کی بیشتر کفالت اسی خاندان نے کی۔

بدقسمتی سے اس مخیر خاندان کی اکلوتی بیٹی کی شادی کامیاب نہ ہوئی اور اسے طلاق ہوگئی۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ حافظ افتخار ان کی مطلقہ بیٹی سے شادی کر لے۔ حافظ کی والدہ نے اس خاندان کے دیرینہ احسانات کے پیش نظر اس تجویز سے اتفاق کیا لیکن حافظ اڑ گیا اور اس نے شدت سے انکار کیا کہ وہ خوبصورت ہے، صحت مند ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور گزیٹڈ افسر ہے پھر ایک مطلقہ لڑکی سے شادی کیوں کرے۔

''میں ایک سیکنڈ ہینڈ عورت کو بیوی کیوں بناؤں؟'' اس کا اصرار تھا اور یہ اصرار خاصی دیر جاری رہا لیکن جب لڑکی کے والدین نے لالچ دیا کہ وہ آٹھ دکانیں، دو قیمتی پلاٹ اور ایک مکان اپنی بیٹی کو جہیز میں دیں گے اور دو لاکھ روپے نقد بھی اسے عطا کریں گے تو حافظ مان گیا۔ شادی ہوگئی۔ وہ روزمرہ استعمال کے بھاری سامان کے ساتھ، جو قیمتی جائداد کے علاوہ اس کے سسرال نے مرحمت کیا تھا، اسلام آباد منتقل ہوگیا۔

لیکن اپنے محسن عزیزوں کی ساری داد و دہش کے باوجود حافظ افتخار نے کمال دغابازی اور سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے مختارنامے پر بیوی کے دستخط کرا لئے اور دکانیں، مکان اور پلاٹ اپنے نام منتقل کرا لئے۔ اس نے دو لاکھ کی رقم پر بھی قبضہ کر لیا اور پھر اپنی بیوی کو بہانے بنا بنا کر زدوکوب کرنے لگا۔ اسے طلاق کے طعنے دیتا، اس کی توہین وتذلیل کرتا اور باقاعدہ پٹائی کرتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ بیوی ننگے سر، ننگے پاؤں جان بچا کر باہر آ جاتی اور سرِ عام حافظ کو خوب صلواتیں سناتی۔ وہ چیخ چیخ کر بتاتی کہ حافظ نمک حرام ہے، یہ میرے والدین کے ٹکڑوں پر پلا ہے اور اب مجھ سے بدسلوکی کرتا ہے۔ جانوروں والا سلوک روا رکھتا ہے۔

اور پھر ایک روز حافظ نے اپنی بیوی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے والدین کے گھر لاہور آ گئی اور اس کا باپ اس صدمے سے جان ہار گیا۔ حافظ نے جلد ہی اسلام آباد میں ایک لیڈی لیکچرار سے نئی شادی رچالی۔

مجاہد لاہوری صاحب نے بتایا کہ حافظ کی پہلی بیوی کی والدہ کئی بار اسلام آباد آئی، وہ حافظ سے منتیں کرتی، ہاتھ جوڑتی کہ اگر وہ اس کی بیٹی کو بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا تو اسے طلاق دے دے لیکن حافظ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ طلاق نہیں دوں گا۔ کہا کرتا: ''میں اسے ترسا ترسا کر ماروں گا''۔ اس کی ماں بھی اسے بہت قائل

کرتی کہ یہ ظلم نہ کرو، خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن حافظ غرور اور ضد میں اندھا ہو گیا تھا، اس پر نہ ماں کی نہ ساس کی، کسی کی التجائیں اثر نہ کرتیں۔ آخر میں اس نے طلاق کی یہ شرط عائد کی کہ پہلی بیوی دکانوں سے، مکان سے، پلاٹوں سے اور دو لاکھ کی رقم سے دستبردار ہو جائے، وہ ان کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے لیکن بیوی کی والدہ نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا اور لاہور کی ایک عدالت میں خلع کا اور جائیداد کی واپسی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ اس کی وفات تک زندہ رہا۔

اللہ نے حافظ کو دوسری بیوی کے ہاتھوں خوب ذلیل کرایا۔ وہ انیسویں گریڈ میں تھا جب ایک روز اس نے رمضان میں کچھ دوستوں کو افطاری پر بلایا۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ جب میں نے دروازے پر گھنٹی دی تو حافظ نے اس حال میں دروازہ کھولا کہ اس نے گلے میں ایپرن جکن رکھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بیسن میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا کہ "حافظ صاحب یہ کیا؟ یہ آپ نے کیا حلیہ اختیار کر رکھا ہے؟" تو سر اٹھا کر، گردن پھلا کر کہنے لگا "میں نے ماڈرن دنیادار لوگوں کی طرح گھر میں آمریت نافذ نہیں کی ہوئی۔ ہمارے گھر میں مکمل جمہوریت ہے اور ہم نے اپنے اپنے کام بانٹ رکھے ہیں۔ پکوڑے میں بنا رہا ہوں، آٹا بھی گوندھتا ہوں اور برتن بھی صاف کرتا ہوں۔ باقی کام میری بیگم کرتی ہیں۔ اور میں حافظ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار اس کی پہلی بیوی باہر سڑک پر برہنہ سر اس کو کوس رہی تھی اور میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کے اندر لایا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج حافظ نے مجھے جوتے پالش کرنے کا حکم دیا اور میں نے مصروفیت کا عذر کیا تو اس نے مجھے گھونسوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا اور دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا"۔

حافظ غیر معمولی سنگ دل اور سفاک تھا۔ اس نے

ایک بار مجاہد صاحب کو بتایا۔ "مجھے ماں کو ملے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں ایک شادی تھی، میں بھی اس میں گیا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ میری ماں صرف مجھے ملنے کے لئے وہاں آئی ہوئی ہے لیکن میں نے اسے ملنا پسند نہ کیا اور بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک گیا"۔ اس کا سبب اس نے یہ بتایا کہ ایک تو میری ماں نے ایک سیکنڈ ہینڈ عورت کو میرے سر منڈھ دیا، دوسرے باپ کا مکان اور دوسری چیزیں چھوٹے بیٹے کو دے دیں، مجھے وراثت میں سے کوئی شے نہ دی۔ پتہ چلا کہ حافظ کا چھوٹا بھائی کم تعلیم یافتہ اور غریب آدمی تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ حافظ اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا ہے اور اس کے مالی حالات اچھے ہیں، مختصر سا مکان چھوٹے بیٹے کو دے دیا اور حافظ نے اسی کو ماں سے لاتعلقی کا بہانہ بنا لیا۔

اور پھر آخر کار اللہ کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ ماں، ساس اور بیوی کی بددعائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ 1995ء میں وزارت مذہبی امور نے اسلامی نظریاتی کونسل کا ایک وفد حج پر روانہ کیا۔ اس میں مجاہد لاہوری اور حافظ افتخار دونوں شامل تھے۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ پہلے ہی دن جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے اور عمرے اور طواف وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل میں آئے تو حافظ کو یرقان کا شدید ترین عارضہ لاحق ہو گیا۔

غیر معمولی اسہال اور مسلسل الٹیاں رکنے ہی میں نہیں آتی تھیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر سے لگ گیا اور ہلنا جلنا اس کے لئے محال ہو گیا۔ نتیجتاً اسے جیاد ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ حج کے اختتام بلکہ ہمارے وہاں قیام تک حافظ کی صحت بحال نہ ہوئی اور اللہ نے اس کی مکہ میں موجودگی کے باوجود اسے حج کی سعادت سے محروم رکھا، اپنے گھر کے طوافوں کی اجازت نہ دی اور وہ مدینۃ النبی کی برکات سے بھی فیضیاب نہ ہو سکا۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ حج کے بعد ہماری مصروفیات ختم ہوئیں تو ہم نے حافظ کو سٹریچر پر ڈال کر جہاز پر سوار کرایا اور واپس آ گئے۔ اس طرح ایک حافظ قرآن اور دینی تعلیمات سے باخبر شخص کو اس کی سنگ دلی، خیانت اور مسلسل بے اصولی کی جو کڑی سزا دی گئی شاید اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔

1997ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین اقبال احمد خان نے حافظ افتخار کو بیسویں گریڈ میں ترقی دے دی لیکن اگست 1998ء میں جب ڈاکٹر ایس ایم زمان کونسل کے چیئرمین بنے تو کسی بات پر ناراض ہو کر انہوں نے حافظ کی انیسویں گریڈ میں تنزلی کر دی اور یہی حادثہ حافظ کی جان کا ویری بن گیا۔ اس کی صحت اس وقت تک بہت ہی اچھی تھی۔ وہ اپنی خوراک اور سیر وغیرہ کا بہت اہتمام کرتا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سپید تھا اور بظاہر اسے کوئی بھی بیماری لاحق نہ تھی۔ نہ شوگر، نہ بلڈ پریشر، نہ دل یا گردوں کی کوئی تکلیف۔ دسمبر 1998ء میں رمضان کی پہلی رات کو وہ تراویح پڑھ کر آیا تو حسب معمول دودھ پی کر سو گیا لیکن رات کے دو بجے اسے سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے قریبی ہسپتال میں پہنچا۔ مگر رات کے دو بجے کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہ تھا۔ ایک نرس ڈاکٹر کی تلاش میں نکلی لیکن اس کے واپس آنے تک حافظ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اوندھے منہ فرش پر گرا اور آن واحد میں دم توڑ گیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے موت کی تصدیق کر دی۔

دوسری بیوی سے حافظ کی یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، چوتھا بیٹا تھا مگر وہ صرف ڈیڑھ سال کا تھا جبکہ اولاد کی کوئی خوشی دیکھے بغیر حافظ آخرت کو سدھار گیا اور اپنے پیچھے عبرت کے کتنے ہی نقوش چھوڑ گیا۔

(اس مضمون میں متعلقہ حافظ کا اصل نام نہیں دیا گیا تاکہ اس کی بیوی اور بچوں کو پریشانی نہ ہو)

***

جگ بیتی

وہ ایک لمحہ

میں مرتے دم تک وہ ایک لمحہ نہیں بھول سکتی جب میرے دل نے ایک سچے مذہب کو پہچانا تھا۔

☆ محمد رضوان قیوم

1947ء میں جب متحدہ ہندوستان سے الگ ہوکر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک الگ وطن بنالیا تو اس خطے میں بدترین فسادات پھوٹ پڑے۔ مکار ہندوؤں نے سکھوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ مالی اور جانی نقصان کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ہندو سکھ سینکڑوں مسلمان عورتوں اور جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے اور ہزاروں نے کنوؤں میں کود کر یا خود کو کسی تیز دھار آلے سے ہلاک کر کے اپنی عصمت بچائی۔ اللہ سب شہداء کو غریق رحمت کرے۔

جہاں مسلمانوں کا بس چلا۔ انہوں نے بھی ہندوؤں سکھوں کو جہنم رسید کیا مگر یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ دنیا کی تاریخ کے ان ہولناک فسادات نے بے شمار کہانیوں کو جنم دیا۔ ان میں بعض کہانیاں ایسی ہیں کہ ناقابل یقین اور گھڑی ہوئی لگتی ہیں۔ انسانی فطرت قدرت کا ایک عجوبہ ہے جو ہر پل رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ان حالات میں جب ہندو سکھوں کی اکثریت انسانیت بھول کر درندگی میں مصروف تھی، کچھ "انسان" موجود تھے جنہوں نے انسانیت کو ترک نہیں کیا تھا اور انہیں انسانی اور اخلاقی قدریں یاد تھیں۔

ترلوک سنگھ بھی ایک ایسا ہی کردار تھا۔ وہ ایک

غیرت مند اور وضعدار زمیندار تھا۔ یاروں کا یار تھا اور یاری نبھانا جانتا تھا۔ تھا تو وہ سکھ ہی لیکن بڑی نفیس طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اپنے گرو کا سچا خالصہ ہوں۔ جہاں معاملہ عزت غیرت کا آ جاتا وہ دوسرے کی جان لینے اور اپنی جان دینے والا انسان تھا۔

ترلوک سنگھ کے دو بیٹے تھے۔ بلبیر سنگھ اور رنبیر سنگھ۔ ایک بیٹی تھی جس کا نام شوبا دیوی تھا۔ ترلوک سنگھ کی انسان دوستی اور غیرت مندی کا یہ ناقابل یقین واقعہ شوبا دیوی کی زبانی پیش ہے۔ یہ واقعہ مجھے ایک بزرگ خاتون سکینہ بی بی نے سنایا تھا۔

تقسیم سے قبل ہم موجودہ بھارت کے شہر دلی کے محلہ کھاری باؤلی میں رہا کرتے تھے۔ جس محلہ میں ہمارا گھر تھا وہ علاقہ انتہائی گنجان آباد تھا۔ وہاں کے مکانات آپس میں کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ ان کے اندر بسنے والے ہندو، مسلمان، سکھ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہا کرتے تھے۔

اس دور میں مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے مذہب کا باہمی احترام کرتے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے عقیدے، مذہب، روایات، مذہبی ثقافت وغیرہ کو انجام دینے میں آزاد تھا۔ ہمارا گھر خالصتاً مذہبی خاندان پر مشتمل تھا۔ ہمارے ایک مسلمان پڑوسی تھے جنہیں ہم سارے گھر والے چچا رحمت کہا کرتے تھے۔ لیکن میرے باپو انہیں مذاق میں حافظ جی بھی کہا کرتے تھے۔

میرے باپو جی اور چچا رحمت آپس میں بچپن کے دیرینہ دوست تھے۔ وہ گھنٹوں موسیٰ بھائی کے مکان کے تھڑے پر بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ جبکہ میں چچا رحمت کے گھر جا کر ان کی بیٹی فریدہ کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

وہ میری ہم عمر تھی۔ فریدہ کا بھائی فرحان جو ہم سے ایک آدھی سال بڑا تھا، وہ ہم دونوں سہیلیوں کو خوب تنگ کرتا تھا۔

فریدہ کی امی جن کا نام سرور کی بیگم تھا، ہم جب چچی سروری سے فرحان کی شکایت کرتی تھیں تو وہ وقتی طور پر ہماری تسلی کے لئے اسے ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں سہیلیوں میں آپس میں اتنا پیار تھا کہ بعض دفعہ ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر میں سو جایا کرتی تھیں۔ میرے دو بھائی تھے ایک بلبیر اور دوسرا رنبیر مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ میرا بھائی بلبیر انتہائی سنجیدہ اور کم گو تھا جبکہ رنبیر انتہائی نالائق اور پڑھائی سے یکسر نالاں ہوا تھا۔

رنبیر کو پتا جی نے پڑھانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ اس معاملہ میں بڑا ڈھیٹ رہا اور یہی وجہ تھی کہ بڑا ہو کر بری سنگت میں رہ کر آوارہ بن گیا تھا۔ وہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ وہ اب راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا۔ بعض دفعہ پتا جی اور چچا رحمت دونوں مل کر اسے اس کے متوقع ٹھکانوں پر تلاش کیا کرتے تھے۔

وہ اکثر جوا، شراب کے اڈوں سے ملا کرتا تھا اور جب وہ ملا کرتا تھا تو پتا جی اور چچا رحمت اسے بے دردی سے مارتے ہوئے گھر لایا کرتے تھے۔ رنبیر کی ہم بہن بھائیوں اور فریدہ سے نہیں بنتی تھی جبکہ بلبیر اپنے کام سے کام رکھا کرتا تھا۔ وہ گھر کے کسی معاملہ میں اپنی ٹانگ نہ اڑایا کرتا تھا۔ فریدہ کے بھائی فرحان سے مجھے بچپن ہی سے نفرت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فریدہ اور مجھے تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ گڑیا چھپا دیا کرتا تھا۔ اس کی ذہنیت میں نہ جانے کیسی شرارت بھری تھی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم بچے جوان ہو گئے۔ ادھر پتا جی اور چچا رحمت بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔ جبکہ میری ماتا جی گزر گئی تھی۔ بلبیر نے ایف اے کر لیا تھا جبکہ رنبیر پکا بدمعاش بن چکا تھا۔ وہ ساری ساری رات سب دھڑک اپنے شرابی کبابی جواری دوستوں کی صحبت میں

رہتا تھا۔ بلبیر نے ایک پرائیویٹ نوکری کر لی تھی جبکہ فرحان نے اپنی شرارتوں کے باوجود اپنی پڑھائی کو جاری رکھتے ہوئے میٹرک کر لیا تھا۔ اس نے آگے نہ پڑھا تھا وہ کسی سرکاری نوکری کی تلاش میں تھا۔ برصغیر میں تحریک آزادی زور و شور کے ساتھ جاری تھی۔ ہندو، سکھ چاہتے تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد متحدہ ہندوستان آزاد ہو لیکن مسلمان چاہتے تھے کہ ان کا علیحدہ وطن پاکستان ہو۔

ایک دن پتا جی نے بڑے بھرائے دل سے چچا رحمت کو کہا۔ ''یار! میں سوچتا ہوں کہ ہم بچپن سے ایک دوسرے کے اتنے گہرے دوست اور آپس میں شدید محبت رکھنے والے پڑوسی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہی نہیں کہ ہم دونوں دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ کاش ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار حائل نہ ہوتی۔ اگر ہمارے درمیان یہ آہنی دیوار نہ ہوتی تو میں اپنی اس دوستی کو رشتہ داری میں بدل دیتا''۔

''تیرا کیا مطلب؟'' چچا نے ان سے پوچھا۔ پتا جی نے کہا کہ اگر ہم دونوں ہم مذہب ہوتے تو میں لازماً بلبیر کے لئے فریدہ تجھ سے مانگتا۔

اتنے میں رنبیر شراب کے نشے میں بڑے لڑکھڑاتے انداز میں ان کے قریب پہنچا اور اس نے کہا پتا جی اگر میں تمہارا بڑا پتر ہوتا اور چچا رحمت ہمارے ہم مذہب بھی ہوتے ہیں اس صورت میں بھی میں فریدہ سے شادی نہ کرتا۔

''کیوں بھئی؟''

''وہ اس لئے کہ وہ میری دیدی کی طرح ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میری دیدی شوبا دیوی ہے''۔

''چلو دیکھیں گے تو واقعی چچا رحمت اور فریدہ سے اتنی پاکیزہ انسیت رکھتا ہے''۔

ایک روز ہم چچا رحمت کی فیملی کے ساتھ بیٹھے باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ چچا کے دروازے پر ہمارے محلے کا ایک بزرگ ہندو سرت کمار زور زور سے چلایا کہ جلدی آؤ، بڑا غضب ہو گیا ہے۔ ہم جلدی سے کھانا چھوڑ کر باہر آئے۔

چچا رحمت، پتا جی فرحان بلبیر سب بھاگے ہوئے دروازے پر پہنچے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ چچا سرت کمار کے ساتھ محلے کے چند اور لوگ کھڑے تھے۔ پتا جی نے ہونقوں کی طرح پوچھا کہ کیا ہوا۔

اس نے اونچی آواز میں چلاتے ہوئے کہا کہ کمینے گوروں نے برصغیر سے جانے کا نہ صرف اعلان کر دیا ہے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیڈر جناح کے مطالبے پاکستان کو تسلیم کرتے ہوئے اسے علیحدہ ملک بنانے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

''یہ نہیں ہو سکتا''۔ رنبیر نے انتہائی جذباتی انداز میں غصے سے کہا۔

''یہ ہو گیا ہے''۔ فرحان نے طنزیہ طور پر اسے چڑاتے ہوئے کہا۔ رنبیر نے غصے میں اسے ایک زوردار دھکا دیا اور موٹی موٹی گالیاں مسلمانوں کو دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ زمین پر پڑے فرحان کو پتا جی نے اٹھایا اور چچا رحمت کو کہا کہ میں رنبیر کی یہ بدتمیزی برداشت نہیں کروں گا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی یہ ہمت کہ وہ میرے سامنے تمہارے بیٹے کو دھکا دے۔

چچا نے پتا جی کے غصے کو شانت کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یار! رنبیر کا غصہ اپنی جگہ جائز ہے۔ وہ دراصل فرحان نے اسے پاکستان بننے کی خوشی میں چڑا دیا تھا''۔

بلبیر وہاں اگرچہ پاکستان بننے کے اعلان کے بارے میں سن کر بظاہر اپنا کوئی ردعمل نہیں دے رہا تھا لیکن وہ سکتے کے عالم میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ پتا جی فوری طور پر اپنے ہم عمر دیگر محلے دار ہندو، سکھوں کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے محلے میں جگہ جگہ ہندو سکھوں کی الگ اور مسلمانوں کی الگ ٹولیاں بن گئیں۔ ایک تناؤ کا ماحول ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ جو کہ رفتہ رفتہ کراہیت کا شکار ہو رہا تھا۔ شام کو پتا جی نے ظہیر کے ذریعے چچا رحمت اور فرحان کو خصوصی طور پر گھر بلایا تھا۔

پتا جی نے چچا رحمت کو بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے دو غم ہیں۔ پہلا غم تو یہ ہے کہ ہندوستان دو ٹکڑے ہو رہا ہے اور دوسرا یہ کہ تم اپنے خاندان سمیت پاکستان جا رہے ہو۔ جانے ہم کبھی آئندہ آپس میں مل پائیں گے یا نہیں''۔

اتنا سننا تھا کہ فریدہ مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی پتا جی اور چچا رحمت آپس میں مل کر رونے لگے۔ ظہیر بھی افسردگی سے بیٹھ گیا۔

دونوں کے افسردہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ ان دونوں میں بھی آپس میں بڑا بھائی چارہ تھا۔ یہ دونوں بچپن کے یار بیلی تھے۔ پتا جی نے چچا رحمت اور ہمارے گھر والوں کو کہہ رکھا تھا کہ تم لوگ جب تک پاکستان ہجرت نہیں کرتے اس وقت تک زیادہ سے زیادہ میرے گھر آ کر میری نگاہوں کے سامنے رہا کرو۔

پتا جی چچا رحمت اور ان کے پریوار سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے۔ میں بھی اپنا زیادہ تر وقت فریدہ کے ساتھ گزارتی تھی۔ وہ بھی بہت ہراساں تھی۔

ہمارے محلے میں ایک دن ایک مسلمان خاندان پر ہندو سکھ بلوائیوں نے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ میں اس مسلمان گھرانے کے سربراہ ابراہیم قریشی کو بلوائیوں نے قتل کر دیا تھا۔ جبکہ ان کی ایک لڑکی مہتاب کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد پتا جی نے چچا کی تمام فیملی کو کہا کہ وہ ان کے گھر آ جائیں۔ کیونکہ پتا جی کا یہ خیال تھا کہ چچا کی فیملی ہمارے گھر میں محفوظ ہو گی۔ چچا رحمت مع اپنی فیملی کے ہمارے گھر آ گئے تھے ادھر پتا جی نے چچا رحمت کی فیملی کی بحفاظت پاکستان ہجرت کے معاملات کو نمٹانے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے علاقہ کے چند بزرگ ہندو سکھ دوستوں کی منت سماجت کی کہ رحمت ان کا دوست ہے۔ لہٰذا اس کی فیملی کی جان، مال کی حفاظت کی گارنٹی دی جائے۔

جواباً ان بزرگوں نے پتا جی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ تیرا بیٹا رنبیر تو اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے گھر کو نہ صرف لوٹ رہا ہے بلکہ وہ ان کی لڑکیوں کو اٹھا کر جوا گڑھ، رنڈی بازار کے بدنام ٹھیکیدار سنگھر کو فروخت کر رہا ہے اور یقیناً وہ تیرے دوست رحمت کی بیٹی فریدہ کو نہ صرف ان کے حوالے کرے گا بلکہ ہو سکتا ہے اسی ریلے میں تم اپنی بیٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔

پتا جی وہاں سے ناامید، پریشان ہو کر گھر آ گئے۔ انہوں نے چچا رحمت کو کہا کہ تم فٹافٹ گھڑی کی چوتھائی میں پاکستان جانے کی تیاری کرو۔ کیونکہ اس محلہ میں میرے خیال کے مطابق صرف تمہارا گھر فسادیوں کے حملے سے بچا ہے۔ پتا جی نے روتے ہوئے کہا کہ سچی بات ہے تمہیں حفاظت کی خاطر اپنے گھر لایا تھا لیکن مجھے اب کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ میں مزید تمہاری جان و مال اور عزت کی حفاظت کر پاؤں گا۔ پتا جی نے چچا رحمت کو 600 روپے نقد اور کچھ سونا دیا۔

ہمارے علاقہ کے حالات دن بدن بدتر اور تباہ والے ہو گئے تھے۔ پتا جی نے ظہیر سے کہا کہ تم اور میں چچا رحمت کے خاندان کو ریلوے اسٹیشن چھوڑنے جائیں گے۔ جہاں سے اسپیشل ٹرین پاکستان جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ظہیر کو یہ تاکید کی کہ رنبیر ناخلف کو یہ خبر نہ ہو کہ ہم فلاں وقت ریلوے اسٹیشن جائیں گے۔ پتا

جی کو اندیشہ تھا کہ زبیر اپنے بدمعاش ساتھیوں کے ساتھ فریدہ سے کوئی بدتمیزی نہ کرے۔

ایک دفعہ زبیر اپنے مخصوص انداز میں آیا بھی تھا اور اس نے چچا رحمت کی فیملی کے بارے میں پوچھا بھی کہ یہ لوگ کب پاکستان ہجرت کریں گے تاکہ وہ بہ حفاظت ان کو ٹرین میں بٹھا آئے؟ اسے چاچی نے بڑی بے رخی سے کہا کہ تو اپنے کام سے کام رکھ۔ پھر اسے ہجرت کے اصل وقت سے غلط وقت بتلایا تھا۔

چاچی نے اسے کہا کہ تو نے جو فرحان سے بدتمیزی کی تھی اس کی معافی مانگ اس نے چاچی سے گستاخی کرتے ہوئے کہا وہ زندگی بھر اس سے معافی نہ مانگے گا۔ چاچی نے اسے اپنے تئیں بڑا مجبور کیا کہ وہ کسی طرح فرحان سے معافی مانگ لے لیکن وہ مسلسل اکڑ ارہا۔ اس نے چاچی کے کافی اصرار کے باوجود فرحان سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی نہ مانگی۔ بالآخر اسے چاچی نے گھر سے باہر نکال دیا۔

اس دوران یہ ہوا کہ بلیر نے چاچی کو بتلایا کہ اس نے جامع مسجد کے علاقے کے ایک ٹیمپو ڈرائیور کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے جو کہ شورش زدہ ماحول میں چچا رحمت کی فیملی کو نکال کر دہلی ریلوے سٹیشن لے جائے گا۔ ٹیمپو دراصل چھوٹے ٹرک کو کہتے تھے جو کہ ہندوستان میں چلنے والے عام سوزوکی سے ذرا بڑا ہوتا تھا۔

چچی رحمت اپنا سامان بہت قلیل یعنی ضرورت کے تحت لے کر جانا چاہتے تھے لیکن چچی نے بے طور پر بہت سامان جمع کر لیا تھا۔ چاچی اور بلیر نے انہیں اتنا سامان لے جانے سے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے فریدہ کے جہیز کے لئے یہ چیزیں اکٹھی کی ہیں۔ پاکستان جانے کے بعد نہ جانے کیسے حالات ہوں ہم ان قیمتی چیزوں کو بنا پائیں کہ نہیں۔

چاچی اور چچا رحمت نے انہیں کہا کہ اول تو سپیشل

زمین میں اتنی جگہ نہ ہو گی کہ یہ سامان سما جائے اور دوسرے ٹیمپو میں اتنا سامان دیکھ کر یہاں کے فسادی ہندو سکھ لٹیرے لازماً لالچ میں آ کر اس پر حملہ کریں گے۔

پتا جی نے چچی کو کہا کہ تم فریدہ کی شادی کے جہیز کی فکر نہ کرنا۔ تم پاکستان میں جہاں کہیں بھی ہوئے میں تمہیں اس کے بیاہ کے لئے روپے بھیج دوں گا۔ چچی نے ان کے کہنے پر پاکستان لے جانے والے سامان میں سے تھوڑا بہت سامان ہی نکالا تھا۔

چچا رحمت کے خاندان کی پاکستان جانے کے لئے تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھر میں ماحول بڑا افسردہ اور سہما ہوا تھا۔ پتا جی اور چچا رحمت دونوں گلے لگ کر بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ فریدہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ حالات کے ٹھیک ہوتے ہی میں لازماً تجھ سے ملنے بھارت آؤں گی۔ ظہیر نے کہا کہ میں ٹیمپو والے کو ایک گھنٹہ تک لے کر آتا ہوں۔

''ایک گھنٹہ میں کیوں؟'' چچا رحمت نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ٹیمپو والا بڑا ارسک لے کر پاکستان جانے والے مہاجرین کو سٹیشن یا لاری اڈے وغیرہ لے جا رہا ہے اور اس نے کہا کہ میں جیسے ہی ٹیمپو لے کر آؤں تو تم فوراً اس میں بیٹھ جانا اور جاتے وقت دروازے پر الوداعی انداز میں نہ ملنا۔ وہ اس لئے کہ ارد گرد کے لوگوں کو چچا رحمت کی پاکستان کی جانب ہجرت کی خبر نہ ہو یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

چچا رحمت کی فیملی کی روانگی میں ابھی آخری گھنٹہ باقی تھا۔ فریدہ نے مجھے کہا کہ آ شوبا! تو میرے ساتھ ذرا شنو کے گھر صرف پانچ منٹ کے لئے چل میں نے اس سے الوداعی ملاقات کرنی ہے''۔

''تمہیں وہاں جانے کی ضد نہ کر''۔ میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو وہ ہمارے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے کی دوری پر ہے اور دوسرے اس علاقہ کے حالات بہت خراب ہیں۔ مجھے پتہ نہیں وہاں فسادیوں کا گڑھ ہے''۔

''تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتی''۔ اس نے مجھے کہا۔ ''تم میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتی اور کس میں ہمت ہے ہمیں نقصان پہنچائے''۔ فریدہ نے یہ بات اتنے جذباتی انداز میں کی کہ میرا دل نہ جانے کیوں موم ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تیرے ساتھ اس شرط پر وہاں جاؤں گی کہ تو وہاں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ہی رکے گی اور وہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔

''میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی''۔

شنو ہماری بچپن کی سہیلی تھی۔ ہم دونوں اپنے بڑوں کی نظریں بچا کر شنو دیوی سے ملنے اس کے گھر چلے گئے۔ میں اور وہ جب شنو کے گھر ملنے گئے تو راستے میں ہمیں کوئی خطرے والی بات محسوس نہیں ہوئی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ شنو فریدہ سے بڑے والہانہ طریقے سے ملی۔ اس نے نشانی کے طور پر اپنے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار کر فریدہ کو دیں۔ فریدہ اپنے وعدے کے مطابق وہاں چار، پانچ منٹ ہی ٹھہری۔ اس کے بعد وہ ہماری ایک اور سہیلی مولسری سے ملنے میرے ساتھ گئی۔ وہ ادھر بھی زیادہ دیر نہ ٹھہری تھی۔ مولسری نے فریدہ کو کہا کہ میں تجھے جاتے ہوئے اپنی نشانی کے طور پر ایک سوٹ دیتی ہوں۔ وہ ڈھونڈ رہی تھی۔

''جلدی کر فریدہ گھر میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہمیں زیادہ دیر اور ٹھہرنا نہیں چاہئے''۔ میں نے فریدہ سے کہا۔

اتنے میں فریدہ کو مولسری کی اپاہج ماں نے آواز دے کر اپنے پاس دوسرے کمرے میں بلا لیا۔ وہ ان کے پاس چلی گئی اور میں بے دھیانی میں اوپری کمرے میں مولسری کے پاس چلی گئی۔ میں دراصل اسے یہ کہنے گئی تھی کہ وہ جلدی سے فریدہ کو سوٹ نکال کر دے۔ اس نے

ہم ادھر تقریباً دس منٹ ٹھہرے لیکن فریدہ نہ آئی۔ خوف و پریشانی کے عالم میں میری ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ پوچھن کے گھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں فریدہ کو فلاں فلاں جگہ دیکھنا چاہئے میں اور مولسری اسے دیوانوں کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر ڈھونڈتے رہے۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ ایک خیال دل میں یہ بھی آیا کہ وہ سکتا ہے ہمارے گھر چلی گئی ہو۔

میں اس لیے یہ سوچ کر بھی پریشان ہو رہی تھی کہ کس منہ سے اپنے گھر یہ خبر لے کر جاؤں گی کہ فریدہ کھو گئی۔ چچا رحمت اور چچی کا کیا بنے گا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ پتا جی اور بھائی جلبیر میرا کتنا برا حال کریں گے۔ ادھر مجھے فریدہ کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ مجھے ساتھ ساتھ یہ بے چینی بھی تھی کہ پیچھے سارے گھر والے ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔

وہی ہوا میں اور مولسری پریشانی میں فریدہ کو تلاش کر رہے تھے کہ اتنے میں پتا جی میرے سامنے شدید برہمی کی حالت میں سامنے آ گئے اور انہوں نے آتے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا کہ فریدہ کہاں ہے؟

''جی وہ..... وہ.....'' میں بول نہ سکی۔

انہوں نے سرخ نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بتا فریدہ کہاں ہے؟ تجھے پتا نہیں ہے کہ یہاں کے حالات کتنے فساد زدہ اور تناؤ والے بنے ہوئے ہیں۔ ہندو، سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن چکے ہیں''۔ انہوں نے اس تنبیہ کے بعد بڑی سختی سے چلا کر پوچھا۔ ''فریدہ کہاں ہے؟''

''جی..... جی وہ.....''

''یہ جی..... جی کیا کر رہی ہے بتلاتی کیوں نہیں کہ فریدہ کہاں ہے؟'' مجھے پتا جی کے یہ الفاظ بالکل کسی برچھی کی مانند لگ رہے تھے۔ ''بول بولتی کیوں نہیں کہاں ہے فریدہ؟''

میں یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فریدہ ہوتی تو میں انہیں کچھ جواب دیتی۔

مولسری نے بسورتے کہا کہ چچا جی فریدہ کا کچھ پتہ نہیں چل رہا..... وہ کہاں گئی۔

''کیا کہا؟'' انہوں نے اپنا دل پکڑ لیا۔

''دیکھو میری رحمت سے برسوں پرانی دوستی اور اس کے ساتھ خوشگوار، پُر اعتماد رشتہ ناطے پر رب کے واسطے کلنک کا ٹیکہ نہ لگانا۔ جاؤ اسے ڈھونڈو، وہ کوئی ہوائی مخلوق تو نہ تھی جو ہوا میں پُر اسرار طریقہ سے اڑ گئی''۔

فریدہ کی یوں پُر اسرار انداز میں گمشدگی کی خبر پورے محلّہ میں پھیل چکی تھی۔ اڑوس پڑوس کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مجھ سے اور مولسری سے فریدہ کی گمشدگی کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔

''میں یقین سے کہتا ہوں اسے لازماً زبیر اپنے غنڈوں کی مدد سے اڑا لے گیا ہوگا''۔ وہاں کھڑے ایک بزرگ ہندو بابا نے یہ دل جلا جملہ پھینکا۔

''ہاں ہاں، آج کل تیرا بیٹا زبیر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی لڑکیوں کو اغوا کر کے سنگھر کے ہاتھوں فروخت کر کے بڑی دولت کما رہا ہے''۔ وہاں کی نے ہندو بابا کی بات کی تائید کر دی تھی۔

''ارے کیا یونہی باتوں کے نشتر مار کر میری ذات کو چھیدتے رہو گے، بھگوان کے واسطے فریدہ کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو''۔ باپو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''رحمت مسلے سے تجھے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہو گئی ہے''۔ وہاں اس قسم کے طنزیہ مزاحیہ جملے پتا جی کو سنائی دینے لگے۔

پتا جی نے سب لوگوں کے سامنے ہی میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''اگر آج فریدہ نہ ملی تو یاد رکھو میں تیرا گلا گھونٹ

دوں گا"۔

فریدہ کی گمشدگی کی خبر جب ہمارے گھر میں موجود چچا رحمت کو ملی تو چچا چچی بذات خود اور فرحان گھبراہٹ کے عالم میں باہر آ گئے۔ ان کو جب محلے والوں نے دیکھا تو وہاں موجود چند فسادی لڑکوں نے فرحان کو پکڑ کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

ان کے ہندو، سکھ بزرگ انہیں ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے۔ چچا رحمت کے خاندان کو پتا جی نے کہا کہ وہ ان کے گھر میں بیٹھیں۔ جبکہ فرحان جسے ہندو، سکھ فسادی نوجوانوں نے پکڑا ہوا تھا اسے بمشکل محلے کے بزرگوں نے چھڑوایا تھا۔

وہ سہا ہوا تھا جبکہ چچی نے وہاں رو رو کر پورا محلہ سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ گھر نہ گئیں وہاں کھڑے پتا جی نے بڑے جذباتی انداز میں ایک بڑا عجیب اعلان کر دیا کہ جو شخص گمشدہ فریدہ کو تلاش کرے گا تو اس کے نام اپنے ایک کھیت رجسٹری کر دوں گا۔

"پاگل ہو گیا ہے لگتا ہے فریدہ کا باپ رحمت نہیں، یہ ہے"۔ وہاں ایک شیطان صفت شخص نے باپو جی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ میں، مولسری، پوکھن مل کر دوبارہ فریدہ کو ڈھونڈنے لگے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک نہ ملی۔ اتنے میں بلبیر بھی وہاں آ گیا۔ اس نے کہا کہ ٹیکسی والا آ گیا ہے۔ اس نے وہاں فریدہ کے بارے میں سنا تو اس نے بھی دو چار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیے کہ وہ کہاں گئی؟

"مجھے شک ہے کہ زبیر اسے اغوا کر لے گیا ہے"۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

اس نے زبیر کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"یہ آج کل زبیر نے بڑی لوٹ مار مچا رکھی ہے۔ اس نے مندر پورہ سے کل ہی دو لڑکیاں اٹھا کر بیچی ہیں"۔ ایک محلے دار نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کاش! زبیر پیدا ہوتے ہی مر جاتا"۔ بلبیر نے کہا۔ "میں نے بڑی مشکل سے ٹیکسی کے ڈرائیور کو سٹیشن لے جانے کے لئے راضی کیا ہے۔ وہ گلشن کمار کی دکان کے پاس منتظر کر رہا ہے۔ کہو تو واپسی کا کہہ دوں"۔

وہاں موجود کچھ مخلص لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ آج رحمت کے خاندان کو پاکستان ہجرت نہ کروائی جائے کیونکہ آج سٹیشن تک جانے والوں کو فسادی جگہ جگہ اپنے عتاب کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ لہٰذا آج یہ کام کرو کہ کسی نہ کسی طریقے سے فریدہ کو ڈھونڈو۔

"ڈھونڈوں کہاں؟" بلبیر نے جل کر کہا۔ "اگر اسے ڈھونڈنا ہی ہے تو اس سے پہلے زبیر کو تلاش کرو۔ اس سے اس مسئلے کا حل مل جائے گا"۔

تھوڑی دیر میں زبیر بھی اپنے فسادی ٹولے کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی بڑی پریشانی اور تجسس کے عالم میں کہا کہ یہ میں کیا سن رہا ہوں کہ فریدہ لاپتہ ہے۔ میری بہن فریدہ کہاں ہے؟ وہ کدھر گئی ہے؟

پتا جی نے اس کے سوال پر الٹا ایک زوردار تھپڑ اس کے گالوں پر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "بے غیرت، مجھے تجھ پر قوی شک ہے کہ تو نے اسے کسی سازش کے تحت مولسری کے گھر سے کسی بچے کے ذریعہ بلا کر اغوا کیا ہے"۔

"رب مجھے موت دے دے میں گورو کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی منہ بولی بہن فریدہ کو اغوا نہیں کیا"۔

"رب کے واسطے فریدہ کو واپس کر دو دیکھو، اگر آج وہ نہ ملی تو یاد رکھو میں ادھر ہی دم توڑ دوں گا"۔ باپو نے کہا۔

"باپو جی! میں گورو کی سوگند کھاتا ہوں فریدہ میری شوبا دیدی کی طرح ہے۔ میں نے اسے بہن کہا ہے، آپ میری بات کا یقین کریں"۔ اس نے بڑے جذباتی

انداز میں یہ بات چاچی کے قدموں میں گرتے ہوئے کہی۔

باو جی اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں بھی رنبیر سے چمٹ گئی۔ چاچی نے اسے کہا۔

"رنبیر! میں تجھے آج اپنا بیٹا جب مانوں کہ تُو آج کسی طرح سے فریدہ کو ڈھونڈ دے"۔

اس نے گلی میں ایک بڑے تھڑے پر بیٹھ کر کہا کہ میں فریدہ کو اپنے طریقہ سے تلاش کر کے رہوں گا۔

اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ سے اور مولسری سے فریدہ کے بارے میں پوچھا۔ اسے مولسری نے اپنی ماں کی وہی بات بتلائی کہ فریدہ میری اپاہج ماں کے پاس ان سے ملاقات کرنے گئی تھی۔ وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ بقول میری ماں کے فریدہ کو باہر کوئی بچہ بلانے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ پوکھن باجی تجھے بلا رہی ہے اور وہ بچہ انجانا سا تھا۔

رنبیر نے کچھ سوچتے ہوئے دو، تین دفعہ ہوں، ہوں کہا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ایک بدمعاش سے سگریٹ مانگی اور اس کے دو چار گہرے کش لے کر بولا۔ میں غور کر رہا ہوں کہ وہ بچہ کون ہو سکتا ہے؟

اس نے محلے میں کھڑے لوگوں سے پوچھا کہ کوئی شخص ہے جو اس وقت گلی میں ہو اور اس نے کسی اجنبی لڑکے کو بھو رام (مولسری) کے گھر کے پاس دیکھا ہو۔ اس کے اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔

"اچھا یہ بتلاؤ کہ میں نے سنا ہے کہ فرحان کو اس محلے کے چند لڑکوں نے مارا ہے۔ میرے سامنے ذرا وہ چہرے تو لاؤ"۔ وہاں وہ لڑکے ابھی تک موجود تھے، کچھ بزرگوں کی نشاندہی پر انہیں رنبیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ رنبیر نے ان کو اپنے بدمعاشوں کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ان کی دھنائی کرو۔

ابھی وہاں اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمارے قریبی محلے کی ایک بڑھیا دھوبن وہاں آ گئی اور اس نے بڑی عجیب بات کہی کہ اس نے ایک آٹھ سالہ بچے کو فریدہ کے ساتھ دھوبی گھاٹ سے محلہ گراؤنڈ میں جاتے دیکھا ہے۔

دھوبن کی اس بات سے وہاں موجود سب کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔

رنبیر نے بجلی کی مانند اٹھتے ہوئے کہا کہ چلو دھوبی گھاٹ سے محلہ گراؤنڈ میں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب رنبیر کے پیچھے ہو لیے۔ اس گھاٹ سے محلہ گراؤنڈ کی صورتِ حال یہ تھی کہ فسادات کی وجہ سے بالکل ویران تھا۔

ہم جب سارے وہاں پہنچے تو وہاں دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس میدان میں ہم سارے لوگ پھیل گئے۔ رنبیر نے دھوبی گھاٹ کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ایک جگہ ایسا ہوا کہ محلے کے ایک بچے کو فریدہ کی چپلیں ملیں اور اس کے قریب اس کی پھٹی ہوئی قمیص کا کپڑا ملا۔ اسے دیکھ کر اس وقت ہمیں یہ ادراک ہو گیا تھا کہ فریدہ کے ساتھ بہت ہی برا ہو گیا ہے۔

ایک جگہ دھوبی گھاٹ کے بالکل آخر میں [illegible] سے نئی آبادی کے مکانات شروع ہوتے تھے۔ وہاں [illegible] رنگ کے نشان دیکھے۔ رنبیر نے اس جگہ کو [illegible] دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ کافی دیر تک اس جگہ کا [illegible] طور پر معائنہ کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ان [illegible] کے نشان کے ساتھ ہی ماسٹر ناجی بیڑی کمپنی کا خالی پیکٹ ملا تھا۔

"اب یہ ماسٹر کی بیڑی ہمارے جاننے والوں میں سے کون پیتا ہے؟" بھولو ٹرک کے قریب نرم مٹی کو جب مزید غور سے دیکھا تو وہاں انہیں ایک قمیص کا ٹوٹا ہوا بٹن بھی ملا۔

"جس نے فریدہ کو اٹھایا ہے وہ لازماً ماسٹر کی بیڑی پیتا ہوگا"۔ وہاں موجود ایک آدمی بولا تھا۔ "ذرا ذہن پر زور ڈالو ہمارے محلے میں کون اس برانڈ کی بیڑی پیتا ہے"۔

چاچا جی نے کہا کہ اس برانڈ کی بیڑی تو جلبیر پیتا ہے۔ اس کے علاوہ شفو درزی اس برانڈ کا دھواں نکالتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد رنبیر نے بڑے تحمل سے جلبیر کو بلایا۔ جلبیر بڑے اعتماد کے ساتھ اس کے پاس آیا۔

"ہاں کیا بات ہے؟ اس بدتمیزی سے تو مجھے اپنے پاس کیوں بلا رہا ہے؟"

رنبیر نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اس کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "سیدھا آرام سے کھڑا رہ"۔ اس نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جھٹکے سے ماسٹر برانڈ بیڑی کا پیکٹ نکالا اور پھر جلبیر کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تیرے چہرے پر کس کے ناخنوں سے نشان ہیں؟"

"وہ... وہ..." جلبیر نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ "رام پورہ کے پاس بچوں کی لڑائی ہو رہی تھی وہاں ان کو چھڑاتے ہوئے مجھے شاید کسی کا ناخن لگ گیا ہوگا۔ مگر یہ تو بتا کہ اور کی طرح تو مجھ سے کیسی انکوائری کر رہا ہے؟" جلبیر نے رنبیر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

ابھی ان دونوں میں یہ نوک جھونک کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران محلے کے ایک بچے نے کہا۔

"میں نے جلبیر بھائی کو کافی دیر پہلے اس دھوبی گھاٹ کی سامنے والی آبادی سے آتے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ گلابو بابو کا نواسہ سونہام بھی تھا۔

"سونہام تو بڑا آوارہ قسم کا لڑکا ہے"۔ رنبیر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ایک تھپڑ جلبیر کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے آرام سے فریدہ کے بارے میں حقیقت بتلاتا ہے یا میں اپنے طریقے سے سچ اگلواؤں"۔

"تجھے شرم نہیں آتی تو اپنے بڑے بھائی سے اس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے"۔ جلبیر شور مچانے لگا۔

"چاچا جی! یہ دیکھو رنبیر پاگل ہو گیا ہے۔ یہ مجھے محلے والوں کے سامنے تذلیل کر رہا ہے"۔

چاچا جی نے اس کی توقع کے خلاف جلبیر کو یہ جواب دیا کہ مجھے افسوس ہے کہ حالات، واقعات یہ بتلا رہے ہیں کہ تو کسی نہ کسی طرح فریدہ کو نقصان پہنچانے میں ملوث ہے۔ میرا خیال ہے رنبیر نے جس انداز سے فریدہ کی تلاش میں کھوج کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہ صحیح ہے۔

تھوڑی دیر بعد رنبیر نے سونہام کو اپنے بدمعاشوں کے ذریعہ زبردستی بلوا لیا۔ سونہام سہما ہوا سب کے سامنے آیا تو اسے رنبیر نے اپنے پاس بلا کر کہا۔ "سونہام! تو جو فریدہ کے بارے میں جانتا ہے وہ شرافت سے بتلا دے۔ اگر تو نے کوئی رتی برابر بھی جھوٹ بولا تو یاد رکھ میں تیرے یہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا"۔

سونہام کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی تو اس نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بھگوان کے واسطے آج اس ذرائی کو اتنا مارو کہ یہ مر ہی جائے۔ اس نے مجھے اتنا ستایا ہوا ہے یوں سمجھو کہ اس نے میرا خون پیا ہوا ہے"۔

سونہام کے منہ پر رنبیر نے ایک زوردار تھپڑ مارا تو اس نے زبان کھول دی اور یہ دل ہلانے والی بات بتلائی۔

"جلبیر نے مجھے پچاس روپے دیئے تھے اور کہا تھا کہ فریدہ کو مولسری کے گھر سے بلا کر کہنا کہ اسے پوکھن بلا رہی ہے۔ جب فریدہ باہر آ جائے تو اسے یہ کہنا کہ وہ دھوبی گھاٹ کے باہر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے"۔

سونہام کی تصدیق کے بعد رنبیر نے جلبیر کے گریبان کو سختی سے پکڑ کر بالکل زخمی شیر کی مانند چلاتے

ہوئے کہا۔

''بتا کدھر ہے فریدہ؟'' بلبیر نے خود کو رنبیر کی گرفت میں پا کر بالکل بھیگی بلی کی مانند بے بس محسوس کیا۔ اس کا جرم عیاں ہو گیا تھا۔

پتا جی نے اس کے قدموں پر بیٹھ کر بچوں کی طرح روتے ہوئے پوچھا کہ بھگوان کے واسطے بتا فریدہ اس وقت کہاں ہے؟ اور تو نے ایسا کیوں کیا؟

بلبیر نے وہاں سچ سچ بات بتلائی کہ مجھ سے پاکستان بننے کا غصہ بالکل بھی برداشت نہ ہوا تھا۔ مجھے چچا رحمت سے اس وقت محبت تھی جب وہ متحدہ ہندوستان میں ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے فریدہ کو اس ویران دھوبی گھاٹ میں موتو بدمعاش کے ٹرک میں ورغلا کر اغوا کروا دیا ہے۔

''اوئے تیرا بیڑہ غرق''۔ رنبیر نے فوراً اپنے بدمعاشوں کو کہا۔ ''چلو میرے ساتھ موتو بدمعاش کو پکڑتے ہیں''۔ رنبیر دھاڑتا ہوا اپنے بدمعاشوں کے ساتھ موتو کو ڈھونڈنے گیا۔

وہ چلا گیا تو پتا جی نے اپنے قریب کھڑے ایک شخص سے کرپان لی اور شدید غصے کے عالم میں کرپان بلبیر کے پیٹ میں گھونپ دی اور پھر غصے سے کانپتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا خون اتنا گندا ہو سکتا ہے۔ اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

پتا جی نے بلبیر کو وہیں ختم کر دیا۔ بلبیر کے قتل کے بعد کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آئی انہوں نے پتا جی کو بیٹے کے قتل کے جرم میں پکڑ لیا۔

وہاں موجود مجمع کے چند مخلص لوگوں نے یہی کہا کہ رنبیر فریدہ کو لے کر آنے والا ہی ہو گا۔ لہٰذا فی الحال تم اپنے گھر جاؤ۔

چنانچہ ہم گھر لوٹ آئے۔

وہاں چچی ''فریدہ، فریدہ'' چلا رہی تھی.... جبکہ چچا مسلسل اپنے اللہ سے دعا مانگتے جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ بتا ظالم میری فریدہ کہاں ہے؟ میرے پاس ان کے سوال کا جواب نہ تھا۔ شام تک محلے کے لوگ ہمیں فریدہ کے سلسلے میں تسلی دینے آتے رہے۔ ہمارے گھر میں چند پڑوسی اور سہیلیاں بھی موجود تھیں۔

رنبیر کو موتو بدمعاش کے پیچھے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ ہم سب انتہائی پریشانی کے عالم میں بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ نیز ہمیں پورا یقین تھا کہ وہ لازماً فریدہ کو لے کر آئے گا لیکن ہماری ساری امیدیں اس وقت بیکار ثابت ہوئیں جب ہمیں ایک اور قیامت خیز اطلاع ملی کہ رنبیر اور اس کے دو ساتھیوں کو موتو کے ساتھیوں نے فریدہ کے حصول کی کشمکش کے دوران بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ باقی چار لڑکے شدید زخمی ہیں۔

ہمیں یہ اطلاع ہمارے علاقے کے ایک تھانیدار نے سنائی۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد رنبیر کی اور فریدہ کی لاش بھی قریبی علاقے سے مل گئی۔

چچی نے فریدہ کی لاش دیکھی تو انہوں نے وہیں اپنا دل پکڑ لیا اور دل کا دورہ پڑنے سے دنیا چھوڑ گئی۔

یہ فریدہ کی گمشدگی کے پس منظر میں چوتھی ناگہانی موت تھی جبکہ پتا جی بلبیر کو قتل کرنے کے جرم میں جیل میں تھے۔ میں نہ جانے کیوں خود کو اس دل خراش واقعہ کا ذمہ دار تصور کر رہی تھی۔ ایک طرف میں اپنے نصیبوں اور اپنے گھر والوں کی ناگہانی موت پر رو رہی تھی تو دوسری جانب میں چچا رحمت اور فرحان کے قدموں میں گر گر کر فریدہ کی بلبیر کے ہاتھوں بربادی اور موت کی معافی مانگ رہی تھی۔

چچا الٹا مجھے گلے لگا کر کہہ رہے تھے کہ بیٹی یہ فریدہ کی شہادت اور چچی کی موت پاکستان بنانے کی قربانی کی

ایک شکل تھی۔ اللہ وا یے ہی منظور تھا۔ میں ان کا اللہ پر یہ یقین اور صبر وتحمل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ یقیناً اسلام سچا مذہب ہے۔ اس سچے مذہب کے ماننے والوں میں ہی اتنا مضبوط اعتماد ہو سکتا ہے۔

چند روز بعد جب تقسیم کے واقعات رنبیر، بلبیر، چچی، فریدہ کی زندگیوں کو نگل گئے اور چاچی جل چلے گئے، چچا رحمت اور فرحان کے آنسو بھی اپنوں کو روتے روتے سوکھ گئے تو ہمیں کسی حد تک صبر آیا۔ تو ہمارے محلے کے چند ہمدردوں نے مشورہ دیا رحمت تم پاکستان جانے والی سپیشل ٹرین کے ذریعے ہجرت کی تیاری پکڑو۔

چچا رحمت، فرحان پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ میں ایک طرف دیوار سے لگی فریدہ کے اغوا، موت کے واقعات کو رونما ہونے کے بعد سوچ رہی تھی کہ اب میرا کون یہاں رہ گیا ہے؟ میرا کیا بنے گا؟

فریدہ کی یاد، چچا رحمت، چچی، فرحان کی جدائی میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس ناطے کو کسی صورت میں توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

چنانچہ میں نے سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا۔ میں اداس، چچا رحمت کے پاس گئی اور ان سے کہا۔

چچا آپ پاکستان ہجرت کر رہے ہیں، آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔ انہوں نے کہا۔

''بیٹی! میرے بس میں ہوا تو میں تیری خواہش کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں''۔

میں نے ان کے قدموں میں سر رکھ کر کہا۔ ''آپ کے سامنے اپنی آخری خواہش بیان کروں گی۔ اگر آپ کو قبول ہوا تو میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں ورنہ اپنا ہاتھ ہوا میں معلق کر کے اسے کھینچ لینا''۔

انہوں نے پر تجسس انداز میں کہا کہ بیٹی تو ایسے امتحان میں مجھے کیوں ڈالتی ہے؟

میں نے ان کے قدموں پر بیٹھ کر کہا کہ چچا اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا آپ مجھے اپنی بہو بنائیں گے۔

میرے ان الفاظ سے وہ ایک لمحے کے لئے چونکے پھر انہوں نے کہا۔ ''بیٹی! تم جذبات میں آ کر مذہب نہ بدلو''۔

میں نے روتے ہوئے کہا کہ نہیں چچا رحمت یہ میرا جذباتی فیصلہ نہیں ہے، میں واقعی دل سے مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے۔

چچا رحمت نے مجھے کہا کہ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔ میں نے انہیں بڑے وثوق سے کہا کہ میں دل سے مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے اپنے قدموں سے اٹھایا اور گلے لگا کر اتنا پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔

انہوں نے مجھے کہا کہ مجھے بہو نہیں بلکہ تمہاری صورت میں بیٹی مل گئی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے مسلمان ہونے کی پہلی شرط کے طور پر کلمہ پڑھایا اور فرحان کے لئے اپنی بہو تسلیم کر لیا۔

مختصر یہ کہ میں، چچا رحمت اور فرحان پاکستان آ گئے۔ یہاں لاہور والٹن میں میرا بڑا سادگی کے ساتھ فرحان کے ساتھ نکاح پڑھا دیا گیا اور میں شوبا سے سکینہ بن گئی۔ میں مرتے دم تک وہ ایک لمحہ نہیں بھول سکتی جب میرے دل نے ایک سچے مذہب کو پہچانا تھا۔

چچا رحمت فریدہ کی یاد میں پاکستان آ کر بیمار ہو گئے، انہوں نے مرتے وقت فرحان کو وصیت کی تھی کہ وہ ہمیشہ میرا خیال رکھے۔

فرحان اس وصیت پر تاحیات قائم رہا جو اس کی مجھ سے محبت کی دلیل ہے۔

●★●

مولوی کی بیٹی

تم مولوی کی بیٹی نہیں تو کیا ہوا مولوی کی بیوی بن جاؤ میرا بھائی بھی مولوی ہی ہے۔

☆ رُحنا شاہد

گھر سے کچھ دور گلی میں داخل ہونے سے پہلے تمنا نے بڑی احتیاط سے بیگ سے برقعہ نکال کر اوڑھا اور نقاب کرتے ہوئے گلی میں داخل ہوگئی۔ شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں اس نے یہ شکر کی ادا کی پتہ نہیں اللہ کو دی تھی کہ شیطان کو۔ اسے شاید خود بھی معلوم نہ تھا۔ گھر کی سے گلی زارا نے یہ منظر اپنی آنکھوں نے دیکھا (وہ آج کالج سے جلدی گھر آ گئی تھی) اور یہ تو تمنا کے معمول کی بات تھی ایک ہی کالج میں ہونے کی وجہ سے وہ ہر روز تمنا کو برقعے سے کھلتے دیکھتی اور خاموشی کا لبادہ اوڑھے رکھتی۔ دونوں کی سوچ کی اڑانیں مخالف سمتوں میں رواں دواں رہتیں۔

زارا طیب کو محلے کا ہر نوجوان دیکھنے سے بھی گریزاں رہتا وجہ اس کی بدصورتی نہ تھی اور اس کی شرافت بھی نہ تھی پھر؟ زارا کے بھائی کا محلے میں بڑا رعب تھا وہ اس محلے کا نامی گرامی بدمعاش جو تھا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی بڑا نام کمایا تھا اور اس کمائی نے اس کی ماں کو بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ اتنی کاری کہ وہ دنیا سے ہی رخصت ہوگئی۔ زارا اپنی ماں کی بیٹی بننا چاہتی وہ باپ اور بھائی کی دنیا سے نفرت اور لاتعلقی دکھانے کے باوجود انہی کے نام اور رعب سے جانی پہچانی جاتی۔

تمنا کے ساتھ معاملہ ذرا ہٹ کر تھا اور وہ مولوی صاحب کی بیٹی تھی اس لئے اسے بچپن سے ہی عزت اور سعادت میسر تھی۔ مگر جوانی کی راہ پہ قدم دھرتے دھرتے یہ عزت دھری کی دھری رہ گئی اور تمنا کے لئے یہ گھٹن اور فرار کا راستہ لے آئی۔

گھر کی دہلیز کے پار کرتے ہی یہ عزت روند دی جاتی اور وہ اپنی خواہشات نفس کی اڑان کو خوب ڈھیل دیتی اور اس ڈھیل کے سائے تلے کئی نوجوان ٹھنڈی آہیں بھرتے اور مرادوں والی مراد پا لیتے۔

کالج میں داخل ہوتے ہی تمنا باتھ روم میں گھس جاتی اور جب باہر آتی تو ایک نئی تمنا سامنے ہوتی۔ ٹائٹس، ناپ اور دوپٹے ندارد، برقع کسی بدنصیب کی بددعا کی طرح بیگ کے کسی کونے میں منہ چھپا کے رو دیتا۔ اپنی ہی جیسی بے فکر اور آزاد خیال لڑکیوں کے ساتھ قہقہے لگاتی وہ زارا کو دیکھ کر تمسخر سے ہنستی جیسے اس کی چادر کی آڑ میں چھپی شرافت کو اس کے باپ اور بھائی کی بدمعاشی کا طعنہ دیتی اسے خاموش رہ جانے کا اشارہ کرتی۔ ماحول اور تربیت کا یہ تضاد بڑا ہی حیران کن تھا اور زارا کی شرافت اور جھکی نگاہیں بھی اس کا پردہ رکھنے سے گریزاں رہتیں اور اور تمنا کی دیدہ دلیری اور انتہا پسندی اس کا پردہ کیے رکھتیں۔ گواہی اور شہادت کی انتہا تو خدا کی ذات ہی تھی اس نے اس پردے کا راز اپنی رضا کے مطابق مقررہ وقت پر ہی فاش کرنا تھا۔

کبھی کبھی زارا کا دل مر جانے کو چاہتا وہ سوچتی آخر وہ ایسے گھرانے میں کیوں پیدا ہوئی؟ آخر اس میں خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ اولاد ہمیشہ ماں باپ کا پرتو نہیں ہوتی یہ تو آزمائش ہے ہو کر بھی اور نہ ہو کر بھی اور کبھی کبھی ماں باپ کا انتخاب بھی تو اولاد کے اختیار کی حد سے باہر ہی ہوتا ہے۔ اولاد کو رلاتا، جلاتا اور ستاتا رہتا ہے۔

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا اور زارا خدا کی مصلحت کو اپنی عقل کی حدود سے بالاتر سمجھتی اسے قبولتی رہی۔

کالج کی لڑکیاں زارا کو مولوی کی بیٹی کہہ کر چھیڑتیں اس کا حلیہ ہی ایسا تھا اس کے انداز و اطوار اس کے خاندانی پس منظر کو دھندلا دیتے تھے۔ مگر زارا کو یہ طعنہ بہت بھلا لگتا یوں محسوس ہوتا کہ جلتے ہوئے صحرا میں سے اچانک کہیں سے بادل کا ایک ٹھنڈا میٹھا ٹکڑا اس کے سر پر آن سایا ہو۔

تمنا یہ سن کر ہنستی مگر اس طعنے کی تردید نہ کرتی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان ایک دوسرے کا پردہ رکھنے کا معاہدہ طے پا چکا تھا۔ تمنا کی گھٹن زارا کی رہائی بن چکی تھی۔

کالج کی دنیا دونوں کے لیے انوکھی اور من پسند کھلونے جیسی تھی جسے پانے کے لیے دونوں مچل جاتیں۔ یہاں ان کے خاندانی نسب و حسب کی تلوار انہیں کاٹتے ہوئے نہ گزرتی، یہاں ان کا اپنا حسب اور حساب تھا۔ یہاں ان کا اپنا نسب اور نصاب تھا۔ تضادات کی دنیا نے سکون کی راہیں ہموار کر رکھی تھیں۔ ایک بظاہر اور ایک باطن بہت دور تک۔

زارا خواہش کرتی کہ قیامت کے دن وہ ماں کے نام سے ہی پکاری جائے اور اس کی ذات کا غرور سلامت رہ جائے۔ باپ کا نام فقط دنیا اور تعلیمی کوائف تک ہی رہ جائے تو احسان ہو جائے۔

تمنا کے لیے مولوی کی بیٹی ہونا ایک گھٹن کا احساس بن چکا تھا۔ اور یہ گھٹن اتنی بڑھ گئی کہ اس نے باہر کا راستہ دیکھ لیا۔ حدود کا توازن زندگی کا حسن ہے اور یہ حسن مذہب اسلام نے بڑی خوبصورتی سے بنا اور سجا رکھا ہے اور یہ اور بات کہ انسان اپنی حدود کا تعین خود کرنے میں بڑی شیطانی لذت محسوس کرتا ہے لیکن یہ لذت اسے تباہی کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ زارا کے بھائی کو تو اندھی گولی کھا گئی اور تمنا کو اس کی تمناؤں نے تباہی کے دھانے کی طرف دھکیل دیا۔

گھر کی دہلیز سے نکلے قدموں کی آہٹ اور بندوق سے نکلی گولی صرف تباہی ہی مچاتی ہیں۔ تمنا خوشیوں اور آزادی کے راستے کو چننے کے لیے نکلی تو کبھی پلٹ کر نہ آئی۔ مولوی صاحب اس رسوائی کا بوجھ نہ سہہ پائے اور خدا کی رضا بھی ان کے ساتھ تھی سو اپنے پاس بلا لیا۔ مولوی صاحب کی بیوہ باقی ماندہ اولاد کو لے کر کہاں گئیں، کسی کو خبر نہ ہو سکی۔

واقعات نے حالات بدل دیے تھے، شرافت منہ چھپائے روتی اور بے حیائی تاک جھانک کرتے نہ تھکتی۔ زارا اپنے مستقبل سے خوفزدہ رہتی اگر اس کے نام نہاد باپ

کا سایہ بھی اس کے سر سے اٹھ گیا تو وہ کہاں جائے گی؟

زارا کا باپ اپنے ماضی کی پرچھائیوں کو حال اور مستقبل میں پڑتے دیکھتا رہتا اور تڑپتا رہتا ہوئے بھی وہ اب پشیمان تھا شاید یہ پشیمانی اپنی کمزوری، بیوی اور بیٹے کی موت اور جواں سال بیٹی کے گھر بیٹھنے کے باعث تھی یا خوف خدا کا تحفہ اس کی روح تک آن پہنچا تھا۔ واللہ اعلم!

ایک دن زارا کی دوست تانیہ اس کا گھر پوچھتے ہوئے وہاں آ پہنچی اور اس کا مقصد جان کر زارا ششدر رہ گئی وہ اپنے بھائی کے لئے اس کے رشتے کی طالب تھی۔

اس نے تانیہ کو اپنے خاندانی پس منظر سے آگاہ کرتے ہوئے معذرت طلب کی اور تانیہ خاموشی سے لوٹ گئی اور یہ خاموشی اور جمود تو اب زارا کا مقدر بن چکا تھا جسے اس نے پتہ نہیں کب تک سہنا تھا لیکن وہ مایوس نہیں تھی۔ اس کی ذات کا سکون اس کے چہرے سے عیاں ہوتا اور یہی اس کے لئے خدا کی رضا اور قبولیت کی انتہا تھی۔

انہونی کو محسوس کرنا انسانی فطرت ہے اللہ کے لئے کوئی بات انہونی نہیں مگر مایوسیوں میں گھرے انسان کے لئے ہر نئی امید اور روشنی انہونی ہوا کرتی ہے جیسے تانیہ کو دوبارہ اپنے دروازے پر دیکھ کر زارا کو محسوس ہوئی وہ اس خدا کی ذات کی عنایت کی انتہا تھی کہ تانیہ کے گھر والے اس کو بہو بنانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے یہ اس کی ماں کی شرافت اور دعاؤں کا اجر اور اس کی نیک نیتی تھی جو اسے دنیا میں سرخروئی ملی تانیہ نے ہنستے ہوئے اسے کہا۔

”تم مولوی کی بیٹی نہیں تو کیا ہوا مولوی کی بیوی بن جاؤ میرا بھائی بھی مولوی ہی ہے۔ ویسے مولوی کا مطلب اللہ کو ماننے والا ہوتا ہے یہ گالی نہیں سعادت ہے۔ ہاں اسے کچھ مفاد پرست اور منافق لوگوں نے بدنام کر رکھا ہے۔“

اور زارا کا دل اس خوشی کی انتہا پہ مسکرا اٹھا۔

☆○☆

اوہو جی، اب کام نکالنے کے لیے اسے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ کوئی نیا کام تو نہیں کرے گی نا...... ساری عمر یہی کچھ کرتی رہی ہے اور خوشی خوشی کرتی رہی ہے۔ بس اتنا ہی فرق پڑے گا کہ توبہ چند دن کے لیے ملتوی کرنا پڑے گی، اب دیکھیے نا......

توبہ

☆ مسعود مفتی

انتخاب: دستگیر شہزاد

''سردار اورنگزیب آئے ہیں''۔ ملازم نے اندر آکر اطلاع دی۔

میں باہر ۔ ۔ میں آیا تو خوش شکل، خوش وضع، خوش لباس اور خوش مزاج اورنگزیب اٹھ کر گلے ملا۔ خوش قد و قامت، طیب سیرت اور مزاج کی سی خوشی اور مسکراہٹ میں ڈبکیاں کھاتی رہیں۔ یہ خوش گپیوں کا ریلا بہہ نکلا۔

سردار اورنگزیب کا تعلق وسطی پنجاب کے ایک بڑے جاگیردار خاندان سے تھا۔ وہ کالج کے زمانے میں میرا ہم جماعت تھا۔ بعد ازاں عمر بھر دوستی رہی۔ وہ متمول زمیندار کا چڑھا لکھا مگر فارغ بیٹا رہا۔ شکار، مجلس، گپ بازی اور فارغ زمینداروں کے دیگر مشاغل میں گھرا رہتا تھا۔ میں اپنی ملازمت کے دوران میں جہاں بھی تعینات ہوتا، اس کے آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اب میرے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ پہلی دفعہ آیا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد خود سردار کہلاتا تھا۔

بات میری ریٹائرمنٹ سے چل کر مستقبل کے پروگرام کی طرف بڑھی تو میں نے کہا۔ ''فی الحال تو آئندہ سال حج کا پروگرام بنا رہا ہوں، باقی دیکھا جائے گا''۔

''اوہ یہ تو بہت اچھا ہے۔ آئندہ سال میرا بھی یہی پروگرام ہے۔ چلو سنگت رہے گی''۔ پھر وہ بولتے بولتے اچانک یوں رک گیا جیسے کسی تیراک کی ٹانگ کو نیچے سے مگرمچھ پکڑ لے۔

''اچھا تو واقعی ہے۔ مگر اس میں سوچنے والی کیا بات ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''یار! پتہ نہیں پروگرام بنتا ہے یا نہیں''۔

''تو بنا لو نا!''

''میں تو بنا رہا ہوں''۔ وہ کہنے لگا۔ ''مگر ایک عجیب سا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ سوچتا ہوں ملتوی کر دوں ۔۔۔ مگر یہ کوئی حل نہیں۔ خطرہ ہے کہ مسئلہ بھی اتنا ہی ملتوی ہو جائے گا''۔

میرے استفسار پر پہلے تو وہ ٹالتا رہا پھر تھوڑی دیر بعد دوران گفتگو خود ہی پوچھنے لگا۔ ''تم اختری بائی کو جانتے ہو؟''

''نہیں، جانتا تو نہیں''۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''البتہ سنا ہے کہ تم اس کے کافی گرویدہ رہے ہو''۔

اب وہ ہنسنے لگا۔ ''وہ تو پرانی بات تھی، جب آتش جوان تھا۔ اسے ختم ہوئے بھی زمانہ گزر گیا''۔ پھر وہ وقفے کے بعد بولا۔ ''رنڈی بازی تو کھاتے پیتے زمینداروں کا کلچر ہے۔ اسے کوئی بھی برا نہیں کہتا۔ ان عورتوں کی زندگی کو روزی مل جاتی ہے اور ہماری زندگی کو رنگ مل جاتا ہے۔ ان کی بنیادی ضرورت ہمارا ثانوی شغل ۔۔۔ بس اس سے زیادہ تو کچھ نہیں نا اس میں''۔

''تو پھر آج کیوں یاد آ رہی ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یاد نہیں آ رہی بلکہ سر پر سوار ہے۔۔۔۔ وہی تو آج کل مسئلہ بنی ہوئی ہے''۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''اسے پتہ چلا کہ میں حج کا پروگرام بنا رہا ہوں تو وہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میرا ردعمل بالکل روایتی تھا۔ تعجب، استہزا، چہ نسبت خاک را باعالم پاک والی بحث ۔۔۔ رنڈی اور حج، توبہ توبہ نعوذ باللہ! میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ وہ منت سماجت کرتی رہی، میں مذاق اڑاتا رہا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئی کہ اگر تم حج کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ جو بُرا کام میں نے کیا ہے وہی تم نے بھی تو کیا ہے۔ کیا فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ میں نے کہا فرق تو تمہیں پتہ ہی ہے۔ میرا یہ پیشہ تو نہیں ہے نا۔ کہنے لگی پیشہ نہ سہی عمل تو ویسا ہی ہے نا۔ میرا پیشہ اس لئے ہے کہ میں کئی مردوں کے پاس جاتی ہوں۔ مگر تم بھی تو میرے علاوہ کئی عورتوں کے پاس جاتے ہو نا! میں اس لئے گنہگار ٹھہری کہ پیسے لیتی ہوں۔

تم اس لئے پاکباز رہے کہ پیسے دیتے ہو۔ تو یہ بتاؤ کہ گناہ کا تعین پیسہ کرتا ہے یا خدا کرتا ہے؟ اللہ کے کھاتے میں یا تو گناہگار ہیں یا پاکباز۔ وہاں زمیندار اور رنڈی کی کوئی تخصیص نہیں۔ میں پھر بھی انکار کرتا رہا تو رونے لگی کہ میں توبہ کرنا چاہتی ہوں اور خدا کے گھر میں کرنا چاہتی ہوں۔ رنڈی کے گھر میں پیدا ہونے پر تو میرا اختیار نہ تھا مگر توبہ کے لئے تو مجھے اختیار ہے نا! اور توبہ کے بعد یہ پیشہ چھوڑ دوں گی۔ بس یہ فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ میں تو حج پر توبہ کے بعد یہ دھندا چھوڑ دوں گی مگر تم رئیس ہو، حج کے بعد بھی یہی کچھ کرتے رہو گے۔ کیونکہ رنڈی بازی اور حج دونوں ہی تمہارے لئے شغل ہیں۔ میں پھر بھی انکار پر اڑا رہا تو مجھے کوسنے دینے لگی کہ اگر نہیں لے جاؤ گے تو ہر وقت بددعا دوں گی کہ خدا تمہارا بھی حج قبول نہ کرے۔“

مجھے ان دلائل کا مزہ لیتے دیکھ کر وہ بولا۔ ”تم ہنس رہے ہو اور مجھے اس کی یہی آخری بات کھا گئی ہے۔ اب دیکھو نا! دعا تو صرف نیک بندوں کی لگتی ہے مگر بددعا تو ہر ایک کی لگ سکتی ہے نا! میں لاکھ گناہگار سہی مگر خواہش تو میری بھی یہی ہے کہ میرا حج قبول ہو جائے“۔

پھر ہم مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بات کرتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ حج کا پہلا حق تو گناہگار ہی کا ہے تاکہ معافی مانگ سکے۔ نیکوکار تو صرف اپنا رنگ چوکھا کرنے جاتا ہے۔ اجلا تو پہلے ہی اجلا ہوتا ہے۔ صفائی کی ضرورت تو میلے کو ہے اور پھر یہ نماز کی طرح ایک فرض ہے۔ بشرط کفالت، اگر گناہگار کے نماز پڑھنے پر پابندی نہیں تو حج پر کیوں ہو؟ مگر وہ مجھ سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اصرار کر رہا تھا کہ اپنے ساتھ اس نجاست کو لے جا کر خانہ کعبہ کی بے حرمتی کیسے کروں۔

بالآخر کافی بحث کے بعد وہ کہنے لگا کہ وہ اسے ایک مرتبہ پھر سمجھائے گا کہ اپنے ساتھ لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ جان چھڑانے کے لئے اس کا اور اس کے محرم کا خرچہ برداشت کر کے انہیں علیحدہ حج پر بھیجا جا سکتا ہے۔

ابھی حج میں کافی مہینے باقی تھے اس لئے بات آئی گئی ہو گئی۔ کیونکہ اول تو اورنگزیب سے میری ملاقات ہی نہ ہوئی۔ دوسرے میرا اپنا پروگرام ہی کچھ گھریلو مسائل پر قربان ہوتا نظر آتا تھا۔ ریٹائرڈ آدمی سرکار کے آسمان سے گرتا ہے تو گھر کی کھجور میں اٹک جاتا ہے۔ وہ کبھی فراغت سے حسب سابق محروم ہی رہتا ہے۔

مگر کیا بندہ اور کیا بندے کے مسائل۔ حج تو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا ہوتا ہے۔ وہاں کے سامنے یہاں کی کیا مجال۔ میرے مسئلے چیختے چلاتے ہی رہے مگر حج کا ارادہ اور پھر پروگرام بھی پروان چڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ مئی 1996ء میں روانگی کی ساعت آن پہنچی۔ راولپنڈی میں حاجی کیمپ پہنچے۔ حکومتی پارٹی کے سیاسی کارکنوں کی دخل اندازی کی وجہ سے وہاں کی بدنظمی کا مرثیہ پڑھتے رہے۔ بعد از خرابی بسیار مقررہ دن اسلام آباد ائرپورٹ پر پہنچ گئے۔

باہر جہاز کے پنکھے دھیرے دھیرے گھومنے لگے، اندر اللھم لبیک کی قرأت کی لہر اٹھی۔ فوراً ہی تمام زائرین بھی شامل ہو گئے۔ جہاز کی دیواریں، کھڑکیاں، کرسیاں اور زائرین اس بھاری گونج میں ایسے ڈوبنے لگے جیسے گھاس پھونس، پودے اور درخت چڑھتے سیلاب میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ طیارہ زمین سے اٹھنے لگا تو یوں لگا کہ قرأت کی گونج چھت توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش میں اسے عرش کی طرف اٹھا رہی ہے۔ اے میرے رب میں حاضر ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔ اندر سے دلوں کا حال تو خدا ہی جانے مگر بظاہر پرجوش چہروں سے جذبے کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور سب ایک دوسرے کو تقدیس میں بھگو رہے تھے۔

آغاز سفر کی امید، جوش اور ولولہ قرأت کا غلغلہ بن کر جہاز کو اوپر اٹھاتے گئے اور جب پرواز ہموار ہوگئی تو زبانیں یا رکنے لگیں اور ہاتھ رواں ہوتے گئے۔ ہر طرف تسبیحیں، سپارے اور مناجاتیں چھا گئیں۔ یوں لگتا تھا، ثواب کی لوٹ مچی ہے اور ہر کوئی زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی فکر میں ہے۔

میں نے بازار سے خریدی ہوئی حج کی کتاب کھولی۔ کچھ دیر ورق گردانی کی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے عربی دعاؤں کے حوض میں پھینک دیا ہے۔ نظر اٹھانے کی دعا، انگلی ہلانے کی دعا، خانہ کعبہ میں پہلا قدم رکھنے کی دعا، میناروں پر نظر پڑنے کی دعا، وضو کی دعا، طواف کی دعا، شاید دعا کی بھی دعا۔ اور سب عربی میں۔ کیا خدا صرف ایک ہی زبان سمجھتا ہے؟ میری پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی اور اردو نہیں سمجھتا؟ پھر یہ دعائیں بھی تو کسی اور نے لکھی ہیں۔ میری تمنا کیا اَن کہی ہی رہ جائے گی؟ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے داڑھی والے حاجی سے سرگوشی میں پوچھا۔

وہ منہ سے تو نہیں بولے مگر مجھے اس قدر گھور کر دیکھا کہ گھر کی بھی گویائی تن گئی۔ میرے دل میں تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والی عقیدت پر خفت سی چھانے لگی۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ تو میرے اور ان کے ایمان کے سانچے کا بنیادی فرق ہے۔ شاید ہمارا حج ایک جیسا نہیں ہوگا اور ہم دونوں ہم سفر ہونے کے باوجود شاید ہم منزل نہ ہوں۔ میں نے کتاب انہیں دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ رکھ لیجئے، میں تو ساری دعائیں اپنی مادری زبان میں پڑھوں گا۔ اپنی طلب کو میں خود نہ سمجھا تو دینے والا کیسے سمجھے گا۔ میں تکلیف بھی اٹھاؤں، خرچ بھی کروں، وہاں بھی پہنچوں اور پھر بھی اس سے ہم کلام نہ ہوسکوں تو حج کیا ہوا؟“

وہ بدستور مجھے گھورتے رہے بلکہ اس کی کاٹ تیز ہوگئی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ میری کتاب پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہوتی گئی اور زیرِ لب بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ”لاحول ولا قوۃ“۔

جدہ ائرپورٹ اور جدہ مکہ روڈ پر سیمنٹ اور لوہے کی جدید عمارتی تعمیر تو بیسویں صدی کی تھی مگر انسانی کارکن پندرھویں صدی کے ہی تھے۔ ان کی بدنظمی، نااہلی، تساہل اور غیر ہمدردانہ رویوں کی مار سہتے سہتے جہاز سے اترنے کے کوئی تیرہ گھنٹے بعد ہم مکہ کے ایک ہوٹل کی آٹھویں منزل میں سات فرشی بستروں والے کمرے میں پہنچے تو جان میں جان آئی۔ یعنی جان بچ گئی تھی۔

حج میں ابھی نو دن باقی تھے۔ منزل پر پہنچ کر بھی منزل کا انتظار تھا اس لئے خانہ کعبہ میں نمازیں، طواف اور عبادت روز کا معمول تھے۔ زائرین کی دھڑا دھڑ آمد سے حرم شریف، ہوٹل، بازار، گلیاں اور کوچے ہر آن بھرتے ہوئے امڈتے جارہے تھے۔ انبوہ بین الاقوامی تھا مگر منتظمین کی زبان صرف عربی تھی۔ نہ تو کسی جگہ بورڈوں پر نقشے یا ہدایات دیگر زبانوں میں درج تھیں نہ ہی کسی ملک کو خانہ کعبہ کے قریب اپنے باشندوں کے لئے رابطہ کیمپ لگانے کی اجازت تھی۔ چنانچہ تمام اطلاعات سینہ بہ سینہ سرگوشیوں یا افواہوں کی صورت میں ملتی تھیں۔ چنانچہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، جملہ انتظامات بڑھتے ہوئے ہجوم کے سیلاب میں ڈوبتے گئے اور اس کے طاقتور، منہ زور اور بے قابو ریلے اپنی من مانیاں کرنے لگے۔ خدا کی عبادت کا ماحول غائب ہونے لگا اور زیادہ تر زائرین میں اپنی بقا اور تحفظ کا خوف محض اپنی ذات کی عبادت بننے لگا۔

جمعہ کی نماز کے لئے حرم شریف میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ آسوں اور مرادوں کے طالب، ثواب کے متلاشی اور ہر درجے کے ایمان والے جسم سپردگی بن کر ادب سے قطار اندر قطار بیٹھے تھے۔ درمیان میں جابجا

فقیر بھیک مانگ رہے تھے۔ معذور فقیر اپنی اپاہجی کی نمائش اور عورتیں گود کے بچوں کو اٹھا رہی تھیں۔ فقیر دنیا کے ہر گوشے میں جاہل امت مسلمہ کے نشان خصوصی ہیں، حرم میں کیسے نہ ہوتے۔ اپنی بیگم کو عورتوں کے ایک گروپ میں چھوڑ کر میں ادھر ادھر بیٹھنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا تھا کہ مانوس آواز میں اپنے نام کی پکار سنی۔ چند گز دور اورنگزیب ہاتھ ہلا رہا تھا۔

جماعت ختم ہوئی تو اورنگ زیب گلے ملتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”کیسا لگا تمہیں یہاں آ کر؟“

”بہت اچھا بلکہ بہت ہی اچھا... اس لئے کہ یہاں ہر طرف مذہب کا چرچا تو ہے مگر مذہب کا ٹھیکیدار کوئی نہیں، جو سر پر سوار ہو کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے۔ یہاں جس کا جیسے دل چاہتا ہے عبادت کرتا ہے اور پاکستان کے برعکس یہاں اسلام خطرے میں نہیں پڑتا۔“

اورنگ زیب ہنسا۔ ”یوں لگتا ہے کسی شرطے نے تمہارا کیمرہ نہیں چھینا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ حالانکہ بازار میں سب تصویریں کھنچ رہی ہیں۔“

”شرطے والا کام تو دروازے پر ہی ہو جاتا ہے نا۔ میں تو اندر کی بات کر رہا تھا... اندر سے حرم شریف واقعی اللہ کا گھر ہے۔ یہاں کوئی بھی عقیدوں پر دست درازی نہیں کرتا۔“

اورنگ زیب ایک دن پہلے پہنچا تھا۔ بااثر جاگیردار تھا اس لئے پاکستان ہاؤس ٹھہرا تھا۔ جاگیرداروں کا اثر و رسوخ پاکستان کے خون میں ایسا رچا ہے کہ پاکستان ان کی جاگیر بن گیا ہے۔ کہنے لگا۔ بہت مزے میں ہوں۔ بڑا آرام ہے۔

میں نے اپنی قیام گاہ کا پتہ ڈھونڈنے کے لئے بٹوہ نکالنا چاہا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ جب میں دو فرض نماز ... رہا تھا تو کوئی میرے بٹوے کی نیت کر گیا۔ واقعی حرم شریف میں کوئی روک ٹوک نہیں، سوائے اس عہد کے جو بندہ خود خدا سے کرے۔

”چلو میں تمہیں ملنے آؤں گا تو اپنا پتہ دے دوں گا۔“

اتنے میں گھورنے والے زائر ہمیں آن ملے۔ گرمجوشی سے علیک سلیک ہوئی۔ وہاں کے شب و روز پر کچھ تبصرے، کچھ اطلاعات اور کچھ افواہوں کا تبادلہ ہوا اور وہ چلتے چلتے کہتے گئے۔ ”میں نے اس مسجد کے لئے بھی ابھی دو نفل پڑھے ہیں۔ آپ بھی پڑھ لیجئے۔“

میری سوالیہ نظریں بے اختیار کالے غلاف والے چوکور خانۂ خدا کی طرف اٹھ گئیں۔ کیا سرتاپا حاضری اور حضوری کے بعد بھی لفظوں کی ضرورت ہے؟ خدا نے حسب معمول کوئی جواب نہ دیا۔ ایک دفعہ عقل جو دے دی ہے، خود ہی جواب ڈھونڈتی رہے گی۔ البتہ عقل کی اپنی گونج ابھری کہ عبادت بے شک خدا کی ہدایت ہے مگر عبادت کی شدت بندے کی اپنی ضرورت ہے۔ بقول غالب بھی یہ تکرار تمنا ہے اور کچھ درماندگی شوق تراشے ہے پناہیں... محدود خدا نے ایک بندہ بنایا۔ محدود بندے نے بندگی کے کئی روپ بنا ڈالے۔ محض اپنی حد بڑھانے کے لئے۔

کبھی آپ نے کسی عمارت کو مسکراتے دیکھا ہے؟

کبھی نہیں... مگر میں نے اس روز دیکھا۔ عقل کے اس استدلال پر کالے غلاف کی سادی سنہری کشیدہ کاری ایک مسکراہٹ بن گئی۔ ایک شفیق مسکراہٹ۔ بچے کی نادانیوں پر مشفق والدین والی مسکراہٹ۔ ”اسے کیا پتہ ہے“ والی مسکراہٹ۔ ”جو کرے سو منظور“ والی مسکراہٹ۔

گھورنے والے زائر کو جواب دینے کے لئے میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ ہجوم میں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے پھر سوچا کہ ہماری منزلیں مختلف ہیں۔

دو دن بعد میں اورنگ زیب سے ملنے چلا گیا۔

پاکستان ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز وہ سرگوشیوں میں بول رہا تھا۔ ''ہاں، وہ آ گئی ہے..... اپنے کسی محرم کے ساتھ۔ میں اپنے ساتھ تو نہیں لایا مگر قریب والے پاکستان ہاؤس نمبر 2 میں ٹھہرایا ہے۔ اس کی وجہ سے میں بیوی کو بھی اپنے ساتھ حج پر نہیں لایا۔ خواہ مخواہ کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے ..... میں بھی بہت پریشان ہوں۔ ہر وقت دل ڈرتا رہتا ہے۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہیں گے!''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم اس لئے پریشان ہو کر اس کا ماضی جانتے ہو مگر ہمیں کیا پتہ دنیا بھر کے ہر کونے سے آئے ہوئے لاکھوں لوگوں میں سے ہر ایک کا ماضی کیا ہے۔ یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اب وہ جانے اور اس کا کام۔ اب وہ براہ راست خدا کے حضور میں پہنچ گئی ہے۔ تم ان دونوں کے بیچ میں نہ آؤ اور اپنا حج کرو۔''

وہ غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ ''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اس نے بھی یہاں آ کر مجھ سے کوئی خاص رابطہ نہیں رکھا۔ میں تو صرف نماز کے لئے حرم شریف جاتا ہوں مگر وہ کم و بیش سارا وقت ہی وہاں گزارتی ہے۔ رات کو بھی یہاں نہیں آتی۔ میں نے میانہ روی کی ہدایت کی تو ہنس کر بولی کہ مجھے تو خود حرم والے نے پیدا ہی راتوں کے لئے کیا تھا۔ میں وہ کمائی بھی رات کو کرتی تھی۔ اب یہ کمائی بھی رات ہی کو کروں گی''۔

اگلے دن حرم شریف میں ظہر کی نماز کے بعد ہم مقام ابراہیم کے پاس بیٹھے تھے۔ میری بیگم کے علاوہ تین چار مرد اور عورتیں تھیں جو ہمارے گروپ میں شامل تھیں۔ طواف کرنے والوں کا ریلا چکی کے پاٹ کی طرح ہمارے سامنے سے قوس کی شکل میں گھوم جاتا تھا اور میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ ہر گزرنے والے چہرے کا تاثر مختلف ہے۔ کہیں جذب، کہیں احترام، کہیں خلوص، کہیں عجز، کہیں عقیدت، کہیں وارفتگی، کہیں سوز، کوئی بالکل ڈوبا ہوا، کوئی محض سنجیدہ، کوئی رسم زدہ اور کوئی اوپرے دل سے ہونٹ ہلانے والا۔ وہاں عورت عورت نہ تھی، مرد مرد نہ تھا فقط تاثر بھرے چہرے تھے۔ مغرب کا آج کل کا یک جنسی (Uni-Sex) تصور وہاں صدیوں سے طواف کر رہا تھا۔ شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی، بریلوی سبھی اپنی شناخت کھو کر فقط اہل طواف رہ گئے تھے۔

گھورنے والے حاجی نے اپنا طواف ختم کیا تو ہمیں بیٹھا دیکھ کر سیدھے ادھر ہی آ گئے کیونکہ اب وہ ہمارے دوست بن چکے تھے۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر وہ بھی طواف کرنے والوں کو دیکھنے لگے جیسے وہ سب انسان نہ ہوں کوئی اور ہی مخلوق ہو۔ پھر وہ ایک دم بول اٹھے۔ ''ابھی میں نے ایک عورت کو طواف کرتے دیکھا تو یوں لگا کہ میرا طواف بالکل مصنوعی ہے اور صرف اسی کا اصلی ہے۔ اس کا ہر قدم، ہر بول اور انگ انگ عجیب سے سوز میں ڈوبا ہوا تھا جیسے ایمان میں لتھڑی ہوئی ہو۔ مجھے تو ہی کوئی اللہ والی لگتی تھی۔ گورا چٹا نورانی سا چہرہ اور ادھ کھلی جھکی آنکھیں۔ کئی دفعہ طواف کے دوران اونچی آواز میں رونے بھی لگتی ہے۔ وہ دیکھیں ابھی ادھر ہے اس کنارے پر تھی۔ اب پھر ہجوم میں گم ہو گئی ہے۔ اچھا ابھی دکھاؤں گا آپ کو اگر نظر آ گئی تو۔ توبہ توبہ، کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی شے لگتی ہے۔ وہ دیکھئے وہ!''

ہم سب گردنیں لمبی کر کے دیکھنے لگے۔ وہ نشانیاں بتاتا رہا۔ ''وہ کالے حبشی کے ساتھ ساتھ وہ دیکھیں وہ بے دم سی ہو کر کنارے کی طرف آ رہی ہے۔ وہ تھک کر بیٹھ رہی ہے۔''

اسے بیٹھتے ہی سب نے دیکھا اور اٹھ اٹھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ اتنے میں زائرین کی بھیڑ میں سے نہ معلوم اور نگ زیب کہاں سے نمودار ہوا۔ آگے بڑھ کر اس عورت کو تھاما۔ دھیرے دھیرے اٹھایا اور

سہارا دے کر برآمدے کی طرف جانے لگا۔

میں اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا تھا مگر دل ہی دل میں حیران ہوتا رہا کہ آیا یہ وہی تھی۔

میری بیوی جو اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی اور غور سے دیکھ رہی تھی، ایک دم سے بول اٹھی۔ ''اسے تو میں پہلے بھی دیکھتی رہی ہوں، یہاں نمازیں پڑھتے پڑھتے... زیادہ تر باب فہد میں ہوتی ہے۔ بہت لمبے لمبے سجدوں میں دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے اس دن حطیم پر بار بار اپنے چہرے کو آب زمزم سے تر کر رہی تھی۔''

سب لوگ عصر کی اذان تک اسی کی باتیں کرتے رہے۔ مگر میں خاموشی سے سنتا رہا۔ ان میں سے اس کا نام تو کوئی نہیں جانتا تھا اس لئے سب اسے اللہ والی ہی کہتے رہے۔

گکھڑ والے حاجی حسرت سے بولے۔ ''اللہ والی تو ہے ہی مگر خوش قسمت بھی ہے کہ اسے حج اکبر کا موقع مل گیا۔ اس دفعہ تو حج جمعہ کو ہوگا۔''

جیسے جیسے گفتگو آگے بڑھتی گئی ان سب کے ذہن میں اس عورت کا روحانی درجہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

بالآخر حج کا پہلا دن آن پہنچا۔ آٹھ ذوالحجہ کو پو پھٹنے سے پہلے ہی سڑکوں پر میلے کا سماں بندھ گیا۔ لاکھوں زائرین چھوٹی بڑی رنگا رنگ ہزاروں گاڑیوں کے شور، دھوئیں، پٹرول کی بو اور ٹریفک جام میں جھٹکے ہوتے چیونٹی کی رفتار سے منیٰ کی طرف جا رہے تھے۔ منیٰ کی گرمی، بے صبری اور سست روی کی بیزاری اور چڑچڑے پن میں زیادہ تر تسبیحیں واپس جیب میں چلی گئیں۔ لبیک کے نعروں کی روح ماند پڑ گئی۔ چند میل کا سفر چاند کی مسافت بننے لگا۔ جذبہ شوق اور جھنجھلاہٹ آپس میں مسلسل کشتی لڑتے رہے۔ ہماری گاڑی کا انجن بے بس ہو کر چیخ رہا تھا اور پوری قطار اڑیل ٹٹو کی طرح

ناٹکیں گاڑے کھڑی تھی مگر ساتھ والی قطار رینگ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری گاڑی گھسٹ گھسٹ کر ہم سے آگے جارہی تھی۔

ایک دم ایک بازو ہوا میں لہرا لہرا کر متوجہ کرنے لگا۔ یہ اورنگ زیب کا بازو تھا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور اشارے سے پوچھا کہ ساتھی کہاں ہیں۔ اس نے بھی اشارے سے نفی میں ہاتھ ہلایا کہ نہیں ہیں۔

پھر اس کی قطار میں بھی رک گئی۔ اورنگ زیب نے دونوں ہاتھوں سے ہونٹوں کے گرد بھونپو سا بنایا۔

''میرا خیمہ نمبر 14 ہے اور تمہارا؟''

میں نے انگلیوں کے شارے سے اپنا خیمہ نمبر بتایا وروہ آگے نکل گیا۔

منیٰ خیموں کا شہر تھا۔ ہر خیمے میں دریاں، تکیے، پنکھے، جائے نمازیں، تھیلے، ٹوکریاں، گٹھڑیاں، تسبیحیں، احرام اور سجدے تھے۔ یکے بعد دیگرے عبادت، گفتگو، کھانا اور نمازیں تھیں۔ ان سب کی مسلسل تکرار میں زندگی کا ڈھلن پاندان کی کٹوریوں جیسا ہو گیا تھا۔ یکسانیت سے گھبرا کر میں اورنگ زیب کو ملنے چلا گیا۔

وہ پھر پریشان تھا بلکہ بہت ہی پریشان۔ ''یار! اختری کہتی ہے میں واپس نہیں جانا چاہتی .... مجھے مستقل مکہ کی رہائش دلوا دو کہ توبہ کے بعد پرانی زندگی چھوڑنے کا یہی طریقہ ہے۔ تم کسی سے کہہ سن کر بندوبست کرادو''۔

''مگر یہ تو ممکن نہیں''۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''حج کا تو پاسپورٹ بھی الگ ہوتا ہے۔ اس کے کوائف میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی''۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر مسلمان ملکوں میں کون سا کام نہیں ہوتا؟ جہاں چوری بھی بسم اللہ سے شروع کی جاتی ہو وہاں ہر ناجائز کام جائز ہو جاتا ہے۔ معلموں کا حاجیوں کو لوٹنا بھی۔ حتیٰ کہ حرم شریف میں جیب کاٹنا

میں اسے سمجھاتا رہا کہ اگر یہ ناممکن نہیں تو بھی بہت مشکل ہے مگر وہ جاگیردار تھا، بار بار یہی اصرار کرتا رہا کہ کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہو گا۔ ''تم کسی سے پتہ تو کرو، تمہارے تو کافی جاننے والے ہوں گے''۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بہت ہی زچ ہو کر بولا۔ ''بھئی میں کیا کروں۔ وہ بالکل واپس نہیں جانا چاہتی۔ وہ کسی عجیب ذہنی اور جذباتی کیفیت کی گرفت میں ہے۔ اب دیکھو نا! اس نے مکہ سے منیٰ تک کا سفر پیدل طے کیا ہے کہ تین ہی تو میل ہیں۔ آپس میں دھکم پیل، رینگنے رکنے والی گاڑیوں کے لمبے رستے کی نسبت کہیں جلدی پہنچ جاؤں گی۔ میں عبادت کا وقت کیوں ضائع کروں۔ کہتی ہے مزدلفہ آنا جانا بھی پیدل ہی کروں گی۔ اب تم ہی بتاؤ یہ دیوانگی ہے یا نہیں''۔

اب مجھے غصہ آنے لگا۔ ''بھئی، وہ تو دیوانی سہی مگر تم تو دیوانے نہیں ہو اور ایک ناممکن بات پہ اصرار کررہے ہو''۔

اورنگ زیب گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ''مگر بھائی میں اس کا تو دیوانہ ہوں نا!''

میرے غصے پر حیرت غالب آگئی۔ ''مگر تم تو کہتے تھے کہ یہ معاملہ عرصہ پہلے ختم ہو گیا تھا اور محض ایک شغل تھا''۔

''ہاں ہاں''۔ وہ بولا۔ ''سمجھتا تو میں بھی یہی تھا مگر یہ صرف اوپر سے ختم ہوتا ہے''۔ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک آیا۔ ''اندر سے ختم نہیں ہوتا۔ میں کیا کروں! وہ چالیس برس کی ہو گئی ہے مگر اب بھی اس کی ایک نظر مجھے ریزہ ریزہ کردیتی ہے''۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھو، سردار جی تو اللہ کی حاضری کا وقت ہوتا ہے۔ بندوں سے عشق کا موقع نہیں

اورنگ زیب نے ڈھیلا سا دوہتڑ اپنے سر پر مارا۔ "کیا کروں بھائی! اسی نے دل بنایا کہ عشق کریں۔ اسی نے ماتھا بنایا کہ سجدہ کریں۔ ہم یہ بھی کرتے ہیں اور وہ بھی کرتے ہیں مگر اس سے آگے ہمارا دماغ نہیں جاتا۔ نہ ہی اس کی حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ ہم نے تو تمہیں ایسا بنا دیا ہے مگر تم خود اپنے بندے ہو ... میرے عشق کے خلوص پر اسے اعتراض ہے تو میرے سجدے کا بھی تو خلوص دیکھے نا۔"

وہ گھبراہٹ میں اپنا سر ادھر ادھر جھٹکنے لگا۔ "کیا کروں بھائی! بندہ بشر ہوں بندہ بشر ... فرشتہ نہیں۔ کیا کروں! اللہ مجھے معاف کرے...... یا اللہ"۔ دونوں ہاتھ باندھ کر اس نے آسمان کی طرف اٹھا دیے۔ "یا اللہ معاف کر مجھے"۔

تیس مئی ۱۹۹۳ء مطابق ۹ ذی الحج، میدان عرفات میں قیام کا دن جو حج کی روح سمجھا جاتا ہے اور جمعہ کا روز جس نے اسے حج اکبر بنا دیا تھا۔ فجر کی نماز عجیب شوق اور حیرت میں ڈوبی تھی۔ شوق اس عالی مقام پر جانے کا اور حیرت اپنی پہنچ اور حاضری پر۔ "اللھم لبیک" کی پکار دل سے ایسے ٹکراتی جیسے ساحل پر سمندر سے لہر آ ٹکراتی ہے۔ نماز کے فوراً بعد روانگی شروع ہوئی تو یہ ارفع سوز دھڑام سے زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ دھکم پیل، طوفان بدتمیزی، ناراض بیویوں کی طرح غراتی ہوئی گاڑیوں کے سست رو ریلے۔ ہماری گاڑی ائرکنڈیشنڈ نہ تھی بلکہ اس میں کئی چھوٹے چھوٹے پنکھے لگے تھے۔ مگر سخت گرمی کے باوجود ڈرائیور پنکھے نہ چلاتا تھا۔ زائرین آپس میں کانا پھوسی کرتے کہ اسے پیسے دیں تو چلائے گا۔ مگر گاڑی میں عربی دان کوئی نہ تھا۔ معاملہ کیسے طے ہوتا۔ چنانچہ مئی کے چڑھتے دن میں خشک پہاڑیوں اور تپتی ہوئی گرمی میں سب سانس کھینچتے رہے۔ دعاؤں سے لدے ہونٹ [illegible] گئے۔ شاید اسی وجہ سے منزل پر پہنچے

سے چند منٹ پہلے اس نے پنکھے چلا دیے۔ اس کی مالی کمائی نہ ہو سکی۔ تسبیح کے شائقین کی روحانی کمائی نہ ہو سکی۔ نیک کے لالچ نے سب کو محروم رکھا۔

میدان عرفات میں اترتے ہی سکوت ہو گیا۔ جیسے ہزاروں ڈھول بجتے بجتے اچانک رک جائیں۔ ہر طرف بڑے بڑے خیمے اور قناتیں۔ ہر خیمے میں ڈیڑھ دو سو لوگ۔ عرفات میں چونکہ خدا خود میر محفل ہوتا ہی لئے یہ میدان چودہ سو برس سالا کی دست اندازی سے بچا رہا اور کوئی مسلک اس قیام کی حاشیہ آرائی نہ کر سکا۔ چنانچہ یہ قیام ایک فری سٹائل مراقبہ ہے۔ محض استغراق اور دھیان ہے۔ اللہ سے لو لگانا ہے۔ بیچ میں نہ کوئی پیر و مرشد نہ وسیلہ۔ یہی روبرو حاضری اصل حج ہے۔ باقی متعلقہ رسومات ہیں۔ اس میں خاموش عبادت، اکیلے درود میں، یادوں میں ڈبکی، مستقبل کے خواب، گپ بازی، چائے نوشی، لاف زنی، محض وقت گزاری یا تماشائے اہل کرم سب کچھ جائز تھا۔ صرف حاضری ضروری تھی۔ یعنی اللھم لبیک کی زبانی پکار کی جسمانی تائید و تکمیل۔ سبھی لوگ کسی نہ کسی حد تک یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ جو کچھ جس کے اندر تھا، باہر آ رہا تھا۔ گویا ہر برتن چھلک رہا تھا۔

اس سے حج کرنے والوں کے چند واضح ماڈل نظر آ رہے تھے۔ کچھ فنافی اللہ اور اپنی ذات میں مبہوت ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ کچھ دوسرے ارکان، مقام اور مناسک کے احترام میں لت پت۔ ان دونوں کی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور روحانی حاضری مکمل تھی۔ مگر ذات کی کمی بیشی کے ساتھ کچھ تیسرے صرف رسم نبھانے والے اور کچھ چوتھے فیشن پورا کرنے والے۔ موخر الذکر دونوں کی حاضری صرف جسمانی تھی اور ذات قدم قدم پہ آسائش کی متلاشی تھی۔ مگر یہ تو اب خدا ہی جانے کہ کن کی حاضری لگ رہی تھی اور کن کی حاضری کے باوجود غیر حاضری لگتی رہی۔

میں اپنے خیمے میں گھوم کر اورنگ زیب کو ڈھونڈتا رہا۔ اردگرد کے چند خیموں میں بھی دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ گھورنے والے حاجی صاحب البتہ ہمارے ہی خیمے میں بڑی مستعدی سے نفل پر نفل پڑھتے رہے۔ تو اس دوران ان کی نظریں ادھر ادھر ہی بھٹکتی رہیں۔

سعودی بادشاہ کی طرف سے تمام حاجیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ بہت بڑے بڑے طشت، گرم پلاؤ اور سالم روسٹ مرغ، وافر مقدار اور سلیقے کی سروس، یہ بلاشبہ انتہائی نیک نیتی سے اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی تھی مگر جمہوریت کے زمانے میں شاہی ضیافت کے معنی بھی الٹ جاتے ہیں۔ کوئی اسے شاہی رعونت کی خیرات کہتا تھا اور کوئی اسے مطلق العنانی سے بڑے ان داتا بننے کا شوق کہتا تھا۔ جمہوری قدریں بندے اور بندہ نوازی میں فرق نہیں کر سکتیں۔

دو رکعت باجماعت نماز قصر کے بعد میں اپنی بیگم کے ساتھ جبل العرفات اور جبل الرحمت کی طرف روانہ ہوا جہاں سرور کائنات نے اپنا آخری خطبہ حج ارشاد فرمایا تھا۔ فاصلے سے ان پہاڑیوں پر نظر پڑی تو وہاں سفید احرام ایسے چھائے ہوئے تھے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ ہمارے آگے پیچھے دائیں بائیں بھی اکا دکا لوگ ادھر ہی جا رہے تھے۔ اچانک میری بیوی پکاری۔ "وہ اللہ والی بھی ادھر ہی جا رہی ہے"۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو پہلے نظر اورنگ زیب پہ پڑی پھر اس کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت پہ۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی ہم سے آن ملے۔ اورنگ زیب میری بیوی سے مخاطب ہوا۔ "آپا! یہ اختر ہیں (اس نے عورت کی طرف اشارہ کیا) اور یہ (مرد کی طرف اشارہ کر کے) ان کے بھائی ہیں"۔

پھر اس نے ہمارا تعارف کرایا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اختر یہ میرے بہت پرانے اور مخلص

دوست ہیں۔ میں نے ان سے بھی درخواست کی ہے کہ تمہارے یہاں قیام میں مدد کریں''۔

اختر نے بڑی سی ملتجی آنکھوں سے میری طرف دیکھا مگر امکانات مسدود ہونے کی وجہ سے میں اتنا ہی کہہ سکا کہ دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔

توبہ ہے اختری بائی! میں نے دل میں سوچا۔ نہ معلوم وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی یا اس وقت اپنے گول متناسب چہرے اور موٹی موٹی کالی آنکھوں کے ساتھ احرام کے فریم میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر دو تقریب کی وارفتگی سمجھ میں آتی تھی۔ بہرحال اس مختصر تعارف کے بعد ہم سب جبل الرحمت کی طرف بڑھنے لگے۔

ہم جیسے جیسے قریب آتے گئے، پہاڑی بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور اختری کے قدم باقی ساتھیوں سے آگے نکلتے گئے، حتیٰ کہ وہ قریباً بھاگتی ہوئی پہاڑی کے دامن میں جا پہنچی۔ اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا کپڑا کھول کر بچھا دیا اور نفل ادا کرنے لگی۔ دو رکعت کے بعد وہ پہلے تو بیٹھی دعا مانگتی رہی پھر اسی انداز میں کھڑی ہوگئی۔ دونوں بازو آسمان کی طرف پھیلا دیئے اور پہاڑی کی طرف رخ کرلیا۔ اس کے چہرے کے رنگ آندھی کے بگولوں کی طرح بدل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ وفور جذبات سے نتھنے کانپ رہے تھا۔ ایک منٹ، دو منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ وہ اسی انداز میں دعا مانگتی رہی۔ چہرہ چوٹی کے قریب اس سفید پتھر کی طرف تھا ہوا تھا جو حجۃ الوداع میں سرور کائنات کے کھڑے ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ سر نیچے ڈھلکا ہوا تھا، آنکھوں کے کولوں سے آنسوؤں کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ پھر رقت بڑھنے سے سارا جسم لرزنے لگا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جیسے بلند بانگ سپردگی اور حضوری کا مرغول

رو رو کر دعا مانگنے والے اور بھی تھے مگر اختری بائی کا نالہ سب سے الگ تھا۔ جیسے جذبات کا آتش فشاں پھٹ پڑے۔ ہر ممکن ضبط کے پرخچے اڑ جائیں۔ آنسو کی بجائے آنکھ سے لہو ٹپکے اور سینے میں سے صور اسرافیل بول اٹھے۔ اس کے رونے کی آواز بہت بلند نہ تھی مگر شدت کی وجہ سے مجھے یوں لگا جیسے بے کسی، بے چارگی، عجز اور عقیدت کی سسکیاں جبل الرحمت سے ٹکرا کر سارے میدان عرفات میں برقی شعاعوں کی طرح اڑ رہی ہیں۔

میں جو اس کے عمر بھر کے یک رنگے ماضی سے خوب واقف تھا، سوچ رہا تھا کہ نہ معلوم یہ دعا ہے، شکوہ ہے یا فریاد ہے۔ وہ خدا سے کچھ مانگ رہی ہے یا صرف احتجاج کر رہی ہے۔ کیا وہ اپنے جرم کا اقرار کر رہی ہے یا مشیت پر ظلم کا الزام دھر رہی ہے۔ جو بھی تھا وہ اٹھتے ہوئے بے قرار لمحے اس کے عمر بھر کے دکھوں اور بے راہ روی کا کیتھارسس بن گئے تھے۔

مگر میری بیوی ششدر تھی، اپنی دانست میں وہ ایک خدا رسیدہ اللہ ولی کی عظیم روحانی واردات ایک پاکیزہ پس منظر میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بھول چکی تھی کہ وہ خود کون ہے۔ یہاں حج کے لئے آئی ہے اور اس وقت تپتی ہوئی دھوپ میں قدم قدم چل کر جبل الرحمت سے رحمتیں سمیٹنے آئی ہے۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ اللہ والی کو ایک ہی ٹک دیکھ رہی تھی۔ جس کے نالے کی تاثیر اور گرم ہوا کی حدت میں دونوں مقدس پہاڑیاں بھی لرزتی لگتی تھیں۔

جبل الرحمت پر ایستادہ سفید پتھر، اختری بائی کا نالہ اور ہم دونوں میاں بیوی کی الگ الگ سوچیں اسی نہاں خانے میں خاموشی سے جذب کر رہا تھا جہاں صدیوں سے اللھم لبیک پکارتے ہر حاجی کے ماضی کے راز دم سادھے پڑے رہتے تھے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

عرفات کا قیام ختم ہوا، سسکیوں میں دعا مانگنے والے خاموش اور مؤدب حاجی پھر سے غیر منظم بے قابو ہجوم بنتے گئے۔ عربی ڈرائیوروں سے لڑتے جھگڑتے، انچ انچ آگے بڑھتے، منجمد ٹریفک میں ٹھوکریں کھاتے، رات سڑک پر ہی کاٹ دی۔ حتیٰ کہ صبح کی اذان سنائی دینے لگی۔ جو رات مزدلفہ میں عبادت کرنے کا ثنا تھی وہ سڑک پر گمراہی میں ختم ہو رہی تھی۔ بصد مشکل منزل پر پہنچ کر صرف نماز ادا کر سکے۔ کنکریاں چنیں اور آدھے گھنٹے کا سفر چھ گھنٹے میں طے کر کے واپس منیٰ پہنچے جہاں خیموں کی درمیانی گلیاں اب حاجیوں کے پھینکے ہوئے کوڑ کباڑ سے اٹی پڑی تھیں۔ خالی ڈبے، بوتلیں، لفافے، گلی سڑی سبزیاں اور پھل پانی کے ساتھ مل کر عجیب قسم کا کیچڑ بنا رہے تھے جس میں بڑا سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ گندگی اور بدنظمی کی طرف مسلمانوں کی روایتی بے حسی اس عظیم بین الاقوامی اجتماع میں اپنے عروج پر تھی۔ جیسے یہ تمام عالم اسلام کی ساری بے حسی کا مجموعی ثبوت ہو کہ مسلمان ہرگز اپنی بہتری پر آمادہ نہیں اور قسمت کے نام پر سب کچھ خدا پر چھوڑ کر اپنی زبوں حالی قائم رکھتا ہے۔

سعودی حکومت کی طرف سے ریفریجریٹر والی گاڑیاں جابجا کھڑی تھیں۔ ٹھنڈے پانی کی تھیلیاں مفت تقسیم ہو رہی تھیں مگر یہاں آج کے مسلمانوں کی بنیادی معذوری یعنی انتظامی اہلیت کا فقدان، حائل تھی اور یہ پانی حق داروں کو نہیں ملتا تھا۔ ہر گاڑی کو چالیس پچاس مرنے مارنے والے لوگوں نے گھیرے میں لیا ہوتا۔ خیرات کے انداز میں اندر سے چند تھیلیاں ہوا میں اچھال دی جاتیں۔ اچکنے والے کئی ہاتھ بلند ہوتے۔ پکڑ دھکڑ، کھینچا تانی، چھینا جھپٹی کا بے دریغ مظاہرہ ہوتا۔ جنگل کے قانون کے تحت زیادہ خونخوار سب کچھ لے جاتے۔ عورتیں، بوڑھے اور اپاہج دور کھڑے بے بسی سے دیکھتے رہ جاتے۔

اخباروں کے مطابق کوئی بیس لاکھ حاجیوں کے لیے چھ کروڑ سے زائد تھیلیاں میسر تھیں۔ گویا فی حاجی کوئی تیس سے زائد تھیلیاں۔ اگر قطار بنا کر لیتے تو ہر ایک کو بغیر مشکل کے گھڑوں پانی مل جاتا۔ مگر قطار بنانا، سیدھی صف میں پنجگانہ ادا کرنے والے مسلمان کے مزاج کے خلاف ہے۔ قطار بنوانا مسلمان حکومتوں کے مزاج کے خلاف ہے۔ افراد کی خودی کو خیرات سے ٹھوکر کرنا شاہانہ چلن ہے اقربا پروری سے پیدا شدہ نااہلی کو اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کرتے رہنا ملی مزاج ہے۔ انہی مزاجوں کے کئی شکلوں میں دیگر مظاہرے دیکھتے ہم آگے بڑھتے گئے اور عالم اسلام کی جملہ نااہلی کی حاصل جمع میں دھنستے گئے۔

لوگ اور لوگ۔ بہت سی لوگ۔ ہجوم، ہجوم در ہجوم۔ انبوہ کثیر ان گنت پاؤں کی مسلسل چاپ، ایمان کی لگن کی چال، بوجھل قدموں کی بھاری دھمک، گھسے ہوئے جوتوں کی مزید گھسیٹ۔ اس ہزار پا عظیم انسانی پیکر میں سے کبھی کبھی تھکی تھکی دبی دبی گفتگو ابھرتی۔ اوپر چلچلاتی دھوپ۔ جسموں پر پسینے کے فوارے، نیچے چھلنے ہوئے بے جان پاؤں۔ گرمی سے نڈھال جسم، خشک تالو اور لٹکی ہوئی زبانیں، رکتے، رینگتے، گرتے، اٹھتے، دبتے، پچتے ہم قدموں نہیں صرف انچوں آگے بڑھتے تھے اور جب اس چڑھائی کے قریب پہنچے جو دو سنڈیروں کے درمیان اٹھتی ہوئی رمی کے اوپر والی منزل کو جاتی تھی تو یوں لگتا کہ ان گنت جسموں کا ٹھوس واحد تودہ آگے کو کھسکتا جا رہا ہے۔

دن کے بارہ بج رہے تھے جو آخری دن رمی شروع ہونے کا وقت ہے اس لیے چڑھائی پر چڑھتے والا ٹھوس انسانی تودہ صرف آگے کو کھسک رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد کنکر پھینک کر مڑنے والے لوگ واپس آنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔ کوئی دوسرا [illegible]

تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چڑھائی میدان حشر بننے لگی جس کا جتنا زور جس طرف چلتا تھا وہ اتنا ہی راستہ ادھر بنا لیتا تھا۔ کئی لوگ بازو ملا کر ایک انسانی ٹینک لیتے جو فوجی زرہ بکتر ٹینکوں کی طرح دوسروں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا جاتا تھا۔

میں بھی ایسے ہی ٹینک کی زد میں آ گیا۔ پیچھے ہٹنا چاہا تو لوگ سیسہ پلائی دیوار بنے کھڑے تھے۔ دائیں بائیں ہلنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ میرے قدم اکھڑ گئے۔ پسلیاں دباؤ کے درد سے بلبلا اٹھیں۔ اوپر سے آسمان غائب ہو گیا۔ اب نہ پاؤں زمین پر تھے نہ سر کھلی ہوا میں تھا۔ گھٹنے، کہنیاں، دباؤ میرے جسم کو پیس رہے تھے۔ میرا سانس رک رہا تھا۔ میں بے ہوش ہونے کو تھا کہ کسی ہاتھ کی گرفت نے کھینچ کر اوپر اٹھایا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے پر لگا اور میں نے آنکھیں کھول کر خود کو ایسے سنبھالا کہ جدھر ریلا گیا ادھر قدم گھسیٹتا گیا۔ بالآخر سڑک کی منڈیر سے جا ٹکرایا اور بے دم ہو کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

ابھی اپنے اوسان مجتمع کر ہی رہا تھا کہ اپنی زبان میں آواز آئی۔ ”آگے مت جائیں وہاں بہت سے لوگ مر گئے ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑیں، میں آپ کو واپس لے چلتا ہوں“۔ اور وہ تنومند پاکستانی نوجوان مجھے قدم بہ قدم چلاتا چڑھائی سے نیچے اتار لایا۔

میرے کانوں میں اذان کی آواز پڑی۔ ادھر اُدھر دیکھا تو سامنے مسجد خیف کے مینار کھڑے تھے۔ لنگڑاتا، ڈولتا اور ہانپتا ہوا میں بالآخر مسجد میں داخل ہو گیا۔

میرے ساتھی بکھر کر ہجوم میں گم ہو چکے تھے۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ کیا آج رمی ہو سکے گی یا نہیں۔ اگر نہ ہو سکی تو کیا حج مکمل ہو گا یا نہیں۔ بالآخر تین گھنٹے بعد آخری کوشش کے ارادے سے باہر نکلا تو سارا نظارہ ہی بدلا ہوا تھا۔

آسمان پر دس پندرہ ہیلی کاپٹر اڑ رہے تھے۔ جو چڑھائی کچھ دیر پہلے میدان کارزار بنی ہوئی تھی، اس پر فوج نے لمبا سا بیضوی حلقہ بنایا ہوا تھا جس کے گرد یکطرفہ ٹریفک نافذ تھی اور ایک طرف سے لوگ اوپر جا رہے تھے تو دوسری طرف سے نیچے آ رہے تھے۔ کہیں بھی بدنظمی یا ہجوم نہ تھا اور سب لوگ پرسکون انداز میں چل پھر رہے تھے۔ فوج کے بیضوی حلقے میں کئی لاشیں اور متعدد زخمی زمین پر پڑے تھے۔ مزید لائے جا رہے تھے اور ان کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔

گرم آسمان اور تپتی دھوپ میں سرپوش کے بغیر کئی لاشیں گویا چیخ کر پوچھ رہی تھیں کہ جو یکطرفہ ٹریفک شام چار بجے نافذ ہو سکتی ہے، دوبارہ بجے سے پہلے کیوں نہ نافذ ہوئی؟ اور مسلم ممالک میں انتظامیہ کو عام کارروائی پر بھی جھنجھوڑنے کے لئے ہمیشہ لاشوں کی کیوں ضرورت ہے؟

مگر سارے عالم اسلام میں مسلم عوام اب محض سوالیہ نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ شاہوں، ڈکٹیٹروں اور وڈیروں کی اس دنیا میں حقیر شہری جواب کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اسے ہر انداز میں مرنے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔ اس احسان کے ساتھ کہ اور کیا چاہتا ہے۔

میری ٹانگ زخمی تھی۔ چھڑی اتنی ٹیڑھی ہو چکی تھی کہ کھل نہ سکتی تھی۔ اسے لاٹھی بنا کر میں دھیرے دھیرے جمروں کی طرف جا رہا تھا۔ ہجوم اب بھی تھا مگر ٹریفک کے یکطرفہ نظام کی وجہ سے سب زائرین جمروں میں سے بہنے والے پانی کی طرح بے روک ٹوک چل رہے تھے۔ زخمی ٹانگ سے زیادہ زخمی میرے دل و دماغ تھے جو غصیلی سوچوں کے تھپیڑوں سے بے حال تھے۔ صرف چند احکام کے بروقت نفاذ سے حج کا سارا ماحول بہتر بن سکتا ہے۔ یکطرفہ ٹریفک، قطار بنانا، حرم شریف کے طاق نمبر کے دروازے داخلے کے لئے اور جفت دروازے خروج

کے لیے۔ سعی میں وقفے وقفے سے گنجائش کے مطابق لوگوں کا داخلہ اور غسل خانوں کی مسلسل صفائی مگر بدقسمتی ہے یہ ماحول ایسے ہی رہے گا کیونکہ آج کا مسلمان اپنی ہر پستی کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

ان سوچوں نے میرا ذہنی اور جذباتی توازن اتنا بگاڑ دیا کہ تھوڑی دیر بعد جب میں جمروں کو کنکر مار رہا تھا تو فرض کر رہا تھا کہ یہ عالم اسلام کے سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنما ہیں جنھوں نے دانستہ یہ دنیا مسلمانوں کے لیے جہنم بنا دی ہے۔

چلتے چلتے لنگڑاتے، بار بار دم لیتے میں مغرب کے بعد اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔

حج ختم ہو چکا تھا، احرام اتر چکے تھے۔ اگلے دن صبح ہم مدینہ منورہ کی باتیں کر رہے تھے جہاں پندرہ دن بعد روانہ ہونا تھا کہ میری بیگم کمرے میں آئی۔ "اللہ والی آئی ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے"۔

تمام حاضرین نے نظریں ملائیں، حیرت اور خوشی، اتنی بلند قامت روحانی شخصیت۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی سب دل سے تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ ہماری چھوٹی سی زندگی ہے مگر اس میں بھی کتنے پردے ہیں۔ ہر پردے کا رنگ ہماری نظر کا رنگ بن جاتا ہے۔

آج احرام نہیں تھا مگر وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں بھی ویسی ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سنجیدہ قدموں سے آگے بڑھتی وہ آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ پھر ہولے ہولے، دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں چشمہ بننے لگیں۔

اب ہم سب دوسری قسم کی حیرت میں ڈوبنے لگے۔

"سردار صاحب!" وہ رک رک کر بولنے لگی۔

"کل سے..... واپس نہیں آئے..... وہ رمی پر گئے تھے"۔ پھر وہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

ایک انجانے خوف نے مجھے سانپ کی طرح ڈس لیا۔ گزشتہ روز کے بھیانک تجربے کے بعد میری ساری حسیات چنگاری کی طرح چیخ اٹھیں۔ "وہ کس وقت گئے تھے؟"

"وہ اکیلے نہیں تھے، میں بھی ساتھ تھی، ہم کل پانچ لوگ تھے"۔

"مگر کس وقت، کس وقت؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ میرے ذہن میں بارہ بجے اور چار بجے والے دونوں نقشے گڈمڈ کر رہے تھے۔

"ہم لوگ کوئی بارہ بجے وہاں پہنچے تھے"۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ "پھر کیا ہوا؟"

اس کی کہانی میری کہانی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

"اب میں ہسپتالوں میں ڈھونڈنے جا رہی ہوں"۔ وہ بڑے ہی درد سے کہنے لگی۔

پھر ہم سب اورنگزیب کو تلاش کرنے ادھر ادھر بکھر گئے۔

ہر طرف افواہیں زور پکڑ رہی تھیں۔ ہر نئی افواہ میں مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بارہ سو، پندرہ سو، اٹھارہ سو، مقامی اخباروں نے معمولی بدنظمی کی خبر دی تھی کیونکہ حاجیوں کی موت یا مرنے والوں کی تعداد ان کے نزدیک اہم چیز نہ تھی۔ یہ تو خود فریبی کے کیڑے مکوڑے تھے۔ ثواب کے نام پر کچلے جانے کو تیار۔ ان کی موت کوئی ایسی تو نہ تھی۔

میں پاکستانی سفارت خانے میں گیا۔ انہیں سعودی حکومت نے ابھی تک کوئی اطلاع فراہم نہ کی تھی۔ میرے اصرار پر ایک افسر نے متعلقہ سعودی افسران کو فون کیا اور اٹھارہ سو اموات کی افواہ سنائی۔ مگر جواب یہ تھا کہ اتنے لوگ آئیں گے تو کچھ تو مریں گے ہی اور اٹھارہ سو تو

کوئی زیادہ تعداد نہیں۔ لاکھوں حاجیوں کا ایک فیصدی بھی نہیں۔ اگر ہم اتنے اچھے انتظام نہ کرتے تو مرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی۔ چہ دلاور است دزدے!

مگر پھر پاکستانی سفارت کار کو فوراً وی آئی پی پاکستانی حاجیوں کی دیکھ بھال کے لئے جانا پڑا کیونکہ تخت سے خدائی کرنے والے عرش کے خدا سے کہیں زیادہ قہار تھے۔

میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اور نگ زیب کو ہسپتالوں میں جا کر ڈھونڈوں۔ ٹیکسی اور ہسپتال، پھر ٹیکسی اور ہسپتال، چار ہسپتالوں میں چکر لگایا۔ ان میں سے دو ٹیکسی والوں نے کرایہ طے کرنے کے بعد آدھے راستے میں گاڑی کھڑی کر کے زیادہ کرائے کا مطالبہ کیا۔ ایک مطالبہ تو حرم شریف کے میناروں کے سائے میں ہوا۔ میں نے بھی مینار اور کبھی ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا مگر وہ صرف مجھے دیکھتا رہا، جیسے مینار کا وہاں وجود ہی نہ تھا۔

پانچویں ہسپتال میں جیسے ہی میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں لاشیں پڑی تھیں تو اختری بائی پر نظر پڑی جو ایک چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ ''میں تو سردار صاحب سے بڑی باتیں کر چکی، آپ بھی کر لیجئے''۔ اور وہ چارپائی کا پایہ پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، چہرہ جذبات سے خالی تھا اور گورا رنگ تپا ہوا تانبا بن گیا تھا۔

خوش شکل اور متناسب اور نگ زیب کے بے ہنگم موٹے ہوئے چہرے پر کہیں نیل پڑے ہوئے تھے، کہیں خون جم گیا تھا۔ کہیں جلد چھلی ہوئی تھی، ایک آنکھ کہیں اندر دھنس گئی تھی۔ گویا موت سے کہیں بھی کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے بھرپور وار سے ہستی کو نیستی میں بدل گئی تھی۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے والا زندہ دل اور نگ زیب اب کہیں بھی نہ تھا۔ فقط ایک بے جان، بے حرکت، بے بس اور بے بو پیکر اس معدوم شخصیت کی مسخ شدہ نشانی رہ گیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اسے بالآخر یک طرفہ راستہ مل ہی گیا، اب واپسی کہاں۔

اختری بائی کو وہیں چھوڑ کر میں ساتھ والے کمرے میں گیا جہاں وارڈ کے سٹاف والے بیٹھے تھے تاکہ ان سے مزید کارروائی کے بارے میں پوچھ سکوں۔

مگر وہ منہ سے صرف عربی بولتے تھے، چہرے پر صرف بیزاری پہنتے تھے اور آنکھوں سے صرف حقارت انڈیلتے تھے۔ میں ان تینوں رکاوٹوں کو پار کرنے سے قاصر تھا۔ اتنے میں ہسپتال کے دو کارکن سفید کوٹ پہنے اسی سمت آتے نظر آئے۔ وہ جیسے جیسے قریب آتے گئے پنجابی گفتگو ابھرتی گئی۔ میں ایک کر ان کے پاس پہنچا اور ترجمانی کی درخواست کی۔

ان کے استفسار پر پورا واقعہ بتایا تو وہ میرے ساتھ وارڈ کے سٹاف کے پاس گئے۔ عربی میں بات چیت کی اور مجھے بتایا کہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ متوفی کے لواحقین نے رضامندی دے دی ہے کہ اسے یہیں دفن کر دیا جائے۔

میرے تن بدن پر جیسے کسی نے حیرت کی بالٹی انڈیل دی ''مگر ان کے لواحقین تو پاکستان میں ہیں، یہاں کس نے رضامندی دے دی ہے؟''

انہوں نے پھر کاغذات دیکھے۔ ''یہاں اختر بیگم کی طرف سے رضامندی درج ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے بیوی بچوں کی غیر موجودگی میں وہ ان کی قریب ترین عزیزہ ہے۔''

میں بھاگ کر اختری بائی کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ لپکے آئے۔ ان میں سے ایک تو ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا پست قد آدمی تھا اور دوسرا اونچا لمبا نوجوان

تھا۔ وہ دونوں چند برس سے اس ہسپتال میں تشخیص کی مشینوں پر کام کر رہے تھے۔

''میں نے تو ان سے صرف یہ کہا تھا''۔ وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ ''کہ اگر وہ مجھے بھی اس ملک میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ وہ سردار صاحب کو یہیں دفن کر دیں اور اگر مجھے اجازت نہیں دیتے تو ان کی میت کو بھی پاکستان بھجوا دیں''۔

ہم سب دوبارہ وارڈ سٹاف کے پاس گئے۔ اس نوجوان نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ انکار میں سر ہلاتے رہے، کندھے اچکاتے رہے اور بے بسی ظاہر کرتے رہے کیونکہ متعلقہ محکمے کے لوگ جب وہاں آئے تھے تو اختری کا بیان درج کر کے لے گئے تھے۔ اب تو دفن کرنے والے کارکن پہنچنے والے ہی ہوں گے۔

ناکامی کے بعد ہم پھر میت کے پاس واپس آ گئے۔ اختری بائی ہمیں اجنبیوں کی طرح دیکھتی رہی جیسے اسے چارپائی پر پڑے ہوئے بے جان جسم کے علاوہ کسی اور سے سروکار ہی نہ ہو۔ ہم نے اسے آخری صورت حال سے مطلع کیا تو اس نے کوئی خاص ردعمل نہیں ظاہر کیا۔ سوائے غیر جذباتی انداز میں اس فقرے کے کہ ''شاید اب مجھے بھی یہاں رہنے دیں''۔

مگر نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور سرگوشی میں مجھے کہنے لگا۔ ''اگر آپ پاکستانی سفارت خانے سے بہت ہی قوی دباؤ ڈلوا سکیں تو میت کو پاکستان بھجوانے کی شاید کوئی صورت نکل آئے ورنہ کوئی امید نہیں''۔ پھر ہمیں ماضی میں دیگر ایسے واقعات کے متعلق بتانے لگا۔

ادھیڑ عمر پاکستانی نے دریں اثناء کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کبھی چارپائی پر سفید چادر کے ابھار کو دیکھتا اور کبھی اختری بائی کو دیکھنے لگتا۔ بالآخر وہ اس سے پوچھنے لگا۔

''آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟''

اختری بائی نے اسے گہری نظر سے دیکھا جیسے رشتے کے متعلق شک پر اس کے دل کو ٹھیس لگی ہو مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

پوچھنے والا بھی اسے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''آپ پاکستان میں کس ضلع سے ہیں؟''

اختری نے دانستہ سوال نظر انداز کر دیا۔ ''تمہیں کیا غرض'' والے انداز میں۔

اب اس نے زیادہ زور سے سوال کیا۔ ''آپ ... ضلع کی رہنے والی ہیں؟''

اختری کی آنکھوں میں حیرت کی لکیر ابھری، اسے کیسے پتہ؟ مگر وہ خاموش ہی رہی۔

تب وہ ایک قدم آگے بڑھا، اپنے چہرے کو اختری کے چہرے کے بالکل سامنے لایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''آپ اختری بائی ہیں نا؟!''

اختری بائی کے قمر زدہ تانبے کی طرح تپے ہوئے چہرے پر ایک دم پیلاہٹ چھا گئی۔ نگاہیں چراتے ہوئے اس نے منہ دوسری طرف پھیرا۔ تذبذب کی حالت میں آنچل مروڑا اور مڑ کر تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ادھیڑ عمر پاکستانی مسکرانے لگا، کوئی راز پانے پر فتح مندی کی مسکراہٹ۔

''آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''او جی! میں بھی تو اسی ضلع کا ہوں نا۔ سردار اورنگ زیب اور اختری بائی کے قصے سے خوب واقف ہوں''۔ پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''ہم بھی تو کبھی شوقین لوگوں میں سے تھے''۔ اس نے اپنے ساتھی کو کہنی ماری اور چہرہ اٹھا کر ہنسنے لگا۔

پھر ایک دم ہنسی روک کر پوچھنے لگا۔ ''اور آپ اسے کب سے جانتے ہیں جی؟'' اس کی آنکھوں میں دبی دبی

گرم جوش مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ اپنے ہی جیسے شوقین مخاطب سے ہم کلام ہو۔

جھوٹ میں بھی سچائی برقرار رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں تو اسے یہیں حج میں ملا ہوں''۔

''بابا''۔ وہ پھر ہنسا۔ ''مولا کے رنگ ہمیشہ ہی نرالے ہیں۔ دیکھئے کہاں اور کب ملاقات کرائی۔ جب سردار صاحب بھی نہیں رہے''۔

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں ضبط کر گیا کیونکہ ابھی ابھی ان دونوں نے اپنی ترجمانی سے میری مدد کی تھی۔ ساتھ ہی اس کا نوجوان ساتھی اس کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ ''ہمیں دیر ہو رہی ہے جلدی چلو۔ ورنہ ڈاکٹر چیخے گا''۔

ادھیڑ عمر پاکستانی چل بھی گیا اور پیچھے مڑ کر بولتا بھی گیا۔ ''میرا نام حاجی عبدالحمید ہے۔ میں پھر ملوں گا آپ سے کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں آپ؟''

مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے پاکستان سفارت خانے جانے کی عجلت تھی تاکہ انہیں کہوں کہ اورنگ زیب کے اصل لواحقین سے پوچھے بغیر اسے دفنانے کا فیصلہ نہ کریں۔ سفارت خانے والوں نے کچھ کرنے کا یقین دلایا مع اس خدشے کے کہ حج کے دنوں میں مقامی حکومت کی کارروائی کا پہیہ جب چل پڑے تو اسے روکنا اور ریورس کرانا چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں بھاگم بھاگ ڈائریکٹر حج کو بھی ملنے گیا۔ انہوں نے بھی کچھ کرنے کا وعدہ کیا مگر نہ کرنے کے انداز میں۔ دفتر سے نکل کر میں بے بسی کے عالم میں فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں چند لوگ ایک ٹیکسی سے اترے۔ خالی دیکھ کر میں بے اختیار اس میں کود پڑا اور ہسپتال کا پتہ دیا۔ اب میں اس کوشش میں تھا کہ یا تو ہسپتال کے کسی سینئر ڈاکٹر سے رابطے کا جوا کھیلوں یا پھر اورنگ زیب کے بازو میں بندھے ہوئے شناختی نمبر سے اس کے معلم کا پتہ نکالوں اور مدد کی درخواست کروں۔

پہلا ارادہ ناکام رہا۔ دوسرے میں معلم کے دفتر ڈھونڈتے ڈھونڈتے دو گھنٹے گزر گئے۔ ایام حج میں معلم کی حیثیت اب کم و بیش ویسی ہی ہے جیسی پاکستان میں وڈیرے یا جاگیردار کی ہے اور حاجیوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت بھی یہاں کے مزارعوں سے تعلقات والی ہی ہے۔ ویسے بھی انتہائی عدم مساوات کا سانچہ مسلم معاشروں کا بنیادی ڈیزائن ہے۔ وہاں شہری حقوق نہیں ہوتے۔ حاکم خاندانوں کی پرستش ہوتی ہے۔ عوام تہی دست اور خواص تہہ در تہہ دستانہ پوش، نہ معلوم کیا کیا چھپائے ہوئے۔

معلم کے دفتر کے باہر والے بڑے کمرے میں اس کے آٹھ دس کارندے حاجیوں کے ہجوم سے اپنے اپنے انداز میں نپٹ رہے تھے۔ اندر چھوٹے سے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں معلم براجمان تھا۔ کوئی ربع صدی پیشتر یہ کنواں پیاسے کے پاس جاتا تھا۔ اب پیاسے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اکثر تو پہنچ کر بھی تشنہ ہی رہتے ہیں۔ کارندے مصر تھے کہ میں ان سے بات کروں مگر جھگڑتے جھگڑتے میں معلم تک پہنچ ہی گیا۔ وہاں دو چار لوگ اور بھی تھے۔ تھوڑے انتظار کے بعد میری باری بھی آ گئی۔

اورنگ زیب کی وفات کا سن کر معلم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا پھر سر ہلا ہلا کر باقی باتیں بھی سنتا رہا۔ دو ایک ٹیلی فون کیے مگر صورت حال واضح نہ ہو سکی اور میں نامراد لوٹ آیا۔

اگلی صبح بہت ہی کٹھن تھی جب وہ ہمارے ہاں آئی۔ میرے لئے تو وہ آخری بائی تھی جس کا راز اب مکہ میں بھی فاش ہو چکا تھا۔ مگر میری بیوی اور باقی ساتھی لاعلم تھے۔ ان سب کے لئے وہ خالص اللہ والی تھی جو رو رو کر بتا رہی تھی کہ اورنگ زیب کو ہسپتال سے لے گئے ہیں۔ نہ معلوم کہاں اور اب میں پوری کوشش کروں کہ اسے مکہ

میں مستقل قیام کی اجازت مل جائے۔ نسوانی ہمدردی پر مستزاد وہ گہری عقیدت تھی جو میری بیوی کو اس برگزیدہ ہستی سے ہو گئی تھی۔ کمرے میں باقی حاضرین بھی ان دونوں کے ہمنوا ہو گئے تھے۔

مستور حقیقت عجب شعبدہ بازی کر رہی تھی۔ کمرے میں ہر شخص صحیح بھی تھا اور غلط بھی۔ حاضرین کو اندازہ نہ تھا کہ اللہ والی دراصل کون ہے۔ اللہ والی کو خود اندازہ نہ تھا کہ کون کون اس کے متعلق کتنا جانتا ہے۔ خود مجھے اندازہ نہ تھا کہ کیا اختری جانتی ہے کہ میں اس کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔ تمام پوشیدہ اور عیاں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کمرے کے بگڑے ہوئے فوکس کی طرح منہ کے بول دوہرے اور تہرے عکسی معانی بناتے تھے۔

اپنے واحد مطالبے کی مسلسل تکرار میں بھی اللہ والی محتاط تھی۔ میں ان کہی کو مناسب انداز میں کہنے کے لئے زیادہ محتاط تھا۔ مگر باقی سب اس نیک ہستی کی تائید میں بے دریغ تھے اور مجھ سے تقاضا کر رہے تھے کہ میں کچھ کروں۔ مجھے اپنے وسائل کی حدود کا اندازہ تھا۔ اپنے سفارت خانے اور مقامی حکومت کے تیوروں کا بھی اندازہ تھا کہ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد، پھر بھی میں بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ مگر کامیابی نظر نہ آتی تھی۔

شہر سکڑنے لگا جیسے غبارے کی ہوا کو ان دیکھا سوراخ مل جائے۔ حاجیوں کے قافلے اب مدینہ منورہ کو رواں دواں تھے۔ ہماری باری پندرہ دن بعد مقرر ہوئی تھی لنگڑی ٹانگ سے گھوم پھر کر میں مکہ معظمہ دیکھتا رہا جہاں ماضی کے حال کی طرف بے مغز چھلانگ میں معاشرتی ورثہ پامال ہو رہا تھا۔ تیل کی دولت سے خریدے ہوئے یورپین اور امریکن ٹھیکیداروں نے رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی تاریخی عمارتیں گرا کر جدید عمارتیں کھڑی کر دی تھیں۔ اگر پرانی مسجد عائشہؓ کو مضبوط کر کے اس کی مزید سجاوٹ جدید انداز میں کر دیتے یا جدید عمارت کے کسی حصے میں پرانی مسجد کی دیوار یا محراب کو محفوظ کر لیا جاتا تو تاریخی اور تہذیبی تسلسل قائم رہتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور عیسائی ماہرین نے مسلمانوں سے ہی خطیر اجرت لے کر مسلمانوں کے ماضی کے نشان تک مٹا ڈالے ہیں۔ صلیبی جنگوں کا ایک اور روپ مکہ کی گلیوں میں اب نہ متاعِ کارواں باقی ہے، نہ احساسِ زیاں کیونکہ کعبے کے پاسباں اب صنم خانے سے آتے ہیں۔

انہی گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک دن مجھے عبدالحمید مل گیا۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا۔ ''سردار اورنگ زیب تو یہیں دفن ہو گئے۔ آپ نے بھاگ دوڑ نہیں کی۔''

''کوشش تو کی مگر شنوائی نہیں ہوئی۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''وہ نہیں سنتے جی کسی کی۔ یہاں تو ہر سال حاجی مرتے ہیں۔ مگر اخباروں میں کم ہی خبر آتی ہے۔ ان میں سے دو ایک قسمت والوں کو ہی وطن کی مٹی نصیب ہوتی ہے۔ باقی سب یہیں رہتے ہیں۔''

''مگر اکثر لوگ تو یہاں دفن ہونے کو رحمتِ خداوندی کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ آنکھ مار کر بولا۔ ''یہ بھی تو مولوی ہی کہتے رہتے ہیں نا جی۔ خدا نے تو کبھی نہیں کہا۔ مولوی تو ہمیشہ حکومت کی کہتا ہے۔ خدا کی کہاں کہتا ہے۔ مولوی تو یہ بھی کہتے ہیں کہ حج میں جتنی زیادہ تکلیف ہو گی اتنا زیادہ ثواب ہو گا۔ مگر سب بے وقوف بناتے ہیں جی بس، حکومت کی بدنظمی اور تساہل چھپانے کے لئے۔''

اس کی سوچ اور اظہار کے بیچ مصلحت یا عقل کی کوئی چھلنی نہیں تھی۔ ہر بات ذہن سے زبان تک مادرزاد برہنہ چلی آتی تھی۔ ''عبدالحمید آپ کب سے یہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سات برس ہو گئے ہیں جی... میں تو یہاں کی

دنیا کو اندر باہر سے جان گیا ہوں"۔

"واقعی؟"

اپنی چھاتی پہ ہاتھ مار کر وہ بولا۔ "سچ کہتا ہوں جی!"

"اچھا یہ بتاؤ، ہر سال جو حاجی یہاں آتے ہیں ان میں سے کوئی یہاں رک بھی سکتا ہے؟" اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ جی، یہ ممکن نہیں۔ اسی لئے تو یہ لوگ حج کا علیحدہ پاسپورٹ دیتے ہیں جو معلم کے پاس رہتا ہے اور صرف ملک چھوڑتے وقت واپس ملتا ہے، نہ ہی یہ حاجیوں کو مکے اور مدینے سے باہر جانے دیتے ہیں"۔ وہ پورے وثوق سے بولتا گیا۔

"اس کا مطلب ہے یہاں غیر قانونی طور پر کوئی بھی مقیم نہیں ہے"۔

وہ تالی مار کر ہنسا۔ "ہیں جی۔ بہت ہیں...... مگر اس کا طریقہ دوسرا ہے حج نہیں ہے"۔

"وہ کیا؟"

"وہاں سے ملازمت لے کر آئیں۔ پھر یہاں ہیرا پھیری کر کے رہتے جائیں"۔

"مگر ملازمت میں ہیرا پھیری کی گنجائش ہے کہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاہاہا"۔ وہ مجھے معصوم سمجھتے ہوئے قہقہہ مار کر ہنسا۔ "بادشاہو! مسلمان تو جہاں بھی ہوگا ہیرا پھیری ہی ہیرا پھیری ہوگی۔ بس یہ راز سمجھ میں آ جائے تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے"۔

"تو یہ راز آپ کی سمجھ میں آ گیا ہے؟"

وہ پھر ہنسا۔ "تو جی میں سات سال سے یہاں کیسے ٹکا ہوا ہوں..... شروع میں تو صرف ایک سال کے کانٹریکٹ پر آیا تھا۔ ضرورت ایسے راز سکھا دیتی ہے اگر آپ سیکھنے والے ہیں تو"۔

"اچھا تو بتاؤ۔ ایک حاجی یہاں رکنا چاہتا ہے مگر سعودی حکومت کی طرف سے اجازت نہیں مل رہی۔ کوئی صورت ہے اس کی بھی؟"

"نہیں جی..... بہت مشکل ہے۔ مگر وہ ہے کون؟"

"اختری بیگم"۔

"ایں!" وہ حیران ہو کر بولا۔ "وہ کیوں یہاں رہنا چاہتی ہیں؟ رنڈیاں تو زندہ رئیسوں سے بھی نکاح نہیں کرتیں اور وہ مردہ سردار اورنگ زیب کے ساتھ رہے گی؟"

"نہیں عبدالحمید یہ بات نہیں ہے۔" میں اچھا جا کہنے لگا تھا۔ مگر اس نے بات کاٹ دی۔

"اگر یہ بات نہیں تو پھر سے سمجھا دیں کہ یہاں اس کی پریکٹس ایسے نہیں چل سکتی جیسی پاکستان میں چلتی تھی"۔

"دیکھو، بات سمجھنے کی کوشش کرو"۔ میں نے سختی سے کہا۔ "اس نے حج کے دوران توبہ کر لی ہے اور اب وہ توبہ نبھانے کے لئے ہی یہاں رہنا چاہتی ہے"۔

اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "توبہ...... تبھی مچھلی بھی پانی سے توبہ کر سکتی ہے۔ چھڈو جی، آپ بھی بڑے بھولے ہیں"۔ اس نے منہ موڑ کر گلی کی دیوار پر تھوک دیا۔

"مگر وہ مچھلی نہیں، انسان ہے"۔ میں نے کہا اور پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بالفرض وہ واقعی نیکی کی طرف جانا چاہتی ہے تو اس کی مدد کرنے میں کیا حرج ہے۔

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"نیت کا حال تو اللہ ہی جانتے ہیں جی...... پر آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں...... اور پھر وہ ہے بھی تو میرے ہی ضلع کی نا۔ میرے پاس ایک پاکستانی

ہے اور ہے بھی بڑا تیز آدمی، شاہی محل میں اس کی عام پہنچ ہے جو چاہے کروا سکتا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں"۔

میں نے اس کا اثر ورسوخ جانچنے کے لئے پوچھا۔ "مگر وہ تمہاری بات مان لے گا؟"

"میری کہاں مانے گا جی، مجھے تو وہ گھاس بھی نہ ڈالے مگر اختری بائی کی ضرور مانے گا۔ یہ دو چار راتیں اس کے ساتھ گزارے، تو سب مان جائے گا"۔

"کچھ شرم کرو بھائی!" مجھے غصہ آنے لگا۔ "تم ..."

مگر وہ میری بات کاٹ کر بولتا گیا۔ "اوہو جی، اب کام نکالنے کے لئے اسے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ کوئی نیا کام تو نہیں کرے گی نا... ساری عمر یہی کچھ کرتی رہی ہے اور خوشی خوشی کرتی رہی ہے۔ بس اتنا ہی فرق پڑے گا کہ تو بہ چند دن کے لئے ملتوی کرنا پڑے گی، اب دیکھئے نا..."

اسے بولتا چھوڑ کر میں آگے چل دیا، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے ساتھ نہیں چل پڑا۔

مکہ کے گلی کوچوں سے ہجوم اب بھی دیگچی کے دودھ کی طرح ابلتا تھا۔ مگر لوگوں کے کندھوں کے درمیان دراڑیں پڑنے لگی تھیں اور روز بروز یہ دراڑیں زیادہ کھلی ہو رہی تھیں۔ حرم شریف میں طواف کرنے والے چہروں کی کیفیت بھی اب ذرا مختلف تھی کیونکہ اب اللھم لبیک کی گرفت سے آزاد کرنے والا طواف وداع ہوتا تھا۔ جو چہرے ابتدائی طواف میں خالص حضوری سے لت پت تھے اب خالی خالی لگتے تھے، جیسے کسی دیوار پر لگا ہوا بورڈ اتار لیا گیا ہو۔

یہ جانچنا بہت مشکل تھا کہ ان چہروں پر اب کیسا بورڈ لگے گا۔ قدویانہ عبودیت کا، راہبانہ عبادت کا یا ریاکارانہ عقلیت کا۔ نہ معلوم یہ اللہ کے گھر سے اللہ کو ساتھ لے کر جائیں گے یا اللہ کو یہیں چھوڑ کر حسب سابق خود اکیلے چلے جائیں گے۔ نہ معلوم اللہ سے ملنے کے بعد اب اللہ کے بندوں سے کیسے ملیں گے۔

مدینہ منورہ کو روانگی کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ اختری بائی کے قیام کے لئے میں مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد ارادہ کیا کہ لگی لپٹی بغیر اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کر دوں تاکہ وہ بھی اپنی واپسی کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ چنانچہ حرم شریف سے واپسی پر سرنگ سے گزرتا ہوا پاکستان ہاؤس نمبر 2 چلا گیا۔

لنگڑی ٹانگ کو دلاسے دلاتا دوسری منزل پر جانے کے لئے رک رک کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو عبدالحمید نیچے اتر رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "او جی میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں"۔

"کیوں... کیا ہوا؟"

مگر وہ کھسیانے انداز میں نگاہیں چرا رہا تھا۔ "بچھ بھی نہیں... ناں جی، بس لڑنے لگتی ہے"۔ اور وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

کمرے میں چار پانچ فرشی بستر تھے اختری بائی ایک پر بیٹھی پلو سے چہرہ ڈھانکے زار و قطار رو رہی تھی۔ کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ میں دروازے میں کھڑا ہو کر اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ناک اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں دروازے کے پاس والے گدیلے پر بیٹھ گیا۔ وہ سنبھلی، کچھ کہنے لگی مگر الفاظ ان سسکیوں میں ڈوب گئے، میں خاموش بیٹھا اندازے لگاتا رہا کہ عبدالحمید نے اس سے کیا کہا ہوگا۔

بالآخر بڑی مشکل سے وہ ہچکیوں کے درمیان بول پائی۔ "میرے وطن والے تو مجھے... یہاں بھی... جینے

نہیں دیں گے۔ کیا کروں میں؟"

وہ سمجھ گیا کہ عبدالحمید اسے اپنی تجویز پیش کر گیا ہے مگر کچھ اظہار نہ کیا۔

وہ روتی رہی اور سسکتی رہی، میں اندر ہی اندر خود سے الجھ اور لڑ رہا تھا کہ اس صورتِ حال کو کیسے سنبھالوں۔

پھر اچانک چہرہ اٹھا کر وہ سیلاب زدہ سیدھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "سردار صاحب نے آپ کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟"

سوگوار حسن کی چھلکتی آنکھوں کی تاب بھلا کون سا مرد لا سکتا ہے؟ میری اپنی نظریں اس خوبصورتی کے مرقعے پر جم کر رہ گئیں۔ میں گویا سکتے میں ڈوب گیا۔ گویائی ایسے غائب ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ کان البتہ گونجے۔ "ہندہ بشر ہوں میں"۔

وہ نہ صرف عورت تھی بلکہ عمر بھر جنسیات کے کارزار میں خالص عورت بنی رہی تھی۔ صرف مردوں کی شکاری۔ مرد کی مبہوت حسیات کے اندرونی خاموش ارتعاش کو وہ پھٹتے ہوئے آتش فشاں کی طرح پہچان سکتی تھی اور پھر اپنے نیم جان شکار کو خود ہی ابرو کی ایک جنبش سے بھسم بھی کر سکتی تھی۔ مگر وہ لمحہ کچھ ایسے چمکا کہ مجھ پر اچانک منکشف ہوا کہ اس کے اندر کی عورت اپنی ہی توبہ کی ضرب سے مر چکی ہے، اس کے کسی بھی انگ سے نسوانیت نہ چھلکی۔ کہیں سے بھی پرانی عورت نے چلمن نہ ہلائی بلکہ اس کے چہرے پر پشیمانی کا ہلکا سا سایہ لہرایا، نگاہیں جھک گئیں، چہرے کا رخ صبا سے خمیدہ پھول کی طرح ذرا سا مڑ گیا اور وہ مضبوط آواز میں بولی۔ "آپ جانتے ہیں، میں یہاں کیوں رہنا چاہتی تھی؟"

براہ راست عقلی سوال نے میرے جذباتی طلسم کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ میں سنبھلا، گڑبڑاہٹ میں میرے منہ سے نکلا۔ "ہاں، تھوڑا سا اندازہ تھا، اورنگزیب نے کچھ بتایا تھا"۔

لمبا سانس لے کر اس نے اطمینان سے سر جھکا لیا جیسے کسی ناگوار یا اعتراف سے جان بچ گئی ہو۔ دو چار منٹ ایسے ہی بیٹھی رہی پھر جھکے ہوئے چہرے سے اس کی آواز ابھری۔ "میں گم نام رہ کر نیکی کمانا چاہتی تھی اور بدنامی کی کمائی سے بچنا چاہتی تھی مگر میرا پچھلا برا نام یہاں بھی آن پہنچا ہے۔ اب میں یہاں کیسے رہوں گی؟"

"تو پھر آپ..." اپنا کام آسان ہوتے دیکھ کر میں نے ہمت پکڑی۔ "پاکستان واپس چلنے کا سوچ رہی ہیں؟"

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "واپس جا کر بھی کیا کروں گی؟"

میں مجسم سوال بن گیا "تو پھر کیا؟" میرا انگ انگ پوچھ رہا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر بے چارگی سے دونوں ہاتھ ہلا کر بولی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کدھر جاؤں"۔

میں یہ تو جان گیا تھا کہ عبدالحمید نے اختری سے کس قسم کی بات کی ہوگی مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کس انداز سے کی ہوگی۔ وہ خود اور اس کا فرض، یا اصلی با اثر دوست دونوں ہیرا پھیری والے لوگ لگتے تھے۔ اختری کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے ممکنہ بلیک میل ان سے بعید نہ تھا۔ اختری کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ اور بیرونی مایوس موڈ صاف بتا رہا تھا کہ عبدالحمید سے انتہائی ناگوار گفتگو ہوئی ہے۔ میں اس کے اتنا قریب نہ تھا کہ وہ مجھے اعتماد میں لے سکتی۔ صرف اورنگزیب ہی اس کا واحد ہمراز تھا جو اب افق پار جا چکا تھا۔ اس کا محرم ساتھی یقیناً نقلی تھا۔ اس لئے اب وہ تنہا تھی، بالکل تنہا اور جو بھی فیصلہ اسے کرنا تھا اپنے آپ سے کرنا تھا۔ اس لئے چند منٹ بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر تمہیں میری مدد کی

ضرورت ہو تو بتایئے گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھی اور میں اپنی نیم کھلی ٹانگ ہلاتا دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر آیا۔

مکہ سے مدینہ منورہ بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ آنے جانے والوں کے فون پر رابطے سے سینہ بہ سینہ اطلاعات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت ماڈرن ائرکنڈیشنڈ بسیں قطار اندر قطار حاجیوں کو مدینہ لے جا رہی تھیں مگر پاکستانی حاجیوں کو عام طور پر چھوٹی اور پرانی بسیں ملتی تھیں جن کے انجن یا ائرکنڈیشنر اکثر راستے ہی میں خراب ہو جاتے تھے اور ڈرائیور بھی حیلوں بہانوں سے پیسے اینٹھتے تھے۔ شکایات بے اثر رہتی تھیں کیونکہ پاکستانی سرکاری کارکنوں اور معلموں کی ملی بھگت اور بدویانتی ان کی پردہ پوشی کرتی تھی۔ پاکستان کی بہتری کے لئے صرف دعا میں ہی دعائیں تھیں۔ عملاً یہ معاملہ صرف خدا پر چھوڑا ہوا تھا۔ میں کئی بار اپنے معلم کے دفتر کے چکر لگاتا رہا مگر ہماری مدینہ روانگی کا پروگرام مہمل اطلاعات اور ناقص انتظامات کی وجہ سے الجھنوں میں ہی بھٹکتا رہا۔

ایک دن اچانک خبر اڑی کہ ایک پاکستانی عورت اختر بیگم نے خودکشی کر لی ہے۔ چھت کے پنکھے سے دوپٹے کا پھندا لٹکا کر چشم زدن میں مر گئی۔ سوالات اڑنے لگے.... کون تھی، کہاں سے آئی تھی، ساتھ کون تھا، معلم کون تھا، گھر والے کدھر تھے.... کسی کے پاس کوئی بھی جواب نہ تھا۔

پھر یوں لگا کہ عبدالحمید نے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کو، کوئی نہ کوئی جواب بتا دیا ہوگا۔ اب سینہ بہ سینہ افواہوں میں اختری بائی کی ساری زندگی کی تفصیلات مکہ معظمہ کی فضا میں گونجنے لگیں۔ حقیقت بھی اور فسانے بھی۔ تخیل کی اڑان اور زبانوں کی کاٹ انہیں نئی سے نئی شکل دیتے گئے۔ کہیں حیرت، کہیں تحسین، کہیں مذاق، کہیں لعن طعن۔ چٹخے مزے کی باتیں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

میرے دل میں شدید خواہش تھی کہ میں خودکشی کے بعد اختری بائی کی لاش کو دیکھ سکتا مگر ہر طرف رکاوٹ تھی۔ قانون پوچھتا۔ تمہارا اس سے کیا رشتہ تھا؟ مذہب دھاڑتا کہ تم نامحرم ہو۔ متعلقہ لوگ یاد دلاتے کہ زبان یار من "عربی" و من "مربی" نمی دانم۔ میں خودکلامی کرتا کہ میں آخر کیوں اسے دیکھنا چاہتا ہوں؟ کیا یہ حسین چہرے کے لئے تکرار تمنا ہے مگر نہیں۔ پھندے کی خودکشی سے تو چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ایسے کی ہمدردی ہے مگر نہیں المیہ تو ہزاروں سولوگوں پر بھی گزر رہا تھا۔ تو کیا کوئی روحانی کشش ہے؟ مگر نہیں۔ دل میں جھانکتا تو وہاں ہر اچھی صورت پر بری نگاہ سے زیادہ کچھ نہ تھا تو پھر کیا تھا؟

شاید وہ آلڈس ہکسلے کے اس فقرے کی تفسیر تھی جو کالج کے زمانے سے میرے ذہن میں اٹکا تھا اور عمر بھر وقتاً فوقتاً میرے لاشعور سے جھانکتا رہا تھا۔ فقرہ کچھ یوں تھا کہ صحیح بالغ نظر انسان وہ ہے جو کسی ماحول میں پروان چڑھنے کے بعد اس کے منفی پہلوؤں سے بغاوت کرے۔ درباری مزاج پاکستانی قوم میں ایسے انسان اپنی ساری عمر میں مجھے خال خال ہی نظر آئے تھے اور جو تھے وہ بھی ایک تہائی چوتھائی یا انتہائی بزدلی بلوغت والے۔ حقیقت کے موہوم سے سائے۔ جو خزانہ مجھے عمر بھر عزت کے ایوانوں میں نہ مل سکا تھا وہ اب بے عزت خوابوں میں مل گیا۔ شاید اسی لئے.... شاید.... مگر بھاگ دوڑ اور کوشش کے باوجود میری خواہش پوری نہ ہوئی اور میں وہ چہرہ نہ دیکھ سکا۔ بے لگام افواہوں کے ناپاک کانٹوں سے لدی ہوئی اختری بائی کی لاش کو مکہ معظمہ کی پاک سرزمین میں دفن کر دیا گیا۔

مکہ معظمہ میں ہماری آخری رات تھی۔ حرم شریف

میں طواف وداع کر کے ہم آدھی رات کے بعد واپس آ رہے تھے کہ بازار میں گھورنے والے حاجی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ہمیں دیکھتے ہی لپکے آئے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر میری بیوی اور دیگر ساتھیوں سے قدرے فاصلے پر لے گئے۔

''بھائی صاحب! سنا آپ نے، وہ اللہ والی تو طوائف نکلی؟ اللہ قسم طوائف تھی بالکل پوری طوائف''۔

''ہاں، سنا تو میں نے بھی یہی ہے مگر اچھا ہوا، مرنے سے پہلے حج کر گئی''۔

''اچھا ہوا!'' وہ قریباً چیخ کر بولے۔ ''کمال کرتے ہیں آپ بھی، اسے تو یہاں سے کیا ملا ہوگا مگر ہم سب لوگوں کا حج خراب کر گئی۔ ہم تو حج اکبر سے خوش ہو رہے تھے مگر وہ دودھ میں مینگنیاں ڈال گئی''۔

''حاجی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ کے دودھ میں وہ کیسے کچھ ڈال سکتی ہے؟ آپ کا اپنا حج اس کا اپنا''۔

''کمال کرتے ہیں جی آپ! اپنی ڈھیر ساری عقیدت تو ہم نے اس پر قربان کر دی، جو جھوٹ موٹ ولی اللہ بنی بیٹھی تھی''۔

''مگر اس نے تو آپ سے نہیں کہا تھا کہ وہ ولی اللہ ہے، وہ تو آپ خود سمجھ رہے تھے''۔

''کیسے نہ سمجھتے ہم، وہ ایکٹنگ جو اتنی مہارت سے کر رہی تھی۔ خانۂ خدا کو اپنی گناہ بھری ایکٹنگ سے آلودہ کر گئی''۔

میں نے کہا۔ ''حاجی صاحب! یہاں تو سبھی گناہگار آتے ہیں۔ ہمارے گناہوں سے خانۂ خدا آلودہ نہیں ہوتا بلکہ ہماری اپنی آلودگی دھل جاتی ہے''۔

''کیا دھلی جی اس کی آلودگی ـــــ دیکھئے بالآخر حرام موت مری یا نہیں! اس کی زندگی بھی حرام تھی اور موت بھی حرام ہی ملی ناں؟''

''مجھے یہ بتایئے بھائی صاحب!'' میں نے انہیں سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''اگر آج کی حرام موت سے وہ آئندہ کی ساری حرام زندگی سے بچ گئی ہے تو یہ کوئی گھاٹے کا سودا تو نہیں رہا''۔

وہ مجھے گھورنے لگے، تب میں سمجھا کہ جب وہ کچھ سمجھ نہیں پاتے تھے تو گھورنے لگ جاتے تھے اسی لئے موضوع بدلنے کو میں نے پوچھا۔ ''آپ نے طواف وداع کر لیا؟''

''ہاں تھوڑی دیر پہلے کیا تھا؟''

''چلئے مبارک ہو، آپ کا حج تو مکمل ہو گیا''۔

مگر اس خبر سے وہ اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ ایک بار پھر ابل پڑے۔ ''کہاں ہوا مکمل جی، اس کم بخت نے تو ہمارا حج ہی خراب کر دیا، مجھے اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا''۔

میں نے شرارتاً کہا۔ ''اور آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ اگلے سال کے لاکھوں حاجیوں میں ایک آدھ طوائف شامل نہ ہوگی''۔

''ہوتی رہے جی، مگر ہمیں تو پتہ نہیں ہوگا ناں اب ان شاء اللہ مدینہ شریف میں ملاقات ہوگی''۔ اور وہ غصے میں ہی ہاتھ ملا کر آگے چل دیئے۔

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک چار سو تیس کلو میٹر کا سفر دس گھنٹے میں طے ہوا۔ ویسی ہی فرسودہ گاڑی کے ذریعے اور ویسے ہی مردم آزار ڈرائیور کے ساتھ جس کی افواہیں پہلے سن چکے تھے۔ مدینہ کا ماحول مکہ سے یکسر مختلف تھا۔ مکہ میں پانچ دن کا وقت محدود مگر اجتماع لامحدود۔ یہاں ساری حدیں اپنا بند کھول دیتی ہیں۔ مدینہ میں جزوی اجتماع دو ماہ میں بکھر جاتے ہیں۔ زماں، مکاں اور مردماں کے پیمانے پھیل جاتے ہیں۔ شاید کچھ حد تک روحانی رشتے بھی بدل جاتے ہیں۔ وہاں اللہ اور بندہ یہاں رسول اور امتی۔ وہاں بنانے والے کی بندگی، یہاں سکھانے والے کی اطاعت۔ اس

کے بعد یہ فرق ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ سکھانے والا وہی کچھ سکھاتا ہے جو بنانے والے کا حکم ہے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ فرق کچھ بڑھ ہی جاتا ہے۔ مثلاً پردے کے معاملے میں بہت فرق ہے۔ خانہ کعبہ میں کھلے چہرے والی عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ۔ مسجد نبوی میں کھلے چہرے والی عورتیں عمارت کے الگ حصوں میں مگر حرمین کے باہر گلی کوچوں میں صرف مرد ہی نظر آتے ہیں عورت برقعے، نقاب اور دستانوں میں چھپ جاتی ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر میں سوچتا ہی رہا کہ اسلام اور شریعت کا کون سا روپ درست ہے۔ خدا کے گھر والا، نبی کے روضے والا، یا بادشاہ کے ملک والا۔ مصلحت کوش ملا کیا بتائے گا؟

"اللہ اکبر اللہ اکبر"۔

مسجد نبوی میں عصر کی اذان شروع ہوئی۔ ویسے تو ہر اذان کا مزہ مسجد ہی کی فضا میں آتا ہے۔ مگر مسجد نبوی میں یہ ایک پرکیف اور روح پرور تجربہ تھا۔ عرب نژاد دبنگ سی آواز، اجنبی شائقین کے کان، مطلوبہ نمازوں کے بلاوے کا انتظار۔ مائل بہ سجدہ جبین نیاز۔ طالب اور مطلوب کی یک رنگی۔ خاموش عبادت کی منظم فضا۔ نفس نفس ملا انبوہ گراں۔ یہ سارے عناصر صرف مسجد نبوی میں ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں مکہ والی دھکم پیل اور نفسا نفسی نہیں ہوتی۔ نماز کے بعد میری بیوی اور دیگر ساتھی مسجد کے ساتھ والے بازار میں گھومنے چلے گئے جہاں سے وہ مغرب کی اذان تک لوٹیں گے۔ مگر میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جس کے اوپر کی چھت سہ پہر ڈھلے کھل جاتی تھی۔

جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں سے بالکل سامنے روضہ مقدس اور اس کا سبز جنگلہ نظر آ رہا تھے۔ میں نے کوئی دانستہ پیشگی ارادہ تو نہیں کیا تھا مگر اس نظارے کے روبرو فرصت کے بہترین استعمال کے لئے میں درود شریف پڑھنے لگا۔ اس وظیفے کی یکسوئی میں غیر محسوس دھیمی اونگھ بار بار حاوی ہونے لگی۔ سبز جنگلہ بار بار دھندلا جاتا، میرا سر جھکولے کھاتا، میں دوبارہ ہشیار ہو کر درود شریف پڑھنے لگتا، پھر جنگلہ دھندلانے لگتا۔ پھر درود شریف، پھر جنگلہ اور پھر اور پھر غنودگی اور خواب .....

..... وہ بہت دور کھڑا تھا۔ مگر بالکل سامنے لگتا تھا۔ خوش شکل، خوش وضع، خوش لباس، خوش مزاج اور مسکراتا ہوا۔ میں بلند آواز میں پکارا۔ "اور نگ زیب تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا"۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا، دور ... بہت دور ..... میں نے احتجاج کیا۔ "مگر مجھے بتا تو جاتے، خواہ مخواہ پریشان کیا"۔ اب بھی وہ مجھے انتہائی دور کھڑا نظر آ رہا تھا مگر اس کی آواز سرگوشی بن کر میرے کان میں پڑنے لگی۔ جس کا ایک ایک لفظ واضح اور صاف تھا۔ یکلی فون کی بات کی طرح وہ کہہ رہا تھا۔ "میری باری تو نہ تھی مگر مجھے اچانک جانے کا حکم مل گیا۔ اختر کی کو یہاں رہنے کا طریقہ سمجھانے کے لئے"۔ اب میں نے چلا کر کہا۔ "مگر اس کی کوشش تو میں کر رہا تھا"۔

اپنے ہی چلانے سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔ سبز جنگلہ سامنے تھا۔ میرے ہونٹ درود شریف پڑھ رہے تھے اور مغرب کی اذان شروع ہو رہی تھی۔

میں نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دائیں بائیں آگے پیچھے نمازی صفوں میں بیٹھ چکے تھے۔ اوپر چھت دھندلا چکی تھی اور شام کے جھٹپٹے میں گدلا سا آسمان نظر آ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ خواب وہم ہوتے ہیں یا کچھ بتاتے بھی ہیں۔ خدا معلوم!

❖❖❖

میں بھول نہیں سکتا

امرتسر کا ایک گیٹ کیپر

کاش! میں کبھی اس سے مل کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔ ”بیٹی! تیرے باپ کو اب روٹی دینے کون جاتا ہے؟“

☆ اے حمید

آج میں آپ کو امرتسر کے ایک گیٹ کیپر کی کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی امرت ٹاکیز سے شروع ہو کر لاہور کی فلیمنگ روڈ اور لاہور ہوٹل کے اردگرد آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے اس دردناک کہانی کے اجزائے ترکیبی کو امرت ٹاکیز میں مرتب ہوتے، پروان چڑھتے، پھلتے پھولتے دیکھا اور پھر لاہور ہوٹل اور فلیمنگ روڈ کے گلی کوچوں میں ان اجزاء کے پرخچے اڑتے دیکھے۔ انہیں خاک و خون میں غلطاں دیکھا۔ میں اس کہانی کو امرتسر کے ایک پرانے سینما گھر امرت ٹاکیز سے شروع کرتا ہوں کیونکہ یہ شعلہ، جو اب راکھ بن چکا ہے، پہلے پہل اسی آتش کدے سے اٹھا تھا۔

ہال بازار امرتسر میں ایک بازار چوک گول ہٹی سے ہشم والے بازار کی طرف مڑتا تھا۔ اسے کٹڑہ جیمل سنگھ کہتے تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ کے چوباروں میں طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں۔ دن بھر اس بازار کے لکڑی کے چھجے دار مکانوں کی کھڑکیوں پر چقیں پڑی رہتیں۔ شام ہوتے ہی بازار کی رونق شروع ہو جاتی۔ چقیں اوپر اٹھ جاتیں۔ کھڑکیوں میں کہیں بجلی کے قمقمے اور کہیں لالٹینیں روشن ہو جاتیں اور ان کی روشنی میں طوائفیں خوب بن سنور کر، بج دھج کر سرخی پاؤڈر تھوپے چوکیوں یا کرسیوں پر آ کر بیٹھ جاتیں۔ یہ بت بنی شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہکاؤ مال کی طرح چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ کبھی گردن پھیر کر نیچے بازار میں آوازے کسنے والے تماشبینوں کو دیکھتیں،

ذرا سا مسکراتیں اور پھر بت بن کر بیٹھ جاتیں۔

بلو کی بیٹھک روڑیاں والی گلی کے سامنے اسی بازار میں تھی۔ گوری چٹی، بڑا خوبصورت جسم، سنہری بال اور نیلی نیلی قندیلی آنکھیں۔ اس کی بیٹھک کے نیچے اکثر تماش بینوں کا ہجوم رہتا اور عید بیساکھی پر تو بلو کو سر کھجانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ میں ان دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا اور ایم اے او سکول جاتے یا آتے ہوئے میں منہ اوپر اٹھا کر بلو کو ضرور دیکھ لیا کرتا۔ بلو بھی بن سنور کر کھڑکی میں بیٹھا کرتی۔ مجھے وہ نیلی آنکھوں والی رومن شہزادی لگتی جو اپنے سنہری بال کھولے، شاہی بجرے میں بڑی تمکنت سے بیٹھی دریائے نیل کے پرسکون پانیوں پر سیر کر رہی ہو۔ اس کی ناک میں فیروزی ننھا سا نگینہ ان کو دھوپ میں اور رات کو بجلی کی روشنی میں دمک رہا ہوتا۔ بلاشبہ بلو کنٹرہ جیمل سنگھ کی سب سے نازک اندام اور حسین طوائف تھی۔

پاکستان بننے کے کچھ ہی سال بعد میں نے اس رومن شہزادی کو ہیرا منڈی کی ایک گلی میں دیکھا تو اس کا شاہی بجرا الٹ چکا تھا۔ محل کی زرنگار خواب گاہوں میں آگ لگ چکی تھی۔ سنہری بالوں میں سفید راکھ اڑ رہی تھی۔ گورا چہرہ سوکھے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سکڑ گیا تھا اور وہ آنکھیں جو کبھی نیلی اور شفاف ہوا کرتی تھیں، اب گندے جوہڑ کے زنگار لگے پتھروں کی طرح ہوگئی تھیں۔ عیاشی کے شعلوں نے اس کے جسم کے آتش دان کو وقت سے پہلے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اب یہ آتش دان ٹھنڈا تھا۔ اس کی اکھڑی ہوئی اینٹوں میں بجھی ہوئی سرد راکھ تھی اور دیوار پر دھوئیں کے جالے لٹک رہے تھے۔

مختار بیگم عرف داری امرتسر والی کی بیٹھک بھی اسی بازار میں تھی۔ یہ بیٹھک فرینڈز ہوٹل سے ایک مکان چھوڑ کر تھی۔ یہی وہ چوبارا تھا جہاں آغا حشر کاشمیری کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں لیکن ان دنوں آغا حشر غالباً گزر چکے تھے۔ داری امرتسر والی کی بیٹھک کی بغل میں امرت ٹاکیز تھی۔ سامنے نورا اور دانے دار کھانڈ، بتاشے اور کھانڈ کے کھلونے بنانے والوں کی دکانیں تھیں۔ ذرا پرے "لاہوریاں دی ہٹی" تھی۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل کے باہر ایک اونچا لمبا شیشے کا شوکیس تھا جس میں کرسمس فادر کی شکل کا ایک بوڑھا، ہاتھ میں سرخ سوڈا واٹر کی بوتل اور گلاس لئے کھڑا رہتا۔ اس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے لگے تھے کہ بار بار اس کا بوتل والا ہاتھ گلاس کی طرف جاتا اور پھر واپس آجاتا۔ ہم سکول آتے جاتے اس کرسمس فادر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بیساکھی پر جب باہر سے دیہاتی سکھ آتے تو یہاں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ میں نے کئی بار اس ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ گدے دار اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر سوڈا واٹر اور ملک شیک پیا اور سنگ مرمر کی گول گول ٹھنڈی میزوں پر بانہیں ٹکا کر قہقہے لگائے ہیں۔ کونے میں شوکیس کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھا ایک موٹا سا لالہ، سہگل، کانن، جوتھیکا رائے اور کملا جھریا کے ریکارڈ بجایا کرتا۔

بالم آئے بسو میرے من میں

اور پھر کملا جھریا کی گائی ہوئی مشہور غزل

مجھے جس دم خیال نرگس مستانہ آتا ہے

صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے

ان دنوں یہ ریکارڈ بے حد مقبول تھے اور لوگ انہیں سن سن کر سر دھنا کرتے تھے۔ ہاں، تو میں امرت ٹاکیز کی بات کر رہا تھا جو اسی بازار میں تھا۔ امرتسر کا یہ سب سے پرانا سینما ہال تھا۔ سینما ہال کیا تھا بس ریل کا ایک لمبا چوڑا ڈبہ تھا جس کے آخر میں جاکر پردہ لگا تھا۔ اس کی مشین کے چلنے کی آواز باہر بازار تک آیا کرتی اور ہم اکثر فلموں کے گانے اور مکالمے بازار میں کھڑے ہو کر سن لیا کرتے تھے۔ پرکاش فلم کی "پارکنگ ہنٹر" وادیا مووی ٹون کی "ہنٹر والی" جس کی پہلوان ہیروئن مس نادیا ہر سین میں ہنٹر

ضرور چلتی دکھائی جاتی تھی۔ ماسٹر شیراز کی "چلتا پرزہ"۔ ہریش چندر، جلتی نشانی۔ ایک دن کی بادشاہت اور چار حصوں پر مشتمل فلم حاتم طائی میں نے اسی سینما ہاؤس یعنی امرت ٹاکیز ہی میں دیکھی تھی۔ حاتم طائی فلم شام چھ بجے شروع ہوئی اور ساری رات چلتی رہی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ڈھائی آنے والی تھرڈ کلاس کے بنچ پر اکڑوں بیٹھا بت بنا حاتم طائی کو جنات کا مقابلہ کرتے، کوہ ندا میں کالی بلا سے لڑتے اور "یا اللہ مدد" کا نعرہ لگا کر آگ کا دریا عبور کرتے دیکھتا رہا۔ جب فلم ختم ہوئی تو امرتسر شہر پر صبح صادق کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں اور سینما کے گیٹ کے باہر والد صاحب ہنٹر لئے ہم دونوں بھائیوں کے انتظار میں بڑی گرمجوشی سے ہنٹر کو بار بار ہوا میں شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔

امرت ٹاکیز کے سینما ہال میں پاپڑ اور مسالے دار چنوں کی تیز مہک ہر دم پھیلی رہتی۔ انٹرول میں چھیری والے لڑکے پاپڑ مسالے دار، چھوٹے ماکڑیاں والے اور پان سگریٹ کا اس قدر شور مچاتے کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے اپنے ساتھیوں سے چیخ چیخ کر اور بعض اوقات صرف اشاروں میں ہی باتیں کرتے۔ امرت ٹاکیز کا انٹرول کا عرصہ گزارنا دریائے شور عبور کرنے کے برابر تھا۔ امرت ٹاکیز کی ڈیوڑھی میں دونوں جانب دیواروں پر چالو فلم اور آنے والی فلموں کے فوٹو چوکھٹوں میں لگے رہتے۔ ہم ان تصویروں کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے اور پھر شام کو یا دوپہر کو گھر سے پیسے چرا کر یا بہنوں سے چھین کر فلم دیکھنے آ جاتے۔ واپسی پر ہنٹر سے خوب ٹھکائی ہوتی مگر اگلے روز پھر سینما ہال میں موجود ہوتے۔

مجھے یاد ہے ایک بار سینما میں بڑا رش تھا اور میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ سٹیج پر لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔ ایک بار اسی سینما ہال میں ملکہ ترنم نور جہاں نے، جو ان دنوں بے بی نور جہاں تھی، سٹیج پر زندہ ناچ گانا کیا تھا۔ یہ ناچ گانا میں نے آگ بجھانے والی لال لال بالٹیوں کے پاس ایک کھڈے میں بیٹھ کر دیکھا تھا۔

جس کم نصیب گیٹ کیپر کی میں کہانی سنانے والا ہوں وہ اسی امرت ٹاکیز کے مین گیٹ کا گیٹ کیپر تھا۔ بازار سے سینما کی چوڑی اور ریل کے ڈبے ایسی ڈیوڑھی میں داخل ہوں تو اس کے آخر میں لکڑی کا ایک جنگلا آ جاتا تھا۔ یہ جنگلا سینما کا پہلا دروازہ تھا۔ یہاں سے سامنے سینما کے کیبن جہاں مشینیں لگی تھیں، دکھائی دیتے تھے۔ یہاں سے ٹکٹ کٹوا کر گویا آپ سینما کے باقاعدہ تماشائی کی حیثیت سے سینما کے برآمدوں میں سے گزر کر ٹکٹ کے مطابق اپنی کلاس میں داخل ہو سکتے تھے۔ لکڑی کے اس جنگلا نما گیٹ پر ایک گیٹ کیپر لوہے کی کالی کرسی پر بیٹھا رہتا۔ تیس پینتیس کی عمر، کالی اچکن، کالے پمپ شو، سفید لٹھے کی بے داغ شلوار، سر پر سرخ مخروطی ترکی ٹوپی، گندمی چہرے پر بڑے ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، پُرسکون دھیمی دھیمی شربتی آنکھیں، تیکھا سا ناک نقشہ، ذرا لمبوترا چہرہ، دبلا پتلا مناسب قد کا تھا۔ میں نے اسے کبھی مسکراتے یا کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں لکڑی کے جنگلے پر ایک طرف چڑھ کر کھڑا ہو جاتا اور سینما ہال میں داخل ہونے والوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو یہ شوق ہوتا کہ اگر پوری فلم دیکھنے کے پیسے نہیں تو کم از کم اس کا ایک آدھ سین ہی مفت میں دیکھ لیں۔ کیونکہ سینما والے کبھی کبھی چلتی فلم میں ہال کا سامنے والا فرسٹ کلاس کا دروازہ لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لئے چوپٹ کھول دیا کرتے تھے۔ یہ دروازہ دو ایک منٹ کے لئے کھلا رہتا اور پھر بند کر دیا جاتا۔ عام طور پر یہ دروازہ فلم کے کسی مار کٹائی والے سین پر کھلا کرتا۔

ترکی ٹوپی والے اچکن پوش گیٹ کیپر نے ہمارے جنگلے پر کھڑے ہونے پر کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ تو کسی

سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ فلم دیکھنے والوں کا ٹکٹ لے کر کاٹتا۔ آدھا انہیں دیتا، آدھا لکڑی کی صندوقچی میں ڈال دیتا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہتا۔ جب کبھی رش ہوتا تو وہ اٹھ کر گیٹ کے پاس کھڑا ہو جاتا اور نظریں جھکائے جلدی جلدی ٹکٹ کاٹ کاٹ کر لوگوں کو گزارے جاتا۔

کسی وقت مشین مین کیبن سے سے اسے کوئی آواز دیتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اسے کوئی اشارہ کرتا اور پھر اپنے کام میں گم ہو جاتا۔ امرت ٹاکیز کا مالک ادھیڑ عمر کا، ڈاڑھی مونچھ صفا چٹ ایک ہندو لالہ امرت لعل تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے ہلکے ہلکے نشے میں رہتا۔ ڈھیلا ڈھالا زرد چہرہ، سر پر گول ہندوانی کالی ٹوپی، دھوتی، بوسکی کی قمیص اور سیاہ پمپ شو میں وہ جھومتا جھامتا مسکراتا ہوا سینما ہال میں ادھر سے ادھر منڈلایا کرتا۔ دو تین خوش پوش آدمی ضرور اس کے آگے پیچھے ہوتے تھے۔ ایک بار میرے سامنے یہ ہندو لالہ جنگلے کے پاس آ کر رک گیا۔ گیٹ کیپر لوہے کی کرسی پر سے احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالے نے اپنی خمار آلود پلکیں اٹھائیں اور گیٹ کیپر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”شاہ جی! کبھی ہم سے بھی کوئی بات کر لیا کرو۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟“

گیٹ کیپر نے نظریں جھکائے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

”آپ کی مہربانی ہے لالہ جی!“

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کو شاہ جی کہتے ہیں اور اس کی آواز باریک ہے اور یہ کہ وہ بولتا بھی ہے اور مسکراتا بھی ہے۔ کبھی کبھی دوپہر کو ایک میلے سے سفید برقعے والی بوڑھی عورت پانچ چھ برس کی بچی کے ساتھ گیٹ کیپر کی روٹی لے کر آیا کرتی تھی۔ بوڑھی عورت جنگلے کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔ گیٹ کیپر روٹی کا ڈبہ لے کر صندوقچی کے قریب ہی رکھ لیتا۔ بچی محبت سے اس کے ساتھ آ کر لگ جاتی۔ وہ بچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اچکن کی جیب سے ایڈورڈ کے زمانے کا تانبے کا پیسہ نکال کر دیتا۔ بچی خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ گیٹ کیپر بچی کے ماتھے پر پیار کرتا۔ بوڑھی عورت اس سے دو ایک باتیں کرتی جس کا جواب وہ ہوں یا ہاں میں دیتا۔ جاتے ہوئے برقع پوش بوڑھی عورت گیٹ کیپر کے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتی اور دعائیں دیتی بچی کو ساتھ لے کر سینما ہال کی ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتی۔

میں سوچا کرتا کہ یہ بوڑھی عورت گیٹ کیپر کی ماں ہے اور وہ بچی اس کی بیٹی ہے۔ حقیقت کیا تھی؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ میں خود ان دنوں بارہ چودہ برس کا تھا۔ میرے لئے زندگی کا بازار ابھی کھلا ہی تھا۔ ماہ و سال کے چبوتروں پر لوگوں نے ابھی اپنی اپنی دکانیں سجانی شروع ہی کی تھیں۔ زندگی کا بھرپور طاقتور، تازہ اور پُرجوش خون میری رگوں میں آگ بن کر دہک رہا تھا اور میں بہار کی خوشبو بھری مست، خوش فکر اور لاابالی ہوا کے جھونکے کی طرح امرتسر کے بازاروں، باغوں، نہروں اور کھیتوں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ خالص دودھ، مکھن، گھی، ہوا اور امرتسری پانی کی طاقت میں ہرن کی طرح چوکڑی بھرتی نگاہ میں کوئی صورت نہ ٹھہرتی تھی۔ ہر لمحے، ہر پل نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے لیکن کچھ لوگ، کچھ مناظر، کچھ ستارے ایسے تھے جنہوں نے اس وقت میری توجہ اپنی طرف کھینچی اور جنہیں میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ یہ گیٹ کیپر بھی انہی لوگوں، انہی مناظر اور ان ہی دھیمے دھیمے چمکنے والے ستاروں میں سے تھا۔

روٹی کا ڈبہ صندوقچی کے پاس رکھ کر وہ ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ خدا جانے وہ کب روٹی کھاتا تھا۔ خدا جانے وہ روٹی کھاتا بھی تھا یا نہیں۔ میں نے اسے کبھی کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ سینما گھر کے دوسرے گیٹ کیپر سارا دن چائے پیتے رہتے اور گالیاں بکتے

رہتے۔ تھرڈ کلاس کی ٹکٹ دینے والے کی کھڑکی پر جب میں لوگوں کے سروں پر سے چھلانگیں لگا کر پہنچتا تو دیوار کے چوکس سوراخ میں سے وہ مجھے ہمیشہ پاڑ کھاتا دکھائی دیتا تھا۔ سبحان اللہ! امرتسر کے پاڑوں کا بھی جواب نہیں تھا مگر یہ اچکن پوش خاموش گیٹ کیپر کبھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ میری اچکن کرتے کی جیب گڑ والی ریوڑیوں سے بھری رہتی تھی۔ میں گیٹ کے جنگلے پر چڑھا مزے مزے سے ریوڑیاں کھاتے چلتی فلم میں سینما ہال کا دروازہ چوپٹ کھلنے کا انتظار کیا کرتا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر خاموش گیٹ کیپر لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا اپنی نرم، پرسکون نگاہوں سے بازار کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا تھا کہ لڑکے! یہاں کیوں کھڑا ہے۔ چل بھاگ اپنے گھر جا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے گردوپیش سے بالکل بے نیاز ہے۔ گویا ایک بھورے رنگ کا پتھر ہے۔ جو لاکھوں مربع میل کے صحرا میں دوسروں کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے چپ چاپ پڑا ہے۔ اسے کسی سے گلہ نہ تھا کسی سے شکایت نہ تھی۔

ایک روز دوپہر کو میں گیٹ کے جنگلے پر اسی طرح کھڑا تھا کہ اس کی چھوٹی بچی روٹی لے کر آئی۔ روٹی کا ڈبہ تھام کر اس نے صندوقچی کے پاس رکھا۔ بچی کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ پھر جھک کر کچھ پوچھا۔ بچی نے جواب دیا۔

"اب آرام ہے"۔

معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کی ماں بیمار ہے۔ چنانچہ بچی روٹی لے کر آئی ہے۔ اس نے بچی کو ایڈوانس کا پیسہ دیا اور فلم دیکھنے کے لئے اوپر کیبن میں بھیج دیا۔ وہ خوشی خوشی اوپر چلی گئی۔

اگر میں اس انوکھے گیٹ کیپر کا ہم عمر ہوتا تو ضرور اس سے دوستی کر لیتا۔ اس سے پوچھتا کہ وہ کس بے زبانی قسم ہونے میں دبائے بیٹھا ہے؟ کیا اس کی بیوی سے

چھوڑ کر چلی گئی ہے جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا؟ کیا اس کا کوئی بھولا بھالا بچہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے جس سے وہ پہروں میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا؟ اس کی ننھی منی کلکاریاں سنا کرتا تھا؟ اگر یہ نہیں تو پھر اس کی زندگی سے بھرپور باتیں اور پرجوش قہقہے کون چھین کر لے گیا ہے؟ لیکن میں کم عمر تھا۔ مجھے تو اس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لوگ باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھلا میں کسی کی خاموشی کے بارے میں کیا جان سکتا تھا؟ خاموشی، جو لاکھوں پراسرار آوازوں کو جنم دیتی ہے۔ جو ہر آواز کا آغاز اور انجام ہے۔ اس کے باوجود اس شور مچاتے شہر کی آوازوں میں اس کم سخن، چپ چاپ گیٹ کیپر کی خاموشی مجھے بڑی پراسرار اور عجیب لگتی تھی۔ میں نے امرتسری قبرستان کے گورکنوں اور مسجدوں میں اذان دینے والوں کو اتنا خاموش طبع اور مرنجاں مرنج نہ دیکھا تھا اور وہ تو شہر کے پرانے اور بارونق سینما گھر کا مین گیٹ کیپر تھا۔ گویا گہما گہمی اور شور و غل کے دروازے پر کھڑا رو کر بھی وہ خاموش تھا۔ ایک دریائے شور تھا جسے وہ عبور کر رہا تھا۔ مگر اس کا اپنا دامن تر نہیں ہوا تھا۔ ایک بار سینما میں دنگا فساد ہو گیا۔

کچھ لوگ شراب پی کر زبردستی سینما ہال میں گھسنا چاہتے تھے۔ گیٹ کیپر نے انہیں روکا تو ایک شرابی نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ گیٹ کیپر یوں سکون سے کھڑا رہا، گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے شرابی نے زور سے ایک مکا گیٹ کیپر کی آنکھ پہ مار دیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر گیا۔ اس کی روئی ٹوپی دور جا پڑی۔ اتنے میں دوسرے گیٹ کیپر اور پولیس آ گئی اور انہوں نے دنگا فساد کرنے والوں کو گرفتار کر لیا۔ اچکن پوش گیٹ کیپر اس دوران میں زمین پر سے اٹھا۔ اپنی روئی ٹوپی کو آہستہ آہستہ جھاڑ کر سر پہ رکھا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھ کے اوپر بھنوؤں پر سے بہتے خون کو پونچھتے ہوئے دوبارہ گیٹ پر ڈیوٹی دینے آن کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح پرسکون اور خاموش تھا۔ وہاں نہ کوئی غصہ تھا نہ ملال ہاں حیرت کا ایک ہلکا سا احساس ضرور تھا جیسے سوچ رہا ہو۔ یہ ابھی ابھی جو چیز میری بھنوؤں سے آ کر ٹکرائی تھی کیا تھی؟

کئی روز تک اس کی داہنی آنکھ سوجی رہی۔ وہ ڈیوٹی سے ایک شو بھی غیر حاضر نہ ہوا۔ اس کی بوڑھی ماں ضرور گھر میں اس کی سوجی ہوئی آنکھ کو ٹکور کرتی ہو گی اور اس کی بھولی بھالی بچی نے ضرور پوچھا ہو گا۔ "ابو جی! آپ کو کس نے مارا ہے؟" اور مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنی بچی کو بھی کچھ نہ بتایا ہو گا۔

اب مجھے خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ شاید وہ پیدا ہی پتھر کھانے اور چپ رہنے کے لئے ہوا تھا۔ شاید اس کی پوری زندگی گلی کے اونچے نیچے پتھریلے گلی کوچوں سے عبارت تھی۔ جہاں سے وہ لوگوں کے دکھوں کی صلیب اٹھائے کانٹوں کا تاج پہنے گزر رہا تھا اور لوگ اس پر پتھر برسا رہے تھے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو پتھر کھا کر بھی پتھر برسانے والوں سے نفرت نہیں کرتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جس رات کے پچھلے پہر اذان کے وقت میں حاتم طائی کے چاروں پارٹ دیکھ کر امرت ٹاکیز کے سینما ہال سے باہر نکلا تو منیجر کے کمرے میں چق کے پیچھے بتی جل رہی تھی اور خاموش گیٹ کیپر فرش پر جانماز بچھائے قبلہ رو بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ہم میں سے کچھ شرارتی لڑکوں نے کتے کے ایک پلے کو زور سے ڈنڈا مارا وہ درد سے کلبلاتا چق کے نیچے سے منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔ جب ہم پلے کی کھوج میں اندر گئے تو دیکھا کہ پلا جانماز پر بیٹھے گیٹ کیپر کی گود میں بیٹھا چوں چوں کر رہا تھا۔ گیٹ کیپر پیار سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے تھکی تھکی سی آنکھیں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور انگلی کے اشارے سے منع کیا کہ جانور کو نہ مارو۔ ہم لوگ باہر آ گئے

اور ایک دوسرے سے ہنستے، مذاق کرتے چل دیئے۔
مجھے آج بھی گیٹ کیپر کی تھکی تھکی آنکھیں، اس کا انگلی کے اشارے سے ہمیں جانور کو مارنے سے روکنا اور بلے کا اس کی گود میں مزے سے بیٹھنا یاد ہے۔

زندگی کے سینما ہال میں وقت کی فلم بھی بڑی تیزی سے چلتی چلی گئی اور اس کے پارٹ ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میں اسی عمر میں ہندوستان کے دور دراز شہروں میں آوارہ گردی کو چل نکلا۔ جب بھی امرتسر واپس آتا تو اس خاموش گیٹ کیپر کو اسی طرح گیٹ کے پاس لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھے ٹکٹ کاٹتے دیکھتا اور پھر کسی دور دراز شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا۔ دوسری جنگ عظیم میں میں برما میں پھنس گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو فسادات شروع ہو گئے۔ رام باغ اور کٹڑہ کنہیا لعل کی طوائفیں بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں۔ یہاں زیادہ تر مکان اور دکانیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں۔ مسلمانوں نے انہیں آگ لگا دی۔ کٹڑہ کنہیا لعل سارے کا سارا آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک روز کرفیو کھلا تو میں نے اس کٹڑے میں سے گزرتے ہوئے امرت ٹاکیز کو دیکھا۔ اس کا سینما ہال جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دیواروں کا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ گیٹ بھی جل گیا تھا۔ مجھے خاموش گیٹ کیپر کا خیال آ گیا۔ خدا جانے فسادات کے اس خونیں ہنگاموں میں وہ بے ضرر کم سخن انسان کہاں ہو گا! کیا وہ اس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی سلامت ہو گی؟ اس کے تو چھرا بھی گھونپ دیا گیا تو وہ کسی کا ہاتھ نہیں روکے گا۔ کسی سے کچھ نہ کہے گا۔ ہلکی سی آہ تک نہیں بھرے گا اور چپ چاپ گلی یا بازار میں گر کر مر جائے گا۔

فسادات بھی ختم ہو گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا اور مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے ان دیکھی منزلوں کو چل پڑے۔ نئے وطن کی نئی سرگرمیوں اور نئے مسائل نے بہت کچھ وقتی طور پر بھلا دیا۔ میں بھی

> **نیکی**
>
> آپ بیج کی طرح ہوتی ہے۔ آپ آدھے تولے کا بیج بوتے ہیں، اسے پانی دیتے ہیں، پھر اس بیج میں سے ایک کونپل نکلتی ہے اور یہ کونپل آگے چل کر سینکڑوں من کے درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی شخص زمین میں پچیس تیس فٹ کا درخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر انسان سینکڑوں درختوں کے بیج بو سکتا ہے اور ہم لوگ نیکیوں کے بیج بوتے رہیں تو سوچیں نیکیاں کتنی تیزی سے دنیا میں پھیلیں گی اور دنیا جنت نظیر بن جائے گی۔ نیکی ضرور کرو، یہ نہ سوچو کہ چھوٹی ہے یا بڑی!

امرت ٹاکیز کے خاموش گیٹ کیپر کو بھول گیا۔

چھ سات برس بعد اچانک میں نے اس گیٹ کیپر کو لاہور کے پیلس سینما کے باہر دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ اچکن، لٹھے کی صاف ستھری شلوار اور پمپ شو غائب ہو گئے تھے۔ اس کی جگہ میلا سا کرتہ پاجامہ اور چپل تھی۔ چہرہ زرد اور سوگوار تھا۔ آنکھوں میں وہی دھیما دھیما درد اور سکوت تھا۔ ہونٹوں پر مہر خاموشی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سینما کے سامنے ہاتھ میں میٹھی خطائیوں کا تھال لئے کھڑا تھا۔ سر پر میلی سی روئی ٹوپی تھی۔ اب میں اسے کبھی کبھی لاہور کی سڑکوں یا سکولوں کے باہر میٹھی خطائیاں بیچتے دیکھ لیا کرتا۔ کئی بار دل چاہا کہ اس کے پاس جا کر کوئی بات کروں۔ اس سے اس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی کی خیریت پوچھوں مگر جانے کیوں میں بھی چپ چاپ اس کے قریب سے گزر جاتا۔ ہر بار جب وہ مجھے ملتا تو اس کی حالت پہلے سے خراب ہوتی۔ کپڑے زیادہ میلے کچیلے اور

چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہوتا۔ وہ خطائیوں کا تھال لیے سر جھکائے گلیوں میں سے گزر جاتا۔ کوئی بچہ اسے روکتا تو وہ رک جاتا۔ پیسے دو پیسے کا سودا بچے کو دیتا اور خاموشی سے آگے گزر جاتا۔

پھر ایک روز میں نے اسے خطائیوں کے تھال کے بغیر دیکھا۔ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ لگا سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ کسی وقت وہ گردن پھیر کر دائیں بائیں یوں دیکھتا جیسے اس کی کوئی شے گم ہو گئی ہو۔ سر کے سفید بال اور مٹی بڑھ آئی تھی۔ روی ٹوپی غائب تھی اور ٹوٹی ہوئی ... پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ مجھے اس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یوں لگا گویا اس کی تباہ حالی کا ذمہ دار میں ہوں۔ وقت لاہور کی سڑکوں پر شور مچاتا، گرد اڑاتا بھاگتا اڑتا چلا گیا۔ ایک دن میں نے اسے ایبٹ روڈ پر دیکھا۔ اس کے پاؤں سے چپل غائب تھی۔ چہرہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ پاجامے کا ایک پائنچہ پھٹ گیا تھا۔ وہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر جھکا ہوا تھا اور کاغذوں کے چیتھڑے نکال نکال کر اپنے گندے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس رہا تھا۔

اب میں نے فلیمنگ روڈ پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ دو ماہ بعد میں نے امرتسر کے اس بے زبان گیٹ کیپر کو لاہور ہوٹل کے پاس کوڑے کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھے کاغذ نکال نکال کر جیبوں میں بھرتے دیکھا۔ اس کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ لمبے لمبے سفید بالوں میں لاہور کے ہر بازار، ہر گلی کوچے کی مٹی بھری تھی۔ داڑھی مونچھوں کے خاکستری بالوں میں زرد، مٹی رنگ کا سوجا ہوا بے جان چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا، سفید آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ ... ہی گندے مندے کاغذوں سے بھری ہوئی گانٹھ رکھی تھی۔ وہ کوڑا کرکٹ بھی کرید رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا۔

میں نے آخری بار اسے اسی بازار میں ایک مسجد کے باہر دکان کے تھڑے پر گندے چیتھڑوں کے گٹھڑ سے ٹیک لگائے اونگھتے ہوئے دیکھا۔ میں قریب سے گزرا تو اس نے ایک پل کے لئے اپنی سوجی ہوئی پلکیں اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ایک پل کے لئے رک گیا۔ ایک پل کے لئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ اسی طرح پتھر بنا اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتا گیا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ مٹی اور چیتھڑوں کا جو گندا سندا ڈھیر سا دکان کے تھڑے پر رکھا ہے، کیا یہ وہی کم سخن، اچکن پوش خوش لباس گیٹ کیپر ہے جو آج سے عرصہ پہلے امرتسر کے ایک سینما گھر کے گیٹ پر لوہے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا ٹکٹ کاٹا کرتا تھا اور جسے اس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی معصوم بچی روٹی دینے آیا کرتی تھی؟ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سفید بالوں اور چہرے کی دکھ بھری لکیروں والا آدمی وہی چھوٹا سا لڑکا ہے جو بڑی بے فکری سے میرے پاس گیٹ کے جنگلے پر چڑھ جاتا، جیب سے ریوڑیاں نکال نکال کر کھایا کرتا تھا؟

ہم دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقت کی برق رفتار گاڑی ہم دونوں کو زندگی کے ویران اسٹیشن پر اکیلا چھوڑ کر بہت دور نکل چکی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور میں آگے چل دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانے اب وہ کہاں ہے! اس کی دکھی ماں اور معصوم بچی کہاں ہے؟ وہ یقیناً اب بڑی ہو گئی ہو گی۔ کاش! میں بھی اس سے مل کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

”بٹی! تیرے باپ کو اب روٹی دینے کون جاتا ہے؟“

☆・☆

مسیحا یا موت

وہ کھلی آنکھوں سے رنگین خواب دیکھ رہے تھے اور ان خوابوں کو حقیقت میں ڈھالنے کے لئے ہر حد پھلانگنے کو تیار تھے۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

اطہر قصور کا باشندہ تھا۔ اس کے کنبے میں بیوی حور یہ، پانچ بیٹیاں ماہ لقا، زورا، زینب، شانیہ اور تمنی کے علاوہ دو بیٹے نبیل اور شکیل تھے۔ چھوٹا بھائی حمزہ اور بوڑھا باپ ثروت بھی اطہر کے ساتھ رہتے تھے۔ کوٹ مراد خاں میں واقع مین بازار میں اطہر سبزی کی دُکان چلاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تھوڑی سی جشتی زمین تھی۔ زمین کی پیداوار اور دُکان کی آمدنی سے جیسے تیسے پورے کنبے کا خرچ چل رہا تھا۔ شکیل کی چاچی کا نام عائشہ تھا۔ وہ فیروز پور کے پاس واقع سٹیل پائچ مرکز میں بچوں کے لئے مذ سے میل بنانے کا کام کرتی تھی۔

شکیل چار سال کا ہو گیا تو حوریہ نے اسے سٹیل پائچ مرکز میں پڑھنے کے لئے بھیجنا شروع کر دیا۔ صبح آٹھ بجے شکیل چاچی عائشہ کے ساتھ جاتا اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک اسی کے ساتھ واپس لوٹ آتا تھا۔

روزانہ کی طرح 22 اکتوبر 2013ء کو بھی صبح آٹھ

بجے ننھا شکیل اپنی چاچی عائشہ کے ساتھ سنگل باغ میں پڑھنے گیا تھا۔ مذاق سے کیل بنا کر ساڑھے گیارہ بجے تک عائشہ گھر لوٹ آئی مگر شکیل اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی بابت دریافت کرنے پر عائشہ نے بتایا۔ سنگل باغ سکول میں چھٹی کے بعد شکیل مجھے نہیں دکھائی دیا تو میں یہ سوچ کر چلی آئی کہ وہ اکیلا ہی یا دوسرے بچوں کے ساتھ گھر لوٹ آیا ہوگا۔

> دھوکا اور دکھ اس وقت انتہائی شدید ہوتے ہیں جب وہ اس شخص کی جانب سے ملے جس پر ہمیں بہت گہرا مان ہوتا ہے۔

پریشانی کا سبب یہ تھا کہ معصوم شکیل گھر نہیں لوٹا تھا۔ عائشہ کا جواب سن کر حوریہ گھبرا گئی اور عائشہ کو ساتھ لے کر فوراً سنگل باغ کی طرف بھاگی لیکن شکیل وہاں نہیں ملا تو پورے قصور میں اسے تلاش کیا لیکن شکیل کہیں نہیں ملا۔ اب تو حوریہ کا کلیجہ کٹنے لگا مالی نے شوہر کو فون کر کے کوٹ مراد خاں سے گھر بلا لیا۔

اطہر نے بھی اپنے اطمینان کے لئے سنگل باغ تک شکیل کو ڈھونڈا لیکن اس کا کچھ بھی پتہ نہیں چلا۔ شہر کے متعدد لوگ بھی شکیل کی تلاش میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہی میں اطہر کا پڑوسی نوجوان نوال سرا بھی تھا۔ اس نے اطہر کو مشورہ دیا کہ وہ رکشے پر لاؤڈ سپیکر سے چاروں طرف منادی کرائے۔ اگر کسی نے شکیل کو دیکھا ہو گا تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ یہ کام بھی کیا گیا۔

چاچا تم دربار بابا بلھے شاہ کی طرف جاؤ، میں دوسرے رکشے پر لاؤڈ سپیکر بندھوا کر آس پاس کے گاؤں میں اعلان کرتا ہوں"۔ نوال سرا نے ایک اور مشورہ دیا۔

شہر کے کچھ لوگوں کے ساتھ اطہر رکشہ لے کر دربار بابا بلھے شاہ کی طرف چلا گیا۔ نوال سرا اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ آس پاس کے گاؤں میں اعلان کرتا گھومنے لگا۔ شام تک اعلان کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا اس لئے سب لوگ شہر لوٹ آئے۔ اس کے بعد نوال سرا کے مشورے پر اطہر نے تھانہ بی ڈویژن جا کر انسپکٹر نوید پہلوان سے ملاقات کر کے شکیل کی گمشدگی کی بابت بتایا اور گمشدگی درج کرا دی۔ جیسے تیسے رات کٹ گئی۔

> پہلے خون کے رشتے ہوتے تھے اب رشتوں کا خون ہوتا ہے۔

23 اکتوبر کو صبح سے ہی متعدد بہی خواہ اطہر کے گھر جمع ہو گئے۔ حوریہ کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ 24 گھنٹے ہو گئے تھے۔ مگر اس کے منہ میں روٹی کا ایک نوالہ بھی نہیں گیا تھا۔ تقریباً 9 بجے اطہر کا موبائل فون بجنے لگا، اطہر نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارا مسیحا بھی ہو سکتا ہوں اور موت بھی۔ تم لوگ شکیل کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو تو سنو! شکیل کو ہم نے اغوا کر لیا ہے اور وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کی صحیح سلامت واپسی چاہتے ہو تو نقد پچاس لاکھ روپے کا انتظام کر لو۔ اگر تم نے اغوا برائے تاوان کی یہ رقم ہمیں نہیں دی تو ہم شکیل کو چھ انچ چھوٹا کر دیں گے، چھ انچ چھوٹا کرنے کا مطلب سر قلم۔"

اطہر کا سر چکرانے لگا۔ ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ یہ دیکھ کر حوریہ چیخنے لگی۔ حمزہ دروازے پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ حوریہ کی چیخ سن کر وہ دوڑا آیا۔ بھائی کو سنبھالا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ دو تین گھونٹ پانی پلایا تو اطہر کو کچھ ہوش آیا۔ پھر اس نے شکیل کے اغوا ہونے اور تاوان کے لئے پچاس لاکھ روپے کے مطالبے کی بات بتائی۔ یہ سن کر سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئیں اطہر نے اپنی زندگی میں پچاس ہزار روپے بھی یک مشت نہیں دیکھے تھے، پچاس لاکھ کہاں سے لاتا۔

> اندھی محبت ہو یا اندھا اعتبار دونوں مل کر انسان کو گہری کھائی میں گرا دیتے ہیں۔

حمزہ نے فوراً بڑے بھائی کو سائیکل پر بٹھایا اور تھانہ بی ڈویژن پہنچ گیا اور پولیس کو یہ تاوان والی رقم کی بات بتائی۔ نوید پہلوان دونوں بھائیوں سے اس معاملے میں پوچھ گچھ کر ہی رہے تھے کہ ایس ڈی پی او صدر سرکل عظیم رضا بھی تھانے آ گئے اور وہ بھی پوچھ گچھ میں شامل ہو گئے اور اس معاملے کا مقدمہ درج کر کے دونوں کو گھر بھیج دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد عظیم رضا اور نوید پہلوان بھی پولیس جیپ سے شہر پہنچ گئے۔ دونوں افسروں نے کوٹ مراد خاں سے شکیل باغ چوک تک کا معائنہ کیا۔ یہ فاصلہ زیادہ تھا نہ راستہ سنسان تھا۔ اگر زبردستی شکیل کا اغوا کیا ہوتا تو واردات شہر والوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی ایسا شخص شکیل کو لے گیا تھا جسے شکیل پہلے سے جانتا تھا۔ ممکنہ موقع معائنہ کرنے کے بعد عظیم رضا اور نوید پہلوان اطہر کے گھر آ کر بیٹھ گئے اور گھریلو افراد سے ان کی کسی نئی پرانی رنجش یا جائیداد تنازعہ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اسی دوران عظیم رضا کی نگاہیں بوڑھے ثروت پر مرکوز ہو گئیں۔ انہیں لگا کہ وہ کچھ بتانا تو چاہتا تھا لیکن کسی وجہ سے بتا نہیں پا رہا تھا۔ نوید پہلوان نے ثروت کو اپنے پاس بلایا اور اسے اعتماد میں لے کر بات چیت کی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"صاحب جی! اپنے پوتے کے اغوا کا ذمہ دار میں ہوں۔" ثروت نے روتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود تمام لوگوں کے منہ یہ سن کر حیرت سے کھلے رہ گئے۔

ثروت نے جلدی سے بات آگے بڑھائی۔

"انسپکٹر جی! دراصل بات یہ ہے کہ کوٹ مراد خاں کے ہی علاقہ میں میری کچھ جائیداد تھی جس پر وہاں کے کچھ قبضہ مافیا کے لوگ قابض ہونا چاہتے تھے۔ لہٰذا میں نے خفیہ طریقے سے اونے پونے داموں میں یہ زمین فروخت کر دی۔ یہاں تک کہ اس سودے کے بارے میں اپنے بیٹوں تک کو کچھ نہیں بتایا"۔

"وہ جائیداد تم نے کتنے میں فروخت کی؟" عظیم رضا نے سوال کیا۔

"پورے سترہ لاکھ روپے میں"۔ ثروت نے بتایا۔

اب بات سمجھنا مشکل نہیں تھی، کسی کو اس سودے کا علم ہو گیا تھا۔ اسی نے شکیل کو اغوا کر لیا تھا اور تاوان کے طور پر پچاس لاکھ روپے وصول لینا چاہتا تھا۔

> بدلتا وقت اور بدلتے لوگ کبھی کسی کے ہوا نہیں کرتے۔

مذکورہ معلومات سے اب یہ معاملہ چھوٹا نہیں رہ گیا تھا بلکہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس لئے عظیم رضا نے اس کی اطلاع اعلیٰ افسروں کو دے دی۔ اعلیٰ افسران نے فوراً دیگر پولیس والوں کو اس کیس میں شامل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جس موبائل نمبر سے فون کر کے اطہر سے اغوا برائے تاوان کی رقم طلب کی گئی تھی، اسے بھی سرویلانس پر لگا دیا گیا۔

23 سے 25 اکتوبر تک اطہر کے پاس تاوان مانگنے کے فون برابر آتے رہے۔ پولیس ان نمبروں کی پڑتال کرتی تو یہی معلوم ہوتا کہ یہ فون کوٹ مراد خاں کے کسی پی سی او سے کیا گیا تھا۔ ایک دو بار موبائل فون ٹریس ہوا تو جانچ میں پتہ چلا کہ سم کارڈ لینے کے لئے موبائل کمپنی کے پاس جمع کیا گیا آئی ڈی کارڈ فرضی تھا۔

> مجبوریوں کے دور میں جان سے عزیز لوگ دغا نہ بھی دیں تو بدل ضرور جاتے ہیں۔

پولیس کی اب ساری امیدیں صرف اس نمبر پر ٹکی ہوئی تھیں جس سے اطہر کو پہلی بار اغوا کار نے فون کیا تھا۔

وہ سم کارڈ بھی لاہور کے پتے کی فرضی آئی ڈی دے کر حاصل کیا گیا تھا لیکن اس کی لوکیشن کوٹ مراد خاں ہی ٹریس ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اغوا کار شہر کا ہی کوئی شخص تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شکیل کو کوٹ مراد خاں کے ہی کسی گھر میں چھپا کر رکھا گیا ہو۔

30 اکتوبر کو ایس ڈی پی او صدر سرکل عظیم رضا اور انسپکٹر تھانہ صدر عرفان باجوہ سادہ لباس میں بائیک سے کوٹ مراد خاں پہنچے۔ انہوں نے خود کو تحصیل میں کام کرنے والا بتایا اور بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے خواہش مندوں کا انتخاب کرنے کے لئے میٹنگ کے بہانے کوٹ مراد خاں والوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ اس کے بعد عرفان باجوہ نے ہر ایک محلے والے سے پوچھنا شروع کیا کہ اس کا نام بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی فہرست میں ہے یا نہیں۔ ہر محلے والے کا نام، پتہ اور موبائل نمبر بھی وہ رجسٹر ڈ میں نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ پولیس کی یہ چال کامیاب رہی۔

ایک نوجوان نے جیسے ہی اپنا موبائل نمبر نوٹ کرانا شروع کیا تو وہ چونک گئے۔ عظیم رضا اور عرفان باجوہ اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس کا موبائل نمبر وہی تھا جس سے اظہر کو پہلی بار فون کر کے پچاس لاکھ روپے تاوان کی رقم مانگی گئی۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں اظہر کا پڑوسی نوال سمرا تھا۔

22 سالہ نوال سمرا کے باپ کا نام لالہ احمد علی تھا۔ نوال سمرا کوٹ مراد خاں میں واقع گورنمنٹ ڈگری کالج میں بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ نوال سمرا کا موبائل نمبر بتانا ہی اس کی گرفتاری کا باعث بن گیا۔ پولیس نے نوال سمرا کو تھانہ بی ڈویژن لے جا کر پوچھ گچھ کی تو اغوا کی واردات پرت در پرت کھلتی چلی گئی۔

یہ دراصل تین دوستوں کی ٹکڑی تھی۔ نوال سمرا، نن مصلی، اچھو بھورا۔ نن مصلی اور اچھو بھورا بھی کوٹ مراد میں اپنے کنبے کے ساتھ رہتے تھے۔ 19 سالہ نن مصلی کے باپ کا نام اصغر مصلی تھا۔ باپ بیٹے دونوں ہی ایک اینٹ بھٹہ پر نوکری کرتے تھے۔ اچھو کی عمر 19 سال تھی۔ وہ کوئی کام وام نہ کر کے آوارگی میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا باپ شہر میں مردہ جانور اٹھایا کرتا تھا۔ اس کا نام سوہنا مصلی تھا۔ تینوں دوست غیر شادی شدہ تھے۔ ہر روز شام کو تینوں کی بیٹھک جمتی تھی جہاں وہ کھلی آنکھوں سے رنگین خواب دیکھا کرتے تھے۔ پیسے کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار تھے لیکن کریں کیا اس کی کوئی راہ انہیں بھائی نہیں دے رہی تھی۔

10 اکتوبر کو با اعتماد ذرائع سے نوال سمرا کو معلوم ہوا کہ ثروت نے دوسرے گاؤں کی اپنی جائیداد 17 لاکھ روپے میں بیچی ہے اور نقدی کی صورت میں سارا پیسہ گھر میں چھپا کر رکھے ہوئے ہے۔ بس، اس کے خرافاتی دماغ نے اس رقم کو ہڑپنے کی منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔

شام کو روزانہ کی طرح محفل جمی تو نوال سمرا نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتائی۔ اچھو بھورا ہنس کر بولا۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر ان بھوکوں کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔

”تصور سے بڑھ کر پیسہ ہاتھ میں آ گیا“۔ نن نن نے چٹکی لی۔ ”اس کے باوجود سب پھٹے حال گھوم رہے ہیں، وہ سترہ لاکھ روپے کس کام آئیں گے جو انہوں نے گھر میں چھپا رکھے ہیں؟“

”میں نے تو حوصلہ کر لیا ہے“۔ نوال سمرا نے باری باری دونوں دوستوں کو دیکھا۔ ”اگر تم لوگ بھی ہمت کر لو تو سترہ لاکھ میں سے پندرہ لاکھ روپے ہمارے ہو سکتے ہیں“۔

پھر نوال سمرا نے شکیل کو اغوا کر کے تاوان وصول کرنے کا منصوبہ دوستوں کو بتایا تو وہ فوراً اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے خوشی خوشی تیار ہو گئے۔

روپیہ جتنا بھی گر جائے مگر اتنا کبھی نہیں گر پائے گا جتنا روپیہ کے لئے انسان گر چکا ہے۔

منصوبہ تو پورا تیار تھا لیکن انہیں انتظار تھا مناسب موقع کا۔ اس لئے وہ تینوں لگاتار گھات میں لگے رہے۔ شکیل کو اغوا کرنے کا موقع 22 اکتوبر کو صبح 10 بجے تب ملا جب شکیل کھیلتے کھیلتے سنبل باغ مرکز سے باہر آ گیا۔ نوال سمرا نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے لے جا کر کچھ دور کھڑے ٹن ٹن اور اچھو بھورا کو سونپ دیا۔ وہ لوگ بسکٹ اور چاکلیٹ کا لالچ دے کر شکیل کو بی آر بی نہر پر لے گئے۔ آگے کیا کرنا ہے یہ پہلے سے طے تھا۔

کافی مضبوط ڈوری سے شکیل کا گلا کس کر ان تینوں نے اس کا قتل کر دیا۔ اس کے بعد لاش کو وہیں گڑھا کھود کر دفنا دیا۔ اپنا کام نپٹا کر الگ الگ راستوں سے وہ تینوں شہر لوٹ آئے۔ تب تک شہر میں شکیل کی گمشدگی کا غل مچ چکا تھا۔ نوال سمرا کے بیان کے بعد ٹن ٹن اور اچھو بھورا کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور یکم جنوری 2014ء کو ملزموں کی نشاندہی پر لاش کی برآمدگی کے لئے بی آر بی نہر کی کھدائی کرائی گئی تو وہاں بسکٹ کے پیکٹ کا ریپر اور چیتھڑوں کی شکل میں شکیل کے کپڑے تو مل گئے مگر لاش نہیں ملی۔ لاش کو شاید گیدڑ دوسرے گوشت خور جانور کھا گئے تھے۔

پیسہ نہ ہونے کی مجبوری ثروت کا کنبہ برداشت کر رہا تھا۔ گھر میں پیسہ آیا تو اس کی مصیبت بھی اس نے دیکھ لی۔ بہرحال تادم تحریر تینوں ملزم جیل میں تھے۔

تعلق گو دو طرفہ ہوتا ہے لیکن دل پر گزرنے والی واردات کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ کبھی کسی کے لئے تعلق کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور کوئی جان ہار جاتا ہے۔

تلخیص

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

بنگل گیٹ - 2

موساد کی کامیابیوں کا زیادہ تر انحصار مکروفریب، جھوٹ اور ہلاکتوں پر ہوتا تھا اور اسی وجہ سے اسرائیل زندہ رہ سکا۔

قسط:17 ☆ ----------0300-4154083---------- میاں محمد ابراہیم طاہر

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ہالوی سفارتکاری کا تسلیم شدہ ماہر تھا۔ اس نے 1994ء میں اردن کے ساتھ مذاکرات کرانے اور امن کا معاہدہ کرانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کی سرگرمیوں سے کئی سال دور رہا تھا۔ اس کے موساد سے قطع تعلق ہونے کے بعد سے ادارے میں مسلسل خرابیاں در آئی تھیں اور وہ زد بہ زوال تھا۔ سینئر افسر کنٹرول سے باہر ہو چکے تھے اور اپنی اپنی ترقی کے لئے جھوٹے سچے آپریشنوں کے دعوے داخل کرتے رہتے تھے، حالانکہ ان میں سے اکثر وسطی عمر کے لوگ دفتر سے باہر نکلتے ہی نہ تھے۔ کیا ہالوی ان سے سختی کے ساتھ نمٹنے کی جرأت کر سکے گا؟ کیا نئے ڈائریکٹر جنرل کے پاس وہ تجربہ اور ہنر موجود تھا کہ ادارے کے ملازمین کے حوصلے بلند کر سکے؟ بر حل میں کاک ٹیل پارٹیوں اور سفارتی سرگرمیوں کے دوران اس نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے ایک ایسے ادارے کی قیادت کرنی پڑے گی جو تباہی کے کنارے اور جس کے ملازمین استعفے دینے کو تیار بیٹھے تھے۔ ہالوی کو آپریشنل فیلڈ کا بھی کوئی ذاتی تجربہ نہ تھا۔ ماضی میں اس نے موساد کے ساتھ جو وقت گزارا تھا، وہ دفتر کام، میز کرسی کے گرد گزارا تھا اور دو سال میں وہ کچھ کر سکے گا؟ یا اسے وہاں محض اس لئے لگایا گیا تھا کہ نیتن یاہو جو کچھ چاہے، یہ اس پر بڑ سٹیمپ کرتا جائے یا اس کی بیوی سارہ کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے۔ اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی میں سارہ کے کردار بارے بھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ یاطوم کو نکلوانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا کیوں کہ یہ شروع سے ہی اسے ناپسند کرتی آ رہی تھی۔

ہالوی نے سارہ کو خوش کرنے کا تو ایک طریقہ ڈھونڈ لیا۔ اس نے وزیراعظم کی بیگم کو ایک میکرو چپ پیش کی جو موساد کے سائنسدانوں نے اپنی لیبارٹری میں تیار کی تھی۔ اگر سارہ اسے اپنے جسم میں جلد کے نیچے لگوا لے اور ایسی صورت حال میں کہ دہشت گرد اسے اغوا کر لیں تو اسے برآمد کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ انسانی جسم کی حرارت سے کام کرنے والی اس چپ کا رابطہ سٹلائٹ سسٹم سے رہے گا جس سے اس چپ کو پہننے والے شخص کی موجودگی کی جگہ کا سراغ لگانے میں فوری مدد مل سکے گی۔ کسی کو علم نہیں کہ سارہ نے یہ چپ اپنے جسم میں داخل کروائی یا نہیں۔

اسی دوران کچھ دیگر مسائل سامنے آ گئے اور سارہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا کام درمیان میں ہی لٹک گیا۔ پہلا اہم آپریشن جس کی ہالوی نے خوشدلی سے منظوری دی وہ قبرص میں جاسوسی اڈا قائم کرنے کا کام تھا، یہ ابتدا میں تباہی سے دوچار ہو گیا۔ دو ایجنٹ جو سیاحوں کے روپ میں وہاں تعطیلات گزارنے گئے تھے، قبرص کی چھوٹی سی لیکن انتہائی مستعد و بیدار سیکیورٹی سروس نے بے نقاب کر دیئے۔ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے جو اپارٹمنٹ کرائے پر لیا ہوا تھا، وہاں چھاپہ مارا گیا اور بھاری مقدار میں ہائی ٹیک آلات پکڑے گئے جن سے قبرص کی دفاعی تنصیبات کی جاسوسی کے نقشے اور اس کے ہمسائے ترکی کی جاسوسی کے منصوبے برآمد کر لئے گئے۔

ہالوی نے اپنے ایجنٹوں کی رہائی کے مذاکرات کے لئے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر کو قبرص بھیجا۔ وہ بعد میں سوچتا ہوگا کہ کاش وہ خود جاتا۔ اسرائیل کا صدر ایزر ویز مین (Ezer Weisman) قبرص کے صدر بیافکوس کلاریڈز (Biafcos Clerides) کا ذاتی دوست تھا (اپنی جوانی کے دنوں میں دونوں نے رائل ائرفورس کی نوکری کی تھی۔ ویز مین نے اپنے چیف آف سٹاف کو قبرص بھیجا کہ میٹھے حلوے کا مزہ چکھ کر آئے۔ پھر ہالوی کو بلا کر اس کی ایسے طریقے سے خبر لی کہ شاید نیتن یاہو نے یاطوم کی بھی نہ لی ہوگی۔

اس کو اگلی شرمندگی اور پریشانی اس وقت اٹھانی

بڑی جب اس نے ایک نئے آپریشن، صدام حسین کے قتل کے منصوبے کی منظوری دی، جب صدام نے اپنی داشتہ کو ملنے جانا تھا۔ اس خفیہ منصوبے کو اسرائیل کے ایک اخباری نمائندے کو "لیک" کر دیا گیا اور رپورٹر نے تبصرے کے لئے وزیراعظم کے دفتر سے رابطہ کر لیا۔ چنانچہ یہ منصوبہ منسوخ کرنا پڑا اور ہالوی نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور اپاہج محسوس کیا۔

کئی ہفتے تک گرم مزاج وزیراعظم نیتن یاہو نے ہالوی سے رابطہ قائم نہیں کیا سوائے چند اہم مواقع کے۔ نومبر 1998ء کے آخر میں ترکی وزیراعظم بلند ایکویت نے نیتن یاہو کو ٹیلیفون کیا اور پوچھا کہ کیا موساد کردش لیڈر عبداللہ اوکلان کو پکڑنے میں مدد کر سکتی ہے، جسے دنیا کے بہت سے ممالک نے پہلے ہی دہشت گرد قرار دے رکھا تھا۔ ترکی اپنی سرزمین پر 30 ہزار لوگوں کے قتل کا اسے ذمہ دار سمجھتا تھا۔ تقریباً 20 سال سے زائد عرصے سے اوکلان کی کردش ورکرز پارٹی، پی کے کے (PKK) نے ترکی کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رکھی تھی۔ اوکلان 12 ملین کردوں کے لئے خود مختاری حاصل کرنے کا دعویدار تھا جنہیں اقلیتی حقوق جیسے اپنی زبان میں تعلیم اور نشر و اشاعت کی اجازت حاصل نہ تھی۔

اوکلان ترکی کی سیکیورٹی سروس کی گرفت سے آسانی سے بچتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ایک ایسا لیڈر تھا جس نے اپنے لوگوں کو اپنے سحر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر بچہ، بوڑھا، جوان، مرد، عورت اس کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جہاں بھی دو کرد اکٹھے ہوتے اس کی تعریف کے گن گاتے رہتے تھے۔ اس کی تقریریں اپنے لوگوں میں اتنا جوش و ولولہ پیدا کر دیتی تھیں کہ وہ ترکی بالادستی سے ٹکرانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

اسی نومبر میں اوکلان ماسکو (Mosco) میں میٹنگ ملاقاتوں کے بعد روم آ گیا۔ اٹلی کی حکومت نے اسے ترکی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا لیکن ساتھ ہی اس کی سیاسی پناہ کی درخواست بھی مسترد کر دی۔ قبل ازیں جرمن حکومت کے جاری کردہ وارنٹ پر جعلی پاسپورٹ پر سفر کرنے کے جرم میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ بعد ازاں جرمن حکومت نے اس کی حوالگی کا مطالبہ اس خوف سے واپس لے لیا تھا کہ اس سے جرمنی میں بھاری تعداد میں مقیم کردش کمیونٹی میں اشتعال پھیل جائے گا۔ لہٰذا اوکلان کو رہا کر دیا گیا تھا۔ یہی وقت تھا جب ترکی کے وزیراعظم بلند ایکویت نے نیتن یاہو کو ٹیلیفون کیا تھا۔

اسرائیل، ترکی کے ساتھ اپنے سفارتی اور مختلف اہم نوعیت کے تعلقات کو ریجن میں اپنی بقا کے لئے بہت اہم سمجھتا تھا۔ نیتن یاہو نے وعدہ کر لیا اور ہالوی کو حکم دیا کہ اوکلان کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ اس آپریشن کا نام "بلیک آپریشن" رکھا گیا کیونکہ اس میں موساد کے ملوث ہونے کا ذکر بھی نہیں آتا تھا۔

اس آپریشن کو کوڈ نام "واچ فل" دیا گیا۔ اس آپریشن سے ہالوی کو اپنے عراق کے اندر شروع کئے گئے آپریشن کے متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا کیونکہ وہ باقی کردوں کے ساتھ مل کر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے صدام حکومت کو غیر مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔

موساد کے چھ ایجنٹوں کو روم روانہ کیا گیا۔ ان میں ایک عورت بیت لیویحا اور دو کمیونیکیشن کے ماہرین بھی شامل تھے۔

موساد کے ایک محفوظ ٹھکانے پر رہتے ہوئے موساد کے ایجنٹوں نے اوکلان کے اپارٹمنٹ جو ویٹیکن کے قریب واقع تھا نگرانی شروع کر دی۔ خاتون ایجنٹ کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ وہ کسی بھی طریقے سے اوکلان سے رابطہ قائم کرے۔ یہ وہی طریقہ تھا جو کئی سال پہلے اس شہر میں ایک دوسری خاتون ایجنٹ نے مورد یخائی

دانوتو کو پھانسنے اور اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے اختیار کیا تھا لیکن اوکلان کو اسی طریقے سے پھانسنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا کیونکہ کرد رہنما، اچانک اٹلی سے باہر چلا گیا۔ موساد کی ٹیم نے میڈی ٹیرین کے ساحلی علاقوں کو اس کی تلاش کے لئے کھنگالنا شروع کردیا۔ سپین، پرتگال، تیونس، مراکش، شام کے ساحلوں پر اس کی تلاش کی گئی۔ اوکلان ان سب ملکوں میں جا چکا تھا تاکہ اگر ٹھہرنے کی اجازت نہ ملے تو آگے نکل جائے۔ 2 فروری 1999ء کو کردش لیڈر کو ہالینڈ میں داخلے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ ایک ڈچ سکیورٹی افسر، جو ایمسٹرڈیم (Amsterdam) ائرپورٹ پر تعینات تھا، نے موساد کے مقامی سٹیشن کے انچارج کو اطلاع کر دی کہ اوکلان کو کے ایل ایم ائرلائن کی نیروبی کی فلائٹ پکڑتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے تعاقب میں موساد کی ٹیم بھی جمعرات 5 فروری کو کینیا کے دارالحکومت نیروبی پہنچ گئی۔

کینیا اور اسرائیل کے درمیان گزشتہ دہائیوں میں باہمی تعاون اور جاسوسی کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد اور انٹیلی جنس ایجنسیوں میں اطلاعات کی فراہمی کے خاموش معاہدے طے پائے ہوئے تھے۔ بظاہر سیر و سیاحت کے دوروں کے دوران موساد کینیا کی خفیہ ایجنسی کو دوسرے ملکوں کی کینیا کے اندر سرگرمیوں سے آگاہ کرتی رہا کرتی تھی۔ اس کے بدلے میں کینیا کی حکومت نے موساد کو ترجیحی اور خصوصی درجہ دے رکھا تھا اور شہر کے اندر ایک محفوظ ٹھکانہ قائم کرنے اور وہاں اپنے ایجنٹ رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کینیا کی مختصر مگر انتہائی مستعد اور برق رفتار ایجنسی موساد سے تعاون و امداد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔

موساد کی ٹیم نے جلد ہی اوکلان کی نیروبی میں یونانی سفارتخانے کے احاطے میں موجودگی کا سراغ لگا لیا۔ وقتاً فوقتاً کچھ کرد رات کے وقت سفارتخانے کے احاطے سے باہر آتے اور دوبارہ اندر جاتے دیکھے جا رہے تھے، جن کے بارے میں موساد کی ٹیم کا خیال تھا کہ اس کے باڈی گارڈز تھے۔ ہر رات موساد کی ٹیم کا سربراہ اپنی رپورٹ تل ابیب بھیجتا رہتا تھا۔ وہاں سے حکم ایک ہی تھا۔ ''نگرانی کرو اور کچھ نہ کرو''۔ پھر اچانک ڈرامائی طور پر آرڈر تبدیل ہو گئے۔ ہالوی کا حکمنامہ آ گیا۔ ''ہر ممکن ذریعہ سے عبداللہ اوکلان کو سفارتی احاطے سے نکالو اور اغوا کر کے ترکی لے جاؤ''۔

قسمت نے بھی ٹیم کا ساتھ دیا۔ ایک رات ایک کرد گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے یونانی سفارتخانے سے احاطے سے باہر آیا اور قریب واقع معروف ہوٹل نارفورک کے نزدیک واقع بار تک گیا۔ موساد کا جو مخصوص طریق کار تھا، اس کے مطابق اس کا ایجنٹ جس کے چہرے کی رنگت اور زبان کا لب و لہجہ بھی عین کردوں جیسا تھا، اس کے پیچھا اور بتایا کہ وہ نیروبی میں کام کرتا ہے اور کرد ہے۔ چند لمحوں کی بات چیت میں اس نے معلوم کر لیا کہ اوکلان بہت بے چین اور پریشان ہے کیونکہ اس نے اپنی سیاسی پناہ کی جو درخواست جنوبی افریقہ بھیجی تھی، اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسرے افریقی ممالک بھی کردش لیڈر کو انٹری ویزہ دینے سے انکاری تھے۔

موساد کی ٹیم کے خفیہ گفتگو سننے کے ماہر، یونانی سفارتخانے سے باہر جانے اور اندر آنے والی ہر فون کال کو سن رہے تھے جس سے واضح ہو رہا تھا کہ یونانی حکومت بھی اسے اپنے ہاں پناہ دینے سے انکار کر دے گی۔

موساد کے جس ایجنٹ نے کرد سے بار میں ملاقات کی تھی، اپنے کام میں جت گیا۔ اس نے کرد کو سفارتخانے میں ٹیلیفون کر کے نہایت اہم بات چیت کے لئے باہر بلایا۔ ایک دفعہ پھر ان کی بار میں ملاقات ہوئی۔

ایجنٹ نے کرد کو بتایا کہ اگر اوکلان مزید کچھ عرصہ سفارتخانے کے احاطے میں رہا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس کی بقا اس میں تھی کہ واپس اپنے لوگوں، کردوں میں جائے لیکن ترکی کی بجائے عراق، اس کے وسیع جنگلات میں وہ محفوظ بھی رہے گا اور اپنے لوگوں کو دوبارہ اکٹھا بھی کر سکے گا۔ یہ ایسا منصوبہ تھا جس پر اوکلان نے غور و فکر کرنا شروع کر دیا اور موساد کی سرویلنس ٹیم نے ایسی بات چیت سن بھی۔ موساد کے ایجنٹ نے کرد کو سمجھایا کہ وہ اوکلان کو قائل کر لے کہ وہ باہر آ کر منصوبے کی تفصیلات طے کرے۔

بالکل سادہ اور جان لیوا پھندہ تیار کر لیا گیا۔ اب صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اوکلان اس پھندے کا شکار بننے کے لئے کتنا وقت لیتا ہے۔

موساد کی سرویلنس ٹیم کو یونانی وزارت خارجہ اور سفارتخانے کے درمیان ریڈیو پیغامات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب معاملہ چند دنوں کا ہے کہ سفارتی احاطے کے تنگ آئے ہوئے میزبان اسے باہر کے دروازے کا راستہ دکھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک پیغام، جس پر واضح تھا ''صرف سفیر صاحب کی توجہ کے لئے'' یونانی وزیراعظم کوستاس سیمیٹس نے کہا تھا۔ ''اوکلان کی سفارتی احاطے میں لگاتار موجودگی، یونان میں سیاسی بلکہ ممکنہ طور پر فوجی تصادم کو جنم دے سکتی تھی''۔

اگلی صبح نیروبی کے ولسن ائرپورٹ پر ایک طیارہ فالکن 900، ایگزیکٹو جیٹ لینڈ کیا۔ پائلٹ نے بتایا کہ وہ چند کاروباری لوگوں کو ایتھنز میں منعقدہ کانفرنس میں لے جانے کے لئے آیا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ معاملہ اب بھی بحث طلب ہے۔ اوکلان کے جرمن وکیل نے بعد ازاں دعویٰ کیا کہ ''اوکلان کو عملی طور پر دھکیلتے ہوئے سفارتی احاطے سے باہر نکالا گیا'' لیکن کینیا کی حکومت اور یونانی سفارتخانے کا کہنا تھا کہ وہ ہمارے مشورے کے برعکس خود احاطے سے باہر نکل گیا تھا اور اس نے اپنے میزبانوں کی بات کی پروا نہیں کی تھی۔

ایک بات یقینی ہے۔

جیسے ہی ایگزیکٹو جیٹ نے نیروبی سے پرواز بھری، اوکلان اس پر سوار تھا۔ جونہی اس نے کینیا کی فضائی حدود سے باہر چونچ نکالی، سوالات شروع ہو گئے۔

کیا موساد ٹیم نے اپنی روایت پر عمل کرتے ہوئے اوکلان کو احاطے سے باہر آتے ہی ایسی دوائی کا انجکشن لگا دیا جس سے اس کی قوت مدافعت ختم ہو گئی؟ کیا انہوں نے اوکلان کو سڑک پر چلتے ہوئے اٹھا لیا تھا، جیسا کہ موساد کی ایک دوسری ٹیم نے بیونس آئرس میں اڈولف آئخمین کو کئی سال پہلے اٹھایا تھا؟ کیا کینیا کی انتظامیہ نے اپنی سرزمین پر بین الاقوامی قوانین کو پامال ہوتے ہوئے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں؟

اوکلان کے ایک ترکی جیل میں ٹھونسے جانے کے چند گھنٹے بعد وزیراعظم بلند ایجوت نے انتہائی مسرت سے ٹیلی وژن پر آ کر نیروبی میں کامیاب ترین انٹیلی جنس سرویلنس کی تیرہ روزہ کامیابی کا قوم کو مژدہ سنایا۔ اس نے موساد کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس نے اپنے اصولوں کی پاسداری کی۔

موساد کے سربراہ افریم ہالوی کے لئے یہ کامیابی اس جاسوس نیٹ ورک کے خاتمے کے نتیجے میں حاصل ہوئی جو کردوں کی مدد اور تعاون سے عراق کے اندر سرگرم عمل تھا۔ وہ موساد کا کوئی پہلا سربراہ نہ تھا جو اس بات پر متعجب تھا جبکہ وزیراعظم نتن یاہو کی ''کرائے کی بندوق'' کی پالیسی آئندہ وقتوں میں جاسوسی کی دنیا میں کیا نتائج پیدا کرے گی۔

آپریشن کی اس کامیابی نے ایک اور اہم اور

پُراسرار واقعہ کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا جو کہ بالوی کو ورثے میں ملا تھا۔

5 اکتوبر 1992ء کو اسرائیلی قومی ائرلائن ایل ال کا ایک کارگو جیٹ ایمسٹرڈیم (Amsterdam) کے قریب ایک رہائشی بلڈنگ سے ٹکرا گیا تھا۔ جو شیپول (Schipol Airport) ائرپورٹ کے قریب واقع تھی، جس میں 43 افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اس علاقے میں رہنے والے سینکڑوں افراد بیمار پڑ گئے تھے۔ اس بات کی انتہائی کوششوں کے باوجود کہ اس بات کو چھپایا جائے کہ جہاز میں ہلاکت خیز کیمیکل جس میں انسانی اعضاء کو مفلوج کر دینے والی سارین گیس تیار کرنے کے آلات میں ہلاکت خیز کیمیکل جس میں انسانی اعضاء کو مفلوج کر دینے والی سارین گیس تیار کرنے کے آلات بھی شامل تھے، حقیقت چھپائی نہ جا سکی اور معاملات کھل کر سامنے آ گئے، جس کے نتیجے میں انکشاف ہوا کہ تل ابیب کے نواح میں ایک ریسرچ سینٹر کے اندر سائنسدان سوساد کے قاتل یونٹ کے لئے بہت سے دوسرے خطرناک کیمیکلز کے علاوہ جراثیمی ہتھیار بھی تیار کرنے میں مصروف تھے۔

تل ابیب شہر کے مرکز سے 12 میل جنوب مشرق میں اسرائیل کا ''انسٹیٹیوٹ برائے بیولوجیکل ریسرچ'' واقع ہے۔ یہ پلانٹ اسرائیل کی تہہ در تہہ دفاعی تنصیبات کا ایک حصہ ہے۔ اس کی لیبارٹریوں اور ورکشاپوں میں بے شمار قسم کے کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیار تیار کئے جاتے ہیں۔ اس انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے والوں میں سے چند ایک وہ کیمسٹ اور سائنسدان ہیں جو کسی وقت روس کی کے جی بی (KBG) اور مشرقی جرمنی کی انٹیلی جنس ایجنسی ''سٹاسی'' کے لئے کام کیا کرتے تھے۔ یہیں پر وہ گیس اور کیمیکل تیار کیا گیا تھا جس سے اومان میں خالد مشعال (رہنما حزب اللہ) کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جسے حماس کا اہم بنیاد پرست رہنما خیال کیا جاتا تھا۔

امریکن انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کوہن کے لئے ایک رپورٹ تیار کی گئی ہے جس کے مطابق اسرائیل کے اس ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں آج کل ایسے ہتھیار تیار کرنے کے لئے سائنسدان اور ریسرچرز کوشش کر رہے ہیں جو میڈیکل ریسرچ کی بنیاد پر عربوں کے خلاف استعمال کے لئے مختلف وائرس اور جراثیم اور بیکٹیریا پر مشتمل ہوں گے اور صرف عربوں پر ہی اثر انداز ہوں گے۔

اس رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا گیا ہے کہ یہ ریسرچ ورک ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے اور اس بات کو جاننے کی کوشش ہو رہی ہے کہ جن لوگوں کے زندہ خلیوں کے اندر وائرس یا بیکٹیریا داخل کئے جائیں گے ان کا ڈی این اے کس حد تک متاثر یا تبدیل ہو گا۔ انسٹیٹیوٹ نے اپنی اس تازہ ترین ریسرچ کی بنیاد اس تجربے پر رکھی ہے جو جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی پالیسی کے دوران کالوں کو نشانہ بنانے کے لئے شروع کیا گیا تھا۔

نیلسن منڈیلا کے جنوبی افریقہ میں برسراقتدار آنے کے بعد وہاں یہ تجربہ ختم کر دیا گیا تھا لیکن وہاں کی لیبارٹری میں کام کرنے والے سائنسدان اسرائیل آ گئے تھے۔

اس ریسرچ کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ہی ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اسرائیل کے اندر بھی اس کی مخالفت شروع ہو گئی، کیونکہ ایسی ہی ریسرچ تو نازی جرمنی نے یہودیوں کے لئے شروع کی تھی۔ اسرائیلی پارلیمنٹ کے رکن ڈیڈی ذکر نے واضح طور پر کہا۔

''ہم ایسے ہتھیاروں کی تیاری کی اجازت نہیں دے سکتے''۔

ایسے ہی ہتھیاروں کی تیاری کا خام مال اس ایل ایل کے کارگو جیٹ میں شامل تھا جو 1992ء اکتوبر کی اس رات کو تباہ ہوا تھا۔ اس کے 114 ٹن وزنی کارگو میں سائنڈ وائنڈر میزائل اور الیکٹرانکس اور سب سے خطرناک 12 عدد ڈی ایم ایم پی (DMMP) سارین گیس کے ڈرم تھے۔ یہ کیمیکل نیوجرسی کی کمپنی سولکا ٹرونک سے خریدے گئے تھے۔ کمپنی کا مستقل موقف یہ رہا کہ اسرائیل نے انہیں بتایا تھا کہ یہ کیمیکل گیس ماسک ٹیسٹ کے استعمال کے لئے تھے۔ انسٹیٹیوٹ میں ایسی ٹیسٹنگ کبھی ہوئی ہی نہ تھی۔

1952ء میں سیمنٹ اور پتھروں سے بنے ایک مورچے میں قائم ہونے والا یہ ریسرچ انسٹیٹیوٹ آج کل 110 ایکڑ کے وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ کبھی یہاں باغات ہوتے تھے جو مدتیں ہوئیں ختم ہو چکے۔ اب یہاں اونچی اونچی مضبوط کنکریٹ کی دیواریں جن پر جگہ جگہ سینسر لگے ہوئے ہیں۔ مسلح گارڈ ہر وقت اس کے اردگرد گشت کرتے رہتے ہیں۔ عرصہ ہوا یہ انسٹیٹیوٹ پبلک کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ نیس زیونا (Nes Ziona) کے نواح میں واقع، اس کا صحیح پتہ تل ابیب کی ٹیلیفون ڈائریکٹری سے غائب ہے۔ علاقے کے سب نقشوں سے اس کا نشان تک مٹا دیا گیا ہے۔ کسی ہوائی جہاز کو اجازت نہیں کہ اس علاقے کے اوپر پرواز کر سکے۔

صرف دیمونا کا ایٹمی پلانٹ جو صحرائے ناگیو میں واقع ہے، اس سے زیادہ گمنام ہے۔ اسرائیلی وزارت دفاع کے لئے مخصوص ٹیلیفون ڈائریکٹری میں انسٹیٹیوٹ کا اندراج ان الفاظ میں ہے۔ وزارت دفاع کو خدمات مہیا کرنے والا ادارہ۔ دیمونا کی طرح انسٹیٹیوٹ کی بہت سی لیبارٹریاں کافی گہرائی میں زیر زمین ہیں وہاں بائیو کیمسٹ اور خلیات کے سائنسدان بوتلوں میں بند اچھے زہریلے مادوں اور کیمیکل کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں۔ یہاں وہ موت کے ایسے ایسے سامان تیار کرتے ہیں جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لمحوں میں موت کی نیند سلا دینے والی زہریں، اشیائے خوراک کو آلودہ کرنے والے جراثیم اور انتھراکس وغیرہ۔

ایک اور لیبارٹری میں، جہاں سائنسدانوں اور تکنیکی ماہرین کو خود بھی غبارہ نما لباس میں ہوا بند ہو کر جانا پڑتا تھا، نرو ایجنٹ، چوکنگ ایجنٹ، بلڈ ایجنٹ، بلیسٹر ایجنٹ جیسے جان لیوا دے تیار ہو رہے تھے۔ ان میں تابون نامی ایجنٹ بھی شامل تھا جس کی نہ کوئی بو تھی نہ ذائقہ، جسے کسی انسان کو سونگھا کر یا صرف ہوا میں چھوڑ کر موت دی جا سکتی تھی۔ نازیوں کی ایجاد کردہ ایک ''سومن'' نامی نظر نہ آنے والی گیس تھی جس میں قدرے پھلوں کی مہک شامل تھی۔ بلسٹر ایجنٹ میں کلورین، فوجین اور ڈلفوجین نامی گیسیں شامل تھیں کٹی ہوئی گھاس جیسی بو ہوتی تھی۔ بلڈ ایجنٹ میں وہ زہریلی گیس شامل تھی جو سیانائیڈ زہر سے تیار کی جاتی تھی۔ یہ بلسٹر ایجنٹ سب سے پہلے پہلی جنگ عظیم میں استعمال کئے گئے تھے۔

باہر سے بظاہر بھدی سی انسٹیٹیوٹ کی یہ عمارت جس میں چند کھڑکیاں ہی نظر آتی تھیں، اندر انتہائی سٹیٹ آف دی آرٹ قسم کی سکیورٹی کی حامل تھی۔ ہر شعبے میں داخلے کے لئے مخصوص کوڈ ورڈز اور شناخت لازمی تھی۔ سکیورٹی گارڈ ہر وقت برآمدوں میں گشت کرتے رہتے تھے۔ عمارت کے بم پروف دروازے صرف مخصوص کارڈ مشین میں ڈالنے سے کھلتے تھے۔ یہ کارڈ ہر روز تبدیل کر دیئے جاتے تھے۔

تمام ملازمین کی صحت ہر ماہ چیک کی جاتی تھی۔ ان کی سخت ترین تلاشی ہوتی تھی۔ ان کے خاندان کی بھی اسی طرح چیکنگ کی جاتی تھی۔

اس انسٹیٹیوٹ کا ایک شعبہ صرف موساد کے لئے ایسے ہتھیار تیار کرتا تھا جو اسرائیلی ریاست کی طرف سے نامزد کردہ افراد کو بغیر کسی قانونی کارروائی کے قتل کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ گزشتہ چند سال کے دوران انسٹیٹیوٹ کے چھ ملازمین کام کرتے ہوئے ہلاک ہوئے لیکن ان کی ہلاکت کے اسباب، اسرائیلی سنسرشپ قانون کی تحت پابندیوں کی وجہ سے، کبھی منظر عام پر نہ آسکے۔

اسرائیل کے اس خفیہ انسٹیٹیوٹ بارے سب سے پہلا انکشاف اس کے سابق موساد ملازم وکٹر اوسٹروسکی (Victor Ostrovsky) کی طرف سے سامنے آیا۔ اس کا کہنا تھا ”ہم سب جانتے تھے کہ جو قیدی بھی انسٹیٹیوٹ میں لایا جائے گا، زندہ واپس کبھی نہیں جائے گا۔ پی ایل او کے قیدیوں کو گینیا پگس (وہ سور خنزیر جن پر تجربات کئے جاتے ہیں) کے طور پر استعمال جاتا تھا تاکہ ان مہلک اور زہریلے ہتھیاروں کو مزید بہتر اور موثر بنایا جاسکے۔

1999ء میں جب نیٹو (Nato) افواج نے سربیا کے خلاف حملے کا آغاز کیا تو موساد کے سربراہ ہالوی نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے 19 ملکی اتحادی افواج کو علاقے کی صورت حال کے متعلق انٹیلی جنس مہیا کی۔ کیونکہ موساد نے بہت پہلے سے یہاں کی خفیہ ایجنسیوں سے روابط قائم کررکھے تھے کیونکہ اسرائیل کو خطرہ یہ تھا کہ اس علاقے میں ایک نیا ”مسلم خطہ“ وجود میں آ کر اس کی پشت کی طرف سے خطرے کا باعث بن سکتا تھا، جہاں سے اس کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیاں ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ ہالوی نے برسلز جاکر نیٹو کے ہیڈ کوارٹرز میں اپنے ہم منصبوں سے ملاقاتیں کیں۔ پھر وہ سی آئی اے سے رابطے کے لئے واشنگٹن گیا۔ واپس اسرائیل پہنچ کر اس کا پورا دن دفتر میں کام کرتے ہوئے ہی گزرتا تھا۔ وہ ہفتہ وار چھٹی بھی نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے میئر امیت کی یاد تازہ کردی۔

1999ء کے موسم بہار میں موساد کا باغی وکٹر اوسٹروسکی سامنے آگیا جس نے اسرائیلی انٹیلی جنس سروس میں سراسیمگی پھیلا دی۔ انتہائی احتیاط اور منصوبہ بندی سے موساد ٹیم کی گھڑی ہوئی اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے وسیع پیمانے پر پھیلائی رپورٹوں کی بنیاد پر دو لیبیائی باشندوں کو لاکربی کریش کا ذمہ دار ٹھہرادیا گیا اوسٹروسکی نے اعلان کردیا کہ وہ ان کے دفاع میں گواہی دے گا اور ثبوت پیش کرے گا۔ اس بات کے پیش نظر کہ موساد کا سابق ایجنٹ انٹیلی جنس سروس کو حادثے سے بہت پہلے چھوڑ گیا تھا، یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ عدالت میں کیا ثبوت پیش کرتا اور کیا گواہی دیتا ہے۔ موساد کے ایک اندرونی ذریعہ کے مطابق، ہیگ کے مقام پر خصوصی طور پر قائم کردہ عدالت کے گواہی کے کٹہرے میں کھڑے اوسٹروسکی کو دیکھ کر ہالوی غصے سے پاگل ہوگیا تھا۔ ہالوی کے خیال کے مطابق اوسٹروسکی اور اس کے سابق ادارے موساد کے درمیان اس بات پر مفاہمت ہوچکی تھی کہ اس کی زندہ رہنے کی ضمانت کے بدلے میں وہ موساد کو مزید ہراساں نہیں کرے گا۔ پہلے ہالوی نے کوئی ایسا قانونی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے اوسٹروسکی کو گواہی دینے سے روکا جاسکے۔ تب اسے بتایا گیا کہ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

آخر ہالوی نے سوچا کہ اگر اوسٹروسکی عدالت میں پیش ہوا تو وہ ریٹائرمنٹ لے لے گا۔

موساد کے اندرونی خلفشار اور ابتری کے نتیجے میں اسرائیل کی دوسری دونوں خفیہ ایجنسیاں ”امان“ (ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی) اور شن بیت (داخلی امن کی ذمہ دار ایجنسی) بہت آگے نکل چکی تھیں۔ ہالوی کے لئے سروس کو الوداع کہنے سے پہلے اس کی سابقہ حیثیت کی بحالی

ان کی جسمانی اور دماغی قوت برداشت کا امتحان تھی اور اب تک کسی طرف سے بھی ایسی کوئی تجویز سامنے نہیں آئی تھی کہ موساد کو دنیا کو اسرائیل کی خفیہ آنکھ کی حیثیت سے دیکھنا بند کر دینا چاہئے۔ اس کی مہارت اور ہنر مندی کے بغیر ہو سکتا ہے کہ اسرائیل اگلی صدی میں اپنے دشمنوں سے ہار جائے۔ ایران، عراق اور شام نے ایسی ٹیکنالوجی تیار کی جس کی قریبی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ابتدا میں موساد کا آپریشن کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے کرو لیکن خفیہ طریقے سے۔ ایک دفعہ اپنے ایک ملاقاتی سے دو بدو بات چیت کرتے ہوئے ہالوی نے کہا تھا۔ ''میری خواہش ہے کہ اسرائیل انٹیلی جنس کمیونٹی پھر ایک متحدہ خاندان کی شکل اختیار کر جائے جس میں موساد کا کردار ''ماموں جان'' کا ہو جن کے بارے میں کوئی منہ نہ کھولے''۔

اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ ہالوی کا یہ خواب پورا ہوتا ہے یا موساد مزید پبلک کی نگاہ میں ذلیل وخوار ہو گی۔

اس کی ذلت وخواری کا ثبوت جلد ہی سامنے آ گیا جب جون 1999ء میں ہالینڈ کی حکومت نے اسے اپنا یورپین ہیڈ کوارٹرز کہیں اور منتقل کرنے کا اشارہ دے دیا کیونکہ ہالینڈ کی خفیہ ایجنسی ان ٹیل (Intel) نے خفیہ طور پر پتہ چلا لیا تھا کہ موساد روسی مافیا سے پلوٹینیم اور دیگر ایٹمی ساز وسامان کی خریداری کرتی رہی ہے۔

ان ٹیل، ہالینڈ کی چھوٹی سی لیکن انتہائی مستعد اور بیدار و ہوشیار انٹیلی جنس ایجنسی اپنی خفیہ تحقیقات ایک گہرے مورچے میں بیٹھ کر کرتی رہی تھی جو روسی ایٹمی حملے کی صورت میں شاہی خاندان کی پناہ کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ بنکر یا مورچہ ایمسٹرڈیم کے مرکزی ریلوے سٹیشن کے قریب واقع تھا۔ ان ٹیل نے اس بات کے پکے ثبوت حاصل کر لئے تھے کہ اس ریلوے سٹیشن کو روسی اسلحہ کی لیبارٹریوں سے چرائے گئے ایٹمی میٹریل کی آخری منزل کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہ میٹریل چلیا بنکس-70 (Chelya Binks-70) جو اورال کے پہاڑی علاقے میں واقع تھی اور ارزاماس-16 لیبارٹری جو نیز ہائی نوفگرروڈ، سابقہ گورکی میں واقع تھی، چرا کرلایا جاتا تھا۔

موساد کے سینئر افسر ان ٹیل کو قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ چونکہ ایٹمی ہلاکت خیز میٹریل چوری کا تھا، ہمارے ایجنٹوں نے اس خدشے کے پیش نظر مافیا سے خریدا تھا کہ مبادا یہ مسلمان دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جائے یا دوسرے امن دشمن لے اڑیں۔

اگرچہ ان ٹیل نے اس دلیل کو مان لیا تھا لیکن ان کے تفتیش کاروں نے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ ایٹمی میٹریل خفیہ طور پر ایمسٹرڈیم سے باہر شیپول ائرپورٹ کے ذریعے اسرائیل کو بھیجا جاتا رہا تھا کہ اپنے دیمونا ایٹمی پلانٹ میں ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت کو مزید ترقی دے سکیں۔ وہاں 1999ء تک پہلے ہی 200 کے قریب ایٹم بم موجود تھے۔

روسی مافیا کی مدد سے موساد کا ایٹمی میٹریل سمگل کرنا پوری دنیا کے لئے تشویش کا باعث بن گیا اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد یہ دنیا کو سب سے بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اب ایٹمی تجربہ اور میٹریل بازار میں ''برائے فروخت'' موجود تھا۔

ایٹمی مواد کی چوری کی اصل جگہ کے سراغ کا سب سے زیادہ کام یورپین ٹرانس یورینیم انسٹیٹیوٹ نے کیا ہے، جو کارلزلوہے، جرمنی میں واقع ہے۔ وہاں سائنسدان جدید ترین، سٹیٹ آف آرٹ کے آلات سے پتہ لگاتے ہیں کہ چوری شدہ ایٹمی میٹریل کسی فوجی لیبارٹری سے چرایا گیا ہے یا سویلین لیبارٹری سے۔ ان

کا کہنا ہے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی چور کو پکڑنا جس کی انگلیوں کے نشان کہیں بھی ثبت نہ ہوں"۔

لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہ تھا کہ موساد کے فنگر پرنٹ ہر طرف پائے جا رہے تھے۔ ہالوی نے جون کے شروع میں ان ٹیل کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرنے کے ہالینڈ کا خفیہ دورہ کیا لیکن ڈچ انٹیلی جنس ایجنسی قائل نہ ہو سکی۔

ہالوی واپس اسرائیل پہنچا اور اپنے نئے وزیراعظم ایہود باراک کو بتایا کہ موساد اپنا یورپین ہیڈ کوارٹر اسرائیلی ائر لائن ایل ال کے شپول ائرپورٹ پر واقع احاطے میں شفٹ کر رہی ہے۔

موساد وہاں پہلے چھ سال سے آپریشن کر رہی تھی۔ اس بلڈنگ کمپلیکس کی دوسری منزل، جہاں شپول تھا اور جسے چھوٹا اسرائیل سمجھا جاتا تھا، موساد کے 18 افسر وہاں سے پورے یورپ میں آپریشن کیا کرتے تھے۔ ایک اندرونی ذریعے کے مطابق ہالوی کی پوزیشن تو صاف تھی نتیجہ یہ ہوتا کہ موساد کو ہالینڈ سے لات مار کر نکال باہر کیا جاتا جیسا کہ برطانیہ کی تھیچر حکومت نے کیا تھا۔

یہ موساد کا اپنا فیصلہ تھا کہ اس نے میزبان ملک کے علم کے بغیر آپریشن کیا جس کی وجہ سے لندن کے ساتھ تعلقات بگڑ گئے۔ بدقسمتی سے اگر موساد کو شپول چھوڑنا پڑتا تو لندن کے سوا ان کے پاس کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔ وزیراعظم کی منظوری ملنے کے بعد برطانیہ کے نئے وزیراعظم ٹونی بلیئر اور ہالوی نے اسرائیلی وزیراعظم باراک کو بتایا کہ موساد کو انگلینڈ میں خوش آمدید کہا جائے گا۔ بلیئر کو یقین تھا کہ مضبوط انٹیلی جنس ایجنسی جیسے موساد مڈل ایسٹ کے ان گروپوں پر نظر رکھنے میں ایم آئی 5 کی مددگار ثابت ہوگی جو لندن میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

اب یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ کیا اسرائیلی قومی ائر لائن ایل ال بھی اپنا ڈیرہ شپول سے لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر لے جائے گی۔ ایل ال کارگو بزنس بہت بڑھ گیا تھا اور اس کے ہیتھرو آنے سے اس ائرپورٹ کی تجارتی سرگرمیوں میں مزید فائدہ ہو سکتا تھا۔

ان ٹیل نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ موساد اور ایل ال کے درمیان ایٹمی میٹریل کی اسرائیل پہنچانے میں ملی بھگت تھی اور اندر سے دونوں ایک تھیں۔

ڈچ انٹیلی جنس ایجنسی کو یقین تھا کہ موساد ایٹمی میٹریل کی خریداری شروع کرتی، اگر اسے بحفاظت اسرائیل تک پہنچانے کا یقین نہ ہوتا۔

امریکہ کے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری دفاع گراہم ایلیسن جو آج کل ہارورڈ سینٹر برائے سائنس اور بین الاقوامی تعلقات کے ڈائریکٹر ہیں، کا کہنا ہے "جرائم پیشہ یا دہشت گرد گروپ اب تو امریکہ کے اندر بھی ایسے ہتھیار لا سکتے ہیں اور ایسے کم وزن اور چھوٹے اسلحہ پوسٹل سروس سے بھیجا جا سکتا ہے۔

لہذا موساد جیسی منظم اور مستعد انٹیلی جنس ایجنسی کے لئے جسے اسرائیلی حکومت کی سرپرستی اور بے تحاشا مالی وسائل حاصل ہیں، شپول سے ایٹمی میٹریل اسرائیل پہنچانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

ان ٹیل کو ایٹمی میٹریل کے شپول سے سمگل کئے جانے کا شک اسی وقت پیدا ہو گیا تھا ایل ال کا کارگو جیٹ اڑنے کے فوراً بعد شپول کے قریب کریش ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ اکتوبر 1992ء میں پیش آیا تھا۔ ان ٹیل کو بتایا گیا تھا اس شپمنٹ میں ایٹمی میٹریل کے علاوہ زہریلے کیمیکل بھی شامل تھے اس وقت سے ان ٹیل واقعاتی شہادتیں اکٹھی کرنے میں مصروف تھی اور یہ پتہ لگا لیا تھا کہ موساد باقاعدگی کے ساتھ ایٹمی میٹریل شپول سے اسرائیل سمگل کرتی آ رہی تھی۔

ایک فیچر یعنی لیڈی سمگلر نے اس بات کی ضمانت

کے بعد کہ اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا جائے گا، ان نیل کو بتایا تھا کہ وہ یوکرین سے جرمنی کے راستے ایٹمی میٹریل سمگل کر کے ہالینڈ لایا کرتی تھی۔

سمگلر نے ان نیل کے سامنے تسلیم کیا تھا کہ اس کی ملاقات مرکزی سٹیشن پر موساد کے افسروں سے ہوا کرتی تھی۔ یہ افسر شپول پر تعینات تھے۔ جب ان نیل نے لیڈی سمگلر کو ایمسٹرڈیم سٹیشن کی کچھ تصویریں دکھائیں تو اس میں سے سمگلر نے بعض چہروں کو شناخت کر لیا جو اس سے مال وصول کیا کرتے تھے، ان نیل کو پتہ تھا کہ یہ موساد کے افسر تھے۔

پرانے وقتوں میں یہ میئر امیت کے الفاظ ہیں۔ موساد کا کوئی کارندہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اس کی آسانی سے شناخت ہو جائے۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی میں بہت سے اور لوگ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ موساد میں ایسی کمزوریاں نہ تھیں۔ اگلی صدی میں موساد کس رنگ و روپ میں داخل ہوگی؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حتیٰ کہ اسرائیل کے اندر موساد کے آپریشنوں کی ناکامی بارے لوگوں کا رویہ بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ بات نہ تھی موساد کی کامیابیوں کا زیادہ تر انحصار مکر و فریب، جھوٹ اور ہلاکتوں پر ہوتا تھا اور اسی وجہ سے اسرائیل زندہ رہ سکا۔

لیکن اسرائیلی سرحدوں کے اردگرد عرب ہمسایوں کے ساتھ امن کے بعد کیا موساد کے یہ پرانے حربے کام آ سکیں گے۔ یہ وقت بتائے گا۔

نوٹ۔ یہ اس سلسلے کا آخری مضمون ہے۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسی "موساد" کی اندرونی کہانی کے مزید سنسنی خیز واقعات کتاب میں پڑھیے!

▲▼▲